

بات ہے رُسوائی کی

(قیدی خواتین کی لرزہ خیز سچی داستانیں)

دستگیر شہزاد



دھت ہستی بنے قتل تو لہو روتے ہیں دل
دل لہو روئیں تو ہوتی ہے کہانی پیدا

بات ہے رسوائی کی

دستگیر شہزاد

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون: 37352332-37232336

جملہ حقوق محفوظ

بات ہے رسوائی کی	نام کتاب
دھگیر شہزاد	مصنف
علم و عرفان پبلشرز، لاہور	ناشر
زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور	مطبع
انیس احمد	کمپوزنگ
اپریل 2013ء	سن اشاعت
250/- روپے	قیمت

..... ملے کے چے

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

کتاب گھر	اشرف بک ایجنسی
اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی	اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
ولیکم بک پورٹ	خزینہ علم و ادب
اردو بازار، کراچی	المکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
رشید نیوز ایجنسی	جہانگیر بکس
اخبار مارکیٹ، اردو بازار، کراچی	بو ہرگیٹ، ملتان
شمع بک ایجنسی	کشمیر بک ڈپو
بھوانہ بازار، فیصل آباد	تلہ گنگ روڈ، چکوال

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

ترے نام سے منسوب کر رہا ہوں
کتنا حسین عنوان ہے مرے فسانے کا



کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

- ۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔
- ۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان بیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔
- ۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

پیش لفظ

میں اپنے تخلیقی سفر میں ہمیشہ پاکستان کی دھرتی اور پاکستانی فکر کے چشموں سے ہم رنگی کا حامل رہا ہوں۔ کیا کیا ہے اس پردھیان نہیں رہتا۔ بلکہ کیا کرنا ہے ساری توجہ اس پر مرکوز رہتی ہے۔ خوشیوں کی ساعتیں بھی یوں گزر گئیں جیسے خوشی کی بات نہ ہو۔

ادب کے اس بکھیرے میں پڑے پندرہ برس سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا نو جوانی نے بڑھاپے کی سرحد میں قدم رکھ لیا۔ قلائیں بھرنے کی بجائے لالھی ہاتھ میں پکڑنے کا وقت آ گیا۔ کہاں سے چلا تھا کہاں پہنچ گیا۔

ادھر انسان کا بھی بھید نہ کھلا، آدمی ایک روپ سو، مدعا یہ کہ آدمی دن میں کئی بار بدلتا ہے۔ کسی لمحے کچھ ہوتا ہے کسی دوسرے لمحے کچھ۔ ایک بُرا آدمی بھی سارا دن برا نہیں رہتا۔ یہی حال ایک اچھے آدمی کا ہے۔ بات یوں واضح ہوگی کہ ایک آدمی ابھی کچھ ہوتا ہے۔ کوئی خبر سنتے ہوئے وہ کوئی دوسرا آدمی بن سکتا ہے۔ اس آواز پر جو کہ اُسے سنائی دی۔ اس کے اچھے برے ہونے کا انحصار ہو سکتا ہے۔

تماشہ یہ بھی ہے کہ دنیا کا ہر فرد، دوسرے فرد کے خلاف ہے، یہ ہماری سرشت کا ادعا ہے۔ اگر آپ کا روبرو کرتے ہیں تو ہر شخص آپ کے منہ سے نوالہ چھین رہا ہوگا۔ اگر آپ کسی دفتر میں ملازم ہیں تو ہر جوئیر آپ کی کرسی کھسکا رہا ہوگا۔ اگر آپ ادیب یا شاعر ہیں تو معاملہ زیادہ سنگین ہو گا۔ لیکن عام آدمی اور ادیب میں فرق ہوتا ہے۔ عام آدمی غصے میں آ کر اپنا اور دوسروں کا نقصان کرتا ہے۔ مگر ادیب غصے میں آ کر دوسروں کا بھلا کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی کٹار نہیں چلتی، قلم چلتا ہے۔

”بات ہے رسوائی کی“، ظلم، درندگی، قتل اور بے رحم یادوں بھری داستان ہے۔

قلم کی اپنی جولانیوں سے ہر ظلم، درندگی، قتل اور بے رحم یادوں بھری داستان آراستہ ہے جسے پڑھ کر انسان موم ہوں نہ ہوں لیکن پتھر ضرور موم ہو جائیں گے۔

یہ میرا بیان ہے۔ یاد رہے ایک اچھا آدمی بھی سارا دن اچھا نہیں رہتا۔ یہ بھی میرا یقان ہے۔

آخر میں مجھے ایک شکر یہ ادا کرنا ہے۔ امجد جاوید صاحب کا، جنہوں نے میرے ساتھ اپنی خاص محبت کا اظہار فرمایا۔۔۔ امجد جاوید میری یوں مدد کرتے رہے جیسے یہ ان کا فرض تھا۔ میں ان کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔

دبگیر شہزاد

03009667909

سیمینار ختم ہو چکا تھا اور میرے کہے ہوئے لفظوں نے لوگوں کے ذہنوں میں آگ لگا دی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے ان کے پر جوش نعروں اور متمتاتے چہروں سے ہو رہا تھا۔ میں ابھی اسٹیج پر ہی تھی کہ مجھے میڈیا کے نمائندوں نے گھیر لیا۔ ایک مشہور اخبار کی خاتون رپورٹر تیزی سے آگے بڑھی اور مائیک میرے آگے کرتے ہوئے سوال کر دیا۔

”ایک انتہائی روایتی سوچ والے معاشرے میں ایک انتہائی غیر روایتی سوچ رکھنے والی لڑکی کیسے سروائیو کر گئی؟“

میں نے اس کی طرف دیکھا اور بڑی نرمی سے جواب دیا۔

”جہاں اور جل سوچ کا قحط ہو وہاں اسے پذیرائی ملتی ہے۔ روایتی سوچ کے سیلاب میں غیر روایتی سوچ کا جزیرہ علیحدہ نظر آتا ہے۔ اور یوں بھی باخبر اور با علم ہونا اور بات ہے۔ غور و فکر کرنے کا فن بالکل ہی اور چیز ہے زندگی میں سیکھنا آسان ہے لیکن بوجس باتیں سیکھنے کے بعد خود کو متوازن رکھنا بے حد مشکل ہے۔ خاص طور پر ایسی سوسائٹی میں جہاں تاریخ سے لیکر تہذیب تک کو جھوٹ کی خوراک پر پالا جاتا ہو۔ اور کسی تحریک کو بے ادبی اور بغاوت سمجھا جاتا ہو۔ وہاں اور جل اور غیر روایتی سوچ عموماً جوانی سے پہلے سماج کی سولی پر چڑھا دی جاتی ہے لیکن کچھ لوگ اتفاقاً نکلے ہیں۔ میں بھی ان میں سے ہوں۔“

”دیکھی لالچ اور دھمکی سے آزمائی گئیں؟“ ایک اور صحافی نے سوال داغا تو میں نے جواب دیا۔

”اصل لیڈر کی نظر عوام اور ملک کے مستقبل پر ہوتی ہے اور ان کی نظریں عوام کی جیبوں اور ملکی وسائل پر نہیں کہ اس راؤنڈ میں انہیں کس طرح لوٹنا اور نوچنا ہے۔ میرا کردار آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ میں ہر لمحہ میں جیل دیکھنے کو تیار ہوں کیونکہ یہ سب میری تحریک حقوق انسانی کا حصہ ہے۔ پارٹ آف دی گیم۔“

میں میڈیا کے سوالوں کے جوابات دے رہی تھی کہ میری سیکریٹری نے اشارہ کیا کہ دیر ہو رہی ہے۔ گارڈن ٹاؤن میں سیمینار کا وقت ہو رہا تھا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گئی اور باہر جانے کے لیے بڑھی۔ جیسے ہی میں ہال سے باہر نکلی تو ہال کے باہر پولیس کی بھاری نفری دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ سادہ لباس میں دو لیڈی اہلکاروں نے اچانک مجھے جکڑ لیا اور پھر زمین پر میرے پاؤں نہیں لگے۔ چند قدم کے فاصلے پر پولیس کی گاڑی کھڑی تھی اور پھر کچھ لمحوں بعد میں گاڑی میں تھی۔ میں صرف اتنا دیکھ سکی کہ لوگ احتجاجاً پولیس وین کی طرف بھاگ رہے ہیں اور پولیس والے انہیں روک رہے ہیں۔ اسی دوران کسی پولیس والے نے میرا سر نیچے دبا دیا اور بار بار میرا سر گاڑی کی دائیں سیٹ سے ٹکراتا رہا۔ چوٹوں کی شدت ایسی تھی کہ مجھے ہوش نہ رہا۔ جب دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں پولیس وین میں ہی پڑی بلکورے لے رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ پولیس وین تیزی سے بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ پھر اچانک گاڑی رک گئی۔ دروازہ کھولا گیا اور اس میں سے مجھے دھکیل کر باہر نکالا گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ کوئی تھانہ تھا۔ مجھے ایک بیرک میں لے جا کر پھینک دیا گیا میں ابھی سانس بھی نہ لینے پائی تھی کہ مجھ پر تشدد کا ایک طوفان امنڈ آیا۔ ایک انسپکٹر کی نگرانی میں لیڈی اہلکار مجھ پر تشدد کرنے لگیں۔ مجھے سزا دینے والی ٹیم میں چار لیڈیز اہلکار تھیں۔ انکے پاس موٹے

موٹے ڈنڈے تھے، ہوا کے دباؤ سے چلنے والی بندوق تھی، جس میں سرخ مرچوں سے تیار شدہ محلول بھرا ہوا تھا۔ وہ فوارے کی شکل میں مجھ پر پھینکتیں۔ اچانک افتاد کی صورت میں آنے والے تشدد کو میں کہاں تک بردشت کر سکتی۔ مجھ میں مزاحمت کرنے کی ہمت نہ رہی۔ میں نیم مردہ سی ہو گئی تو انہوں نے یہ مشقت ختم کی۔ جب یہ لوگ مجھے مار پیٹ کر واپس چلے گئے تو میرا پورا بدن ڈکھ رہا تھا۔ اس رات مجھے بہت کیا نیند آنا تھی، میرا روم روم زخمی ہو رہا تھا۔ میں تمام رات اپنی کمر کے بل لیٹی رہی۔ ایک تو میرے بدن کا ایک ایک عضو درد اور تکلیف میں مبتلا تھا اور دوسرا لوگوں کی مختلف آوازیں میرے کانوں میں ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔ میں نے خود سے غافل ہونے کا یہی طریقہ سوچا کہ میں وقت کے اس مقام پر جا کر سوچوں جہاں سے یہ سب ہنگامہ آرائی شروع ہوئی تھی۔

میرا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا تھا، جنہیں صحیح معنوں میں اللہ میاں کی گائے کہا جاتا ہے۔ والدین کے کھونٹے سے کھلی تو وقار حسن کے کھونٹے سے جا بندھی۔ میرے شوہر وقار حسن بہت پڑھے لکھے تھے۔ اپنے پسند کی جاب نہ ملی تو پرانے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک تنظیم تحریک حقوق انسانی بنائی۔ میرے ساتھ شادی کرنے میں انہیں بہت آسانی ہو گئی۔ میں گھر میں بیوی تھی اور آفس میں ان کی معاون۔ آج سے پانچ برس پہلے شہر کی تنظیم تحریک حقوق انسانی کے لیڈر وقار حسن کی میں سیکریٹری تھی۔ پہلے پہل گھر سے آفس تک کا راستہ بڑی مشکل سے یاد کیا تھا۔ لکھنے پڑھنے سے بالکل شوق نہیں تھا۔ اتنا ضرور پتہ تھا کہ لیڈر لوگ بہت بڑے ہوتے ہیں۔ وقار حسن کی آبائی جائیداد تھی جس کے بل بوتے پر دن لشتن پشتم چلتے چلے جا رہے تھے۔ میں بہر حال اپنی قسمت پر شاکر مطمئن تھی۔

گھر میں روز تعلیم یافتہ لوگ آتے اور مختلف موضوعات پر بولتے۔ کم از کم میرے خیر میں شہر میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور بد امنی کے خلاف وحشت تو تھی ہی لیکن اس کے باوجود ان کی کسی بحث میں حصہ نہیں لیا تھا۔ روز گھر میں فلسفے پکتے اور ہم منطق کھاتے۔ شکر ہے مکان ان کا اپنا تھا ورنہ مکان سے بھی نکال دیئے جاتے اگر یہ پرایا ہوتا۔ میں چٹائی پر لیٹی دیواریں گنا کرتی اور اپنے جہل پن کا اکثر شکار رہتی۔ ان دنوں مجھے ساتواں مہینہ تھا۔ درد شدید تھا اور بان کا درد بھی شدید تھا۔ لیڈر شہرت کے غرور میں باہر گیا ہوا تھا اور میں لیڈر کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے سوچتی رہی کہ عورت تو نام ہی انتظار کا ہے۔ بیٹی ہوتی ہے تو باپ کا انتظار کرتی ہے بیوی ہوتی ہے تو شوہر کا انتظار کرتی ہے اور جب ماں بنتی ہے تو بچوں کا انتظار کرتی ہے۔ ان دنوں صرف مجھ پر ہی نہیں تنظیم پر بھی بھاری آچکی تھی۔ حکومت کب تک ان کی بکواس سنتی رہتی۔ آئے دن تقریریں، اخباروں میں کالم اور مضمون، حکومت مخالف پارٹیوں کے ساتھ تعلقات کی پیٹنگیں کب برداشت ہوتی۔ وقار حسن کا زیادہ وقت یا تو باہر گزرتا یا پھر چھپ چھپا کر ادھر ادھر کٹتا۔ اس دن جب درد شدید ہوا تو ہماری ہمسائی میری چیخیں سنتی ہوئی آئی اور مجھے ہسپتال چھوڑ آئی۔ میرے پیٹ میں درد اور ہاتھ میں سوروپے کا کڑکڑانا ٹوٹ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک لڑکا پیدا ہوا۔ سردی شدید تھی اور ایک تولیہ بھی بچے کو لپیٹنے کیلئے نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے میرے برابر ستر پچر بچے کو لٹا دیا۔ پانچ منٹ کیلئے بچے نے آنکھیں کھولیں اور کفن کمانے چلا گیا۔ بس جب سے میرے جسم میں آنکھیں بھری ہوئی ہیں۔ ایمر جنسی وارڈ میں مجھے لٹا دیا گیا۔ میں نے نرس سے کہا۔

”میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ سوائے ہمسائی کے کسی کو علم بھی نہیں کہ میں کہاں ہوں۔“

اس نے مجھے بے باکی سے دیکھا اور کہا

”تمہارے جسم میں ویسے بھی درد جھیلنے کا ڈر ہے تم بستر پر رہو“

لیکن آرام تو کہیں بھی نہیں تھا۔ میرے پاس مردہ بچہ اور سوروپیہ تھا۔ میں نے سسٹر سے کہا۔

”میرے لئے اب مشکل ہے ہسپتال میں رہنا۔ میرے پاس ہسپتال کیلئے پیسے نہیں ہیں میں پیسے لیکر آتی ہوں بھاگوں گی نہیں۔ تمہارے

پاس میرا مردہ بچہ امانت ہے۔“

شاید اسے میری حالت زار پر ترس آگیا تھا یا وہ مجھے شدت غم میں پاگل ہو جانے والی ماں سمجھ رہی تھی۔ اس نے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔

میں اٹھی اور ایک نگاہ اپنے مردہ بچے پر ڈالی تو ایک دم چکرا کر گر گئی۔ مجھے جب ہوش آیا تو میرا بچہ میرے پاس نہیں تھا۔ وہی نرس میرے پاس تھی اور

بڑے کرب سے بولی

”تمہارا بچہ ہسپتال والوں نے دفن دیا ہے۔ تمہارا بیل ہزاروں میں بنا ہے۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ تم ادا کر پاؤ گی۔“ اس سے پہلے میں کچھ کہتی

وہ خود ہی بولی ”تم یہاں سے چلی جاؤ۔۔۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔“

میں نے اس کی بات پر چند لمحے سوچا اور بنا کچھ کہے کمرے سے باہر نکلی اور سیڑھیوں سے اتر گئی۔ بچے کی اصل قبر تو میرے دل میں بن

چکی ہے۔ مجھے ایک سو ایک ڈگری بخار تھا۔ بس میں سوار ہو کر گھر پہنچ گئی۔ جہاں میری تنہائی خوف کے مارے نیم پاگل بنی ایک کونے میں سمٹی بیٹھی

تھی۔ میرے پستانوں سے دودھ بہہ رہا تھا۔ میں نے دودھ گلاس میں بھر کے بہا دیا۔ اور اپنے شوہر کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے اپنی تنہائی کا خوف

دور نہیں کر پار ہی تھی۔ میں نے کھانا بھی اچھی طرح نہ کھایا۔ میرے گھر میں تنہائی جاگ رہی تھی۔ اور پھر میرے گھر میں ماضی اُگ آیا۔

لیڈر وقار حسن اور چند کارکن حضرات کی گفتگو شروع ہو گئی۔

مارکس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ کس پائے کا مفکر تھا؟

ماؤزے ٹیگ کس معیار کا رہنما تھا؟

ہٹلر عظیم رہنما تھا یا ٹیو لین؟

چو این لائی کس رتبے کے رہنما تھے؟

کیا قائد اعظم عظیم لیڈر تھا؟

یہ باتیں تو روز ہی سنتی تھی لیکن آج لفظ کچھ زیادہ ہی صاف سنائی دے رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ سارے بڑے لوگ تھوڑی دیر کیلئے

میرے لہو میں رکے ہوں۔ مارکس اور ہٹلر میرے جسم سے میرا بچہ نوج رہے ہوں۔ اس روز سیاست میرے گھر میں پہلی بار آئی تھی اور لہو میں قہقہے لگا

رہی تھی۔ میرے بچے کا جنم دیکھو۔۔۔ گفتگو جاری رہی اور خاموشی آنکھ لٹکائے مجھے دیکھتی رہی۔ یہ لوگ سیاست کے ایوان عبور کرتے ہوئے کمرے

سے جدا ہو گئے۔ ماما کا نوحہ کرتا ہوا دودھ کا ایک اور گلاس مجھے بھرنا پڑا۔ جسے میں بہادرینا چاہتی تھی کہ ایک دم سے خاموشی ہندیانی انداز میں چنچ پڑی۔

ایک کارکن نے آکر اطلاع دی۔

وہ جب گھر جانے کے لیے دفتر سے نکلے تو باہر قدم رکھتے ہی نامعلوم کارسواروں نے لیڈر وقار حسن کو اغوا کر لیا اور نامعلوم مقام پر لے گئے۔ میں سیڑھیوں سے ایک چیخ کی طرح اتر گئی۔ میں دفتر جانا چاہتی تھی۔ پولیس میں رپورٹ درج کروانا چاہتی تھی۔ لیکن ہزار کوشش کے بعد بھی کچھ نہ ہوا۔ سوائے چند تسلیوں کے، جنہیں میں گرہ میں باندھ کے گھر پہنچی تو لیڈر وقار حسن کی بوری بند لاش صحن میں پڑی تھی۔ میں نے فون پر پولیس کو اطلاع دی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد وقار حسن کو حقوق انسانی کے ہزاروں کارکنوں کی موجودگی میں دفن دیا گیا۔ اب نہ تو میرا بیٹا رہا اور نہ میرا خاوند۔ اب میں دنیا میں تنہا تھی۔ میرے لئے دو ہی راستے تھے۔ ایک میں خودکشی کر لوں اور اس ظالم معاشرے سے ہمیشہ کیلئے دور ہو جاؤں یا پھر اپنے مقصد کو لیکر حقوق انسانی کیلئے آواز اٹھاؤں اور اسی راہ میں جان دے دوں۔ پھر میں نے گلاس میں رکھے ہوئے دودھ کی طرف دیکھا۔ کفن سے بھی اجلا دودھ میں نے اپنے دودھ کی قسم کھائی۔ لیڈر میں بنوں گی۔ حقوق انسانی کیلئے میں لڑوں گی۔ میں لیڈر کہلاؤں گی۔ شائد میں اپنے بچے جیسے ہزاروں بچوں کو کفن دے سکوں۔

میں اپنے ماضی سے لوٹ آئی۔ میرے پاس سوچنے کو تھا بھی کیا۔ آج بھی شہر میں چاروں طرف سے لیڈر لیڈر کی آوازیں آتی ہیں۔ اور میں جانتی ہوں کہ اب شاید میں آزاد دنیا کو دو بارہ نہ دیکھ سکوں۔ مگر میں حوصلہ ہارنے والی نہیں تھی۔ میں جیل میں بیٹھ کر بھی اس جدوجہد کو جاری رکھوں گی۔ یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

جب میں اگلی صبح بیدار ہوئی تو میرے بدن کا ہر حصہ زخمی تھا۔ میں غسل خانے میں گئی تو وہاں غسل خانے کی دیوار کے اوپر سے پانی کی نرم لچک والی ٹکلی لٹکی ہوئی تھی۔ حوالات کے باہر کھڑے ہوئے ایک پہرے دار نے پانی کھول دیا۔ اس ٹکلی سے پانی کی ایک پتلی دھار برآمد ہوئی۔ جیسے ہی میں نے صابن سے اپنے منہ میں جھاگ بنائی تو اس نے فوری طور پر ایک دو تین اور بس۔ ٹکلی میں پانی ختم ہو چکا تھا۔ میرا منہ ابھی جھاگ سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن پانی کی ٹونٹی کھولنے اور بند کرنے والے پہرے دار نے کہا۔ پانی ختم ہو چکا ہے۔ پولیس کے نزدیک یہ غسل تھا۔ اسی دن دو پہر کے وقت کورٹ لیجاتے وقت تھانے کے ایک آفیسر نے کہا تھا۔

”یاد رکھئے گا۔ ہم لوگوں نے تھانے میں آپ کے ساتھ کسی بھی طرح کا برا سلوک نہیں کیا۔“

حالانکہ گاڑی تک جانے کیلئے سٹریچر سے باہر لے جایا گیا۔ جب میں نے تھوکا تھا تب بھی منہ سے خون آرہا تھا۔ کافی دیر بعد مجھے پتہ چلا کہ ایسا کہنے کا ایک دستور چلا آرہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے جلاد پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالنے سے پہلے مجرم سے معافی مانگ لیتا ہے۔ یہ واروات دو پہر کی تھی۔ اس کے بعد تو پولیس دین میں بیٹھے بیٹھے شام ہو گئی۔ کہیں سے کچھ لوگوں کی آواز کانوں میں آئی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آکسیجن دینی پڑے گی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میں رہ رہ کر بے ہوش ہو رہی تھی۔ اس سے کچھ اور فائدہ ہو یا نہ ہو لگا تار بیٹھے رہنے کی بوری سے راحت مل گئی تھی۔

پچھلے دس دنوں سے اتنی زیادہ جوتوں کی کھٹ کھٹ سنتی آرہی تھی کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ آواز باہر سے آرہی تھی یا میرے دل سے آرہی تھی۔ میں نے آنکھ کھول کر شام کے منجھکے سائے میں دیکھا۔ میرے ساتھ ہی کئی وردی میں ملبوس کئی جوڑی بوٹوں والے پاؤں تھے۔ ان کے پیچھے

گاڑی کے فرش کے آخری سرے پر جہاں دیوار ہونی چاہئے تھی وہاں انچ بھر ایک چھید تھا۔ یہاں تیزی سے گذرتی ہوئی روشنی کی ایک ہلکی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ سمجھ میں آیا کہ یہ ترپال سے ڈھکا ہوا ایک سوراخ تھا۔ میں دونوں طرف بیٹھے ہوئے جوانوں اور لیڈیز اہلکاروں کے درمیان فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ خوب پیاس لگی تھی۔ شاید میرے منہ سے کوئی آواز نکلی ہوگی۔ ایک زنانہ آواز تھی۔ پوچھا

”کچھ کہہ رہی ہو؟“ اندازہ لگایا لیڈیز اہلکار ہے۔ پتہ نہیں یہ کیوں ساتھ رہتی ہیں۔

”کہاں جا رہی ہوں؟“

”کوٹ لکھ پت جیل۔“

”کب پہنچوں گی؟“

”یہی چار یا پانچ بجے۔“ کسی نے دھمکایا، شاید میرے پہرے دار کو بات کرنے سے منع کیا گیا ہوگا۔ گاڑی اندھیرے میں دوڑ رہی تھی۔ کچھ باہر تو کچھ اندر۔ نیم اندھیرا ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ میرا جسم اور دل الگ الگ مشکل میں کام کر رہے تھے۔ جسم میں بہت تکلیف تھی۔ گاڑی چلنے سے کبھی ادھر ادھر لڑھک جاتی تھی۔ کبھی کبھی سن ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ پھر بدن میں حرکت ہونے لگتی تھی۔ ترپال کے نیچے کے پتے چھید سے ٹھنڈی ہوا چہرے سے ہوتی ہوئی دوسری طرف نکل جاتی تھی۔ لیکن دل کیساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ جیسے جسم اس سے جڑا ہی نہ ہو۔ دل حتی الامکان سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر رات کے وقت میں کوٹ لکھ پت جیل پہنچوں گی تو وہاں کچھ نہیں دیکھ پاؤں گی۔ میرا کسی کو پتہ تک نہیں چل پائے گا۔ تھوڑی دی بعد پہرے دار سے کہا

”گاڑی کو دھیرے دھیرے چلانے کو کہئے نا۔ مجھے اب کائی آرہی ہے۔“ میں نے کہا تو اُلٹی کے اندیشے سے ڈرائیور نے گاڑی دھیرے دھیرے چلانے لگا۔ ان میں سے کسی نے بوٹ سے مجھے ٹھیل دیا۔ میں نے سوچا مجھے یہ لوگ دنیا کے کس کس کو نے میں لے جا رہے ہیں؟ ویسے تھانہ میں کہہ رہے تھے کہ پولیس مقابلہ بنا کر دریائے راوی میں پھینک دو۔ ویسے پولیس اہلکاروں نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا پھر دریائے راوی میں تو چلو بھر پانی بھی نہیں ہے تو پھر میں بہوں گی کیسے؟ اسکی یاد آتے ہی میں ہنس پڑی۔ وہ سب مجھے ہنسی دیکھ کر چونک گئے۔ ایک مقام پر گاڑی جھٹکے کیساتھ ڈک گئی۔ وہاں پھر سے کئی لوگوں کی بات چیت کانوں میں سنائی دینے لگی۔ بوٹوں کی آواز اور جھنجھٹا ہٹ کیساتھ کسی لوہے کے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔ پولیس وین سے مجھے کسی اناج کی بوری کی اتارا گیا۔ زمین پر اٹھ کر بیٹھنے کے بعد میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ خستہ اور کم روشنی والے دو کمرے تھے۔ کسی دفتر جیسا لگ رہا تھا۔ گاڑی کوٹ لکھ پت جیل کی ڈیوڑھی میں آ کر رک گئی تھی۔ ادھر کچھ لوگ بات چیت کر رہے تھے۔ ایک کرخت چہرے والے آدمی نے کہا۔

”سٹرینچر لانے میں تو دیر ہوگی کیا آپ پیدل نہیں چل پائیں گی؟“

میں نے اس آدمی کی طرف سر و نظروں سے دیکھا اور اندر کا گیٹ پار کر کے ایک بڑے چبوترے پر پہنچتے ہی گر پڑی۔ پھر بھی دل میں اس بات کا اطمینان تھا کہ پیدل چل کر جانے سے جیل کے لوگوں کو اچھی طرح دیکھ پاؤں گی۔ اتنی دیر میں نظر آیا کہ جس گیٹ سے ہو کر آئی تھی وہاں سے

کچھ فاصلے پر اوپر ایک کالے بورڈ پر سفید رنگ سے لکھا ہوا تھا۔

سنٹرل جیل کوٹ لکھپت“

پھر ایک بڑا سا دروازہ اور اسی کے بیچ میں ایک چھوٹے سے کٹے دروازے میں سے تالا کھلنے کی آواز آئی اور اسی وقت میں جیل کے اندر داخل ہو گئی۔ میں بے حد سہمی ہوئی تھی۔ پاس اور دور کے سفید رنگ کے بلاکوں میں سلاخیں پکڑ کر بے شمار قیدی کھڑے تھے۔ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے ایک سمت دروازے کے اندر دھکیل دیا اور پھر اندھیرے کی گود میں سماتے ہوئے میں نے ایک مردانہ آواز سنی۔

”لکھو اکیس۔ نو تاریخ، پہلی آمد۔“

تجھی مجھے ایک جھٹکے میں یاد آیا کہ آج میری پیدائش کا دن ہے۔ میں نے اکیسویں سال میں پاؤں رکھا تھا۔ ان حادثوں کو یاد نہیں کر رہی تھی بلکہ یوں کہئے کہ میں تصورات میں تاریخ کے اُن گنت اوراق پلٹ رہی تھی کہ ہم کہاں سے چلے تھے کہاں آ گئے ہیں۔ چلے تھے اس محمد علی جناح کی قیادت میں جس کے حریف کیا دشمن بھی اس کی ذہانت، دیانت، محنت، امانت، وجاہت، نفاست اور عدالت کے قائل تھے۔ جھوٹ، منافقت، ریاکاری، لالچ، دکھاوے، ڈرامہ بازی سے بالکل پاک پوتر وہ آدمی جسے لوگ لیڈ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ لوگوں کو لیڈ کرتا تھا اور مقبولیت، غیر مقبولیت سے ماورا ہمیشہ صاف ستھری، بے لاگ اور دو ٹوک بات کرتا تھا۔ پھر کیا ہوا۔ بلنڈر، بلنڈر اور سرنڈر کی طویل سنسنی خیز تاریخ کے بعد آج اپنے ارد گرد دیکھیں تو روح پر بھی رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی میں برف سی بھرنے لگتی ہے۔ دماغ منجمد ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں سرد پڑنے لگتے ہیں۔ ایک ایک مسام سے آتش فشاں پھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ آنکھیں جلنے لگتی ہیں دل ڈوب جاتا ہے اور ایک ہوک سی اٹھتی ہے کہ اے پروردگار! ہم بھیڑوں کے ریوڑ کو کن کے حوالے کر چھوڑا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے کوئی جرم کیا تھا یا ہم سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا کہ ہمیں اپنی وہ نسلیں بھی وقت بردہوتی دکھائی دیتی ہیں جو ابھی گناہ اور جرم کی عمروں کو بھی نہیں پہنچیں۔ رحم رب العالمین رحم۔ معافی میرے سوا معافی۔ جیسی قوم ہو ویسے ہی حکمران ان پر مسلط کر دیئے جاتے ہیں تو مجھے ماتم ان کا نہیں اپنا کرنا ہوگا۔ ورنہ سمجھو سزا سنانی چاچکی اور اس پر عمل درآمد کا وقت بھی طے ہو چکا۔ وہ ملک جسے کبھی عالم اسلام کا قلعہ کہا گیا وہ ملک جس نے عالم اسلام کی قیادت کرنا تھی۔

میں دریاواں دی بانی ساں
ترنے پے سکھا کھال نی مانیں

(میں تو دریاؤں کی بھجولی تھی لیکن وقت نے مجھے گندے اور تنگ نالوں میں تیرنے پر مجبور کر دیا)

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ آج ہم اور ہماری سیاسی، فکری، مذہبی قیادتیں یہ سوچتیں کہ صرف چودہ ملین یہودیوں نے ہم ڈیڑھ بلین مسلمانوں کو اس بری طرح نیچے کیوں لگا رکھا ہے۔ دنیا میں ہر پانچواں انسان مسلمان ہے۔ ہر ایک صرف ایک یہودی کے مقابلہ پر 107 مسلمان موجود ہیں تو دوسری طرف عہد حاضر کی تاریخ کے موروز اینڈ ٹیکرز میں سے کوئی ایک بھی مسلمان کیوں نہیں؟؟ آج کی دنیا کے صورت گر چار لوگ ہیں یعنی البرٹ آئن سٹائن، سگمنڈ فرائیڈ، کارل مارکس اور ملٹن فرائیڈمین۔ یہ چاروں ہی یہودی کیسے ہو گئے کہ علم تو ہماری میراث تھی۔ ویکسی نیٹنگ سوئی

سے لے کر پولیو کے ویکسین تک خون کے سرطان کی دوائی سے ہپاٹائٹس بی کے علاج تک SYPHILIS DRUG سے لیکر گردوں کے ڈائلیز تک نیورو سے لیکر سکسکولر سے ENDOCRINOLOGY تک سب کے سب موجود یہودی؟ ہمارے مختلف قسم کے نابالغے سر جوڑ کر بیٹھتے اور ناپ تول کرتے کہ دنیا کی تاریخ کو یکسر تبدیل کر دینے والی تقریباً ہر یاد کے پیچھے صرف یہودی ہی کیوں ہے۔ مثلاً مائیکرو پراسیسنگ۔ چپ کے پیچھے STANLEY نیو کلیمیر چین ری ایکٹر کے پیچھے Leo آپٹیکل فائبر کیبل کے پیچھے STRAUSS BENNO ویڈیو ٹیپ کے پیچھے چارلس گنسرگ تو یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کا توڑ اور پائے کیا ہے؟ اور ہم کب تک غیروں بلکہ حریفوں کے طفیلے بنے رہیں گے۔ ہم کب تک مغرب کے جوا خانوں کو آباد کرتے رہیں گے۔ ہم کب تک اپنے ملک کو لوٹ کر انگلینڈ، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، فرانس، سویزر لینڈ اور اسپین کو آباد کرتے رہیں گے۔ اپنے ملک خالی کر کے ان کو بھرتے رہیں گے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ہمارے قائدین و اکابرین ان سوالوں پر غور و فکر میں مصروف ہوتے لیکن یہ گٹروں سے پانی نکال رہے ہیں۔ آٹے کی سمگلنگ روک رہے ہیں۔ اعلیٰ لہذا القیاس۔

نبی رحمت ﷺ نے فرمایا علم حاصل کرو خواہ اس کیلئے چین جانا پڑے۔ تو کیا چین دینی علوم کا سرچشمہ تھا۔ علم صرف علم ہوتا ہے اور اس کے حصول میں بہت پیچھے رہ جانا ہی ذلت و زوال کا بنیادی سبب ہے۔ اپنے ہی آنسوؤں اور عرقِ ندامت میں ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ امریکہ میں 5758 یونیورسٹیاں ہیں۔ ہندوستان میں 8407 جبکہ پوری مسلم دنیا یعنی 57 مسلمان ملکوں میں یونیورسٹیوں کی مجموعی تعداد صرف 500 ہے اور پورے عالم اسلام میں ایک یونیورسٹی بھی ایسی نہیں جسے دنیا کی ٹاپ 500 یونیورسٹیوں میں شامل کیا جاسکتا ہو۔ یہاں عامل با بے اور بنگالی جادوگر ہی جینے نہیں دیتے یا سیاست دانوں کے ڈھیر لگے ہیں اور منگل باغوں کے لشکر یا پھر کانواں والی سرکار۔ کس کس کا نوچ لکھوں کس کس کا کروں ماتم۔

مجھے تحریک حقوق انسانی کے بے شمار چہرے یاد آ رہے تھے جو ماؤس کی سیاہی کے بیچ تاروں کی طرح تھے۔ میں وقت کی دھول جھاڑ کر اپنے سینے میں انہیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ باہر نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان میں سے کتنی دوستوں نے کہا تھا ماریہ ہمیں بھول تو نہیں جاؤ گی۔ دل ہی دل میں ان کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ یہ دیکھ لؤ تمہیں بھولی نہیں ہوں، ثناء، ندرت، انعم، نورین، مریم اور انکے علاوہ اور بھی کتنے لوگ جو قید میں ہیں یا بھر مر گئے یا پاگل ہو گئے یا سدرہ، سعدیہ، شراجو تحریک کے دوران میرے ساتھ شانہ بشانہ تھیں ان میں سے کسی کو بھی میں بھولی نہیں ہوں۔ بہتر زندگی کی خواہش اکثر بدترین زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے تو یہ تھی کوٹ لکھپت سینٹرل جیل۔

اس دن صبح سے میری طبیعت شدت سے خراب تھی۔ میں وقفے وقفے سے بے ہوش ہو رہی تھی۔ میں نے ہوش میں آتے ہی خود کو ایک لوہے کی چار پائی پر لیٹے ہوئے پایا تھا۔ میرے پاؤں کے پاس موجود کھڑکی سے آسمان کی روشنی اندر آرہی تھی۔ میں چونک کر یونہی اٹھ کر بیٹھنے لگی تو چشمہ پہنے ہوئے ایک دبیلے پتلے شخص نے جلدی سے بڑھ کر مجھے زبردستی روکنا چاہا۔ اس نے کہا۔

”لیٹی رہو لیٹی رہو“ میں نے دیکھا کہ میرے بیڈ کے چاروں طرف اور بھی بہت سارے لوگ کھڑے ہیں۔ ان میں سے کچھ باوردی تھے اور میٹرن کی پوشاک میں ایک عورت بھی تھی۔ یہ جیل کے اندر کا ہسپتال تھا۔

”میں کس کے بستر پر لیٹی ہوئی ہوں۔“ ایک جواں سال میٹرن سے پوچھا جس کے ہاتھ میں سوپ دکھائی دیا۔ وہ بولی۔

”کسی کا نہیں۔ یہ ہسپتال کا وارڈ ہے تم بہت بیمار ہو۔ بات مت کرو۔ یہ لودوائی پی کر سو جاؤ۔“

اس ہسپتال کی سرخ بے رحم دیواروں میں بڑی بڑی سلاخوں والی کچھ کھڑکیاں تھیں، کمرے کے اندر لوہے کی پانچ چار ہائیاں تھیں۔ دو پر بستر لگائے گئے تھے باقی سب خالی تھیں۔ دیوار کا نچلا حصہ اور دروازے کی کھڑکیاں سب رنگے ہوئے تھے جو بالکل بے جان اور بد صورت تھے۔ ہسپتال کے سامنے لان میں اور بھی بہت خوبصورت لڑکیاں گھوم رہی تھیں کبھی کبھی آنکھ کھولنے پر ایک کھڑکی سے وہ دکھائی دیتی تھیں۔ وارڈ کے دروازے کے سامنے لسوڑی کا ایک پودا تھا جس پر لسوڑھیوں کے گچھے لگے ہوئے تھے۔ وارڈ میں اور بھی لڑکیاں داخل تھیں۔ ڈاکٹر روز صبح کے وقت راوند لگاتا تھا۔ مجھے چپک کر کے ایک کارڈ پر دوائی لکھ دیتا تھا اس کارڈ پر قیدی کا قد، وزن اور جسم کا شناختی نشان درج ہوتا تھا۔ اس کو یہاں ”ٹکٹ“ کہا جاتا تھا۔ تھوڑی بہت بات کرنے کے لائق ہوئی تو میں نے ڈاکٹر سے پڑھنے کیلئے کوئی کتاب مانگی تھی۔ وہی میٹرن کی پوشاک پہنے ہوئے لڑکی نے کہا۔

”صحت یاب ہو جاؤ گی تو کتابیں بھی پڑھ لینا۔“

میں اس ماحول میں پریشان ہو جاتی تھی۔ ایک نالی صاف کرنے کیلئے جمعدار کو بلوانے کی بات کرتے ہوئے سب گھبرا گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہیڈ وارڈن کو یہاں جمعدار کہا جاتا ہے۔ جیل کا وہ کرتا دھرتا ہوتا ہے۔ اس طرح کی ایک اور اصطلاح لوکیس (Love case) ہے۔ لوکیس میں نابالغ لڑکی کے اغوا اور عصمت دری سے جزی ہوئی جو لڑکیاں آتی ہیں انہیں لوکیس کی لڑکی کہا جاتا تھا۔ تب تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ جو لڑکیاں اس جرم کا شکار ہو کر آتی ہیں ان کا کیا ہوتا ہے۔ نابالغ لڑکیوں کے سر پرست ہی ایسے معاملوں کی شکایت درج کراتے ہیں۔ حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ لڑکی کورٹ میں یہ بیان دے دے کہ وہ لڑکے کیساتھ اپنی مرضی سے نہیں بھاگی تھی لیکن اکثر لڑکیاں یہ نہیں کہتیں کیونکہ اس طرح لڑکے کو دس سال کی سزا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اگر کوئی لڑکی ایسا کرے بھی تو دوسری لڑکیاں اسے دھتکارتی تھیں۔

عائشہ نام کی ایک لڑکی اپنی ماں فاطمہ اور اپنے منگیتر شان کیساتھ آئی تھی۔ چھوٹی سی گڑیا کی طرح سانولی سی، گاؤں کی بیٹی۔ سبھی نے اسے گھیر لیا تھا۔

”تمہارا کیا کیس ہے؟“

وہ بے تحاشہ روئے جا رہی تھی۔

مجھے ایک وقاص عرف وکی نامی لڑکا بلیک میل کر رہا تھا۔

بس پھر کیا تھا فوراً سب نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی لوکیس ہے۔

”مت رو کچھ نہیں ہوگا۔“

جب عائشہ نے دیکھا کہ یہاں اور بھی بہت سی لڑکیاں ہیں اور وہ گانے بھی گارہی ہیں۔ کسی کے چہرے پر کوئی ملال نہیں ہے تو ان سب کو لال لال آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔

دوسرے دن ڈاکٹر نے حسب معمول نئی لڑکیوں کیساتھ جب عائشہ کو بلا کر پوچھا کیا کیس ہے تمہارا؟

”لوکیس۔“ عائشہ نے پوری خود اعتمادی سے کہا تو کارڈ ہاتھ میں پکڑتے ہی ڈاکٹر صاحب چونک پڑے۔
 ”نہیں لوکیس نہیں۔ تمہارا تو مرڈر کیس ہے۔“

☆☆☆

عائشہ گلاب نگر کی رہنے والی تھی۔ اسی قصبہ میں شیخ منصور کا کنبہ رہتا تھا۔ کئی سال قبل کسی بیماری کے سبب شیخ منصور کی موت ہو گئی تھی۔ اب اس کے کنبے میں بیوی رابعہ منصور کے علاوہ شیخ افضل، شیخ محسن، شیخ طیب، شیخ خالد، وقاص عرف وکی نامی پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں نرجس شیخ اور سمیرا شیخ تھیں۔ کچھ اولادوں کے بیاہ شیخ منصور اپنی زندگی میں ہی کر گیا تھا۔ کچھ کی شادیاں رابعہ منصور نے کر دیں۔ لے دے کر اب سب سے چھوٹا وقاص ہی بچا تھا۔ وہ بحریہ کالج میں بارہویں جماعت کا طالب علم تھا۔ وقاص انیس بیس سال کا تھا جیسا کہ اس عمر کا تقاضا اور کالج لائف کا ماحول ہوتا ہے۔ وقاص کے بھی پر نکل آئے تھے۔ چار پانچ لڑکوں کا ایک گروپ تھا۔ وہ کالج میں پڑھنے کیلئے آتے تھے مگر ان کا دل پڑھائی میں کم خرافات میں زیادہ لگتا تھا۔ زبان بند رکھنے سے انسان کا کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ سب کچھ بچ جاتا ہے اور جب زبان کھول دی جائے تو سب کچھ خرچ ہو جاتا ہے کچھ نہیں بچتا۔ وقاص حتیٰ کہ شخصیت بھی نہیں بچتی۔ ایک دن وقاص کالج گیا تو اس نے عائشہ کو دیکھا پہلی نظر میں ہی عائشہ کا سہانا حسن وقاص کے دل پر جادو کر گیا۔ پہلے تو دل میں آیا کہ دوسری لڑکیوں کی طرح اسے بھی چھیڑ کر مزہ لیا جائے مگر فوراً ہی اس نے یہ خیال دل سے نکال دیا اور سوچا کہ لڑکی جس کسی کام سے کالج آئی ہوگی وہ کر کے لوئے گی تو اس کا تعاقب کر کے گھر کا سراغ لگا لے گا۔ اس کے بعد وہ صبح و شام گھر کے چکر لگا کر لڑکی کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرے گا۔ وقاص نے حسینہ کے آس پاس منڈلانا شروع کیا تو تھوڑی ہی دیر میں اسے معلوم ہو گیا کہ لڑکی کا نام عائشہ ہے اور کالج میں ٹیچر بن کر آئی ہے۔ کالج کی ٹیچر پر طلباء ڈورے ڈالیں یہ بات کچھ عجیب سی تھی۔ اسکے باوجود وقاص نے سوچ لیا کہ جوانی کی امنگوں کا سنہرا جال پھینک کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟ پھنس گئی تو ٹھیک ہے نہ پھنسی تو سڑکوں پر آنکھیں سیکنے کا کام بدستور جاری ہے۔

عائشہ کے باپ امجد علی کی موت ہو چکی تھی۔ عائشہ کے کنبے میں اسکی ماں فاطمہ چھوٹی بہن انیلا اور دو بھائی شاہد اور جاوید تھے۔ امجد علی کی بے وقت موت کے بعد کنبے کی گاڑی مشکل میں پھنس گئی۔ زندگی بسر کرنے کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو فاطمہ مزدوری کرنے لگی اور جاوید تھری وہیلر ڈرائیور بن گیا۔ اتنے سے بھی گھر کے حالات نہیں سدھرے تو عائشہ خود بھی چار پیسے کمانے کیلئے منصوبہ بندی کرنے لگی۔ عائشہ انٹر پاس تھی اسے پرائیویٹ کالج میں ہی ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔ عائشہ کو چھوٹی کلاسز پڑھانے کا کام ملا تھا۔ جب عائشہ کے ارد گرد منڈلاتے ہوئے کئی دن گزر گئے اور اس نے نظریں اٹھا کر بھی وقاص کی طرف نہیں دیکھا تو وقاص کے اندر کا چھچھورا پن بیدار ہو گیا۔ عائشہ کو لبھانے کیلئے اس نے ایک عجیب طریقہ اپنایا۔ ایک دن کی بات ہے کلاس میں عائشہ کا پیریڈ شروع ہوا تو وہ پہلے ہی اس کی کلاس میں جا کر بیٹھ گیا۔ آگے کیا کرنا ہے وقاص نے شرارتی لڑکوں کو سکھا پڑھا کر تیار کر لیا۔ پیریڈ اٹینڈ کرنے کیلئے عائشہ جیسے ہی کلاس میں آئی لڑکوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ عائشہ نے لڑکوں کو زور سے ڈانٹا۔ خاموش ہو جاؤ ورنہ شیخ پر کھڑا کر دوں گی۔ بہت سارے لڑکے ایک ساتھ زور سے چلا پڑے۔

”ہمیں پتی دوگی۔“ عائشہ کو کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ شرم سے وہ گڑھی گئی۔ اتنے چھوٹے بچوں کی ایسی فرمائش؟ تبھی عائشہ نے عقب

کی بیٹی پر چھوٹے بچوں کے درمیان چھپے وقاص کو دیکھ لیا۔

”اے مسٹر آپ کون ہیں؟ اور اس کلاس میں کیا کر رہے ہیں۔“ وقاص فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا تعارف کروایا۔ پھر مسکرا کر بولا۔
”آج مجھے اپنا بچپن یاد آیا تو اس کلاس میں آکر بیٹھ گیا۔“

”اگر میں پرنسپل سے آپ کی شکایت کر دوں تو آپ کالج سے نکالے جاسکتے ہیں۔ مگر میں آپ کا مستقبل برباد نہیں کرنا چاہتی۔ اسلئے وارننگ دے کر چھوڑ رہی ہوں۔ آئندہ خیال رکھئے گا۔ اب نکلے کلاس سے۔“ عائشہ نے سنجیدگی سے کہا۔ وقاص حد درجے کا بے شرم تھا اس نے مسکرا کر عائشہ کو آنکھ ماری اور کلاس سے باہر نکل گیا۔ عائشہ تلملا کر رہ گئی۔

کچھ دنوں بعد شام کے وقت آسمان پر کالے بادل چھا رہے تھے اور رہ رہ کر بجلی بھی چمک رہی تھی اور بادل گرج رہے تھے۔ لگ رہا تھا کہ زوردار بارش ہوگی۔ وقاص کو ایسا موسم بہت بھاتا تھا۔ اس نے اپنی بایک نکالی اور یونہی آوارہ گردی کرنے کو نکل پڑا۔ چونکہ موسم خراب تھا اس لئے سڑکوں پر آمدورفت بھی کم تھی۔ وقاص بایک دوڑاتا پکھری کی طرف نکل گیا۔ وہیں اس نے پریشان حال عائشہ کو کھڑے دیکھا۔ وقاص نے فوراً اس کے پاس جا کر بایک روک دی۔

”عائشہ جی آپ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“ اسے دیکھ کر عائشہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔
”ارے تم تو وہی بدتمیز ہو۔ جو اس دن کلاس میں لڑکوں سے فوننگ کر رہے تھے۔“

”وہ سب تو میں نے اس لیے کیا تھا تا کہ آپ مجھے پہچان لیں۔“

پہچان تو گئی ہوں۔ اب تم یہاں سے جاتے ہو یا تمہیں چلتا کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کروں۔“

”پلیز اس وقت غصہ نہ کریں۔ میرا خیال ہے آپ یہاں پر کسی کام آئی ہوگی۔ کہ اچانک ہی موسم نے مزاج بدل لیا اس لیے گھرنیک جانے کے لیے آپ کو کوئی ذریعہ نہیں مل رہا ہے۔ سڑکوں پر آمدورفت کم ہے اور تیزی سے اندھیرا بھی بڑھ رہا ہے۔ بارش شروع ہوگئی تو سارے کپڑے بھگ کر بدن سے چپک جائیں گے۔ اور آپ مفت کا تماشہ بن جائیں گی۔“ وقاص نے التجا آمیز لہجے میں کہا تو عائشہ سناٹے میں آگئی۔
وقاص غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اپنی باتوں کا اثر ہونے دیکھ کر وقاص جلدی سے بولا۔ ”میڈیم میں منجھلا ضرور ہوں مگر برا نہیں ہوں۔ آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔ آپ کا گھر یہاں سے دور ہے۔ آپ بایک پر بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو گھرنیک بحفاظت چھوڑ دوں گا۔“
عائشہ کوئی فیصلہ کر سکی کہ اچانک وہاں پر بد معاش قسم کے شرابی بیٹھ گئے اور دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر عائشہ کے پاس آکر بولے۔

”اس لوٹے سے سودا نہیں پئے گا۔ ہمارے ساتھ چل عیش بھی کروائیں گے اور مزے کا پیسہ بھی دیں گے۔“ عائشہ کی بے عزتی ہوتی دیکھ کر وقاص کو بھویں تن گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی قدم اٹھاتا۔ عائشہ جھٹ اس کی بایک پر بیٹھ گئی۔ وقاص نے فوراً بایک اشارت کی اور ہوا ہو گیا۔ راستے میں دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ قصبہ میں عائشہ نے جہاں کہا۔ وقاص اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی بارش شروع ہوگئی۔ وہ تو پانی سے محفوظ رہی تھی مگر اسے احساس ہو رہا تھا کہ وقاص بھگ رہا ہوگا۔ وہ نا سمجھ تو یہ بھی نہ جان سکی کہ جس محبت میں اس نے احسان کیا وہ الفاظ کی

محتاج نہیں ہوتی۔

اس دن کے بعد عائشہ کے دل میں وقاص کے تائیں جو نظریہ تھا۔ وہ پوری طرح ختم تو نہیں ہوا مگر ایک بڑی حد تک دور ضرور ہو گیا۔ کالج میں آنا سامنا ہوتا تو عائشہ پہلے کی طرح وقاص کو گھور کے نہیں دیکھتی تھی۔ جو لوگ دور ہوتے ہوئے بھی بغیر مطالبے کے اپنی دلی طلب پوری کرتے ہیں۔ ان کا لاشعور عام لوگوں کی طرح غنودگی میں نہیں رہتا۔ ان کی داخلی قوت اور کیفیت ہمہ وقت حرکت میں رہتی ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دونوں میں رکی بات چیت بھی ہونے لگی۔ دل دھیرے دھیرے قریب آ رہے تھے۔ وقاص نے بھی اب چھپھوری حرکتیں کرنا چھوڑ دیں تھیں اور عائشہ کی پوری عزت و تکریم کرنے لگا تھا۔ پھر وہ دونوں اتنے قریب ہو گئے کہ ایک دن ریستورنٹ میں وقاص نے عائشہ سے کہہ ہی دیا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ جذباتی سوچ نہیں۔ میرے الفاظ پر شک ان تمام مناظر کی حقیقت سے انکار ہوگا جن کی تخلیق میں انسان کا ہاتھ نہیں۔“

عائشہ نے پیار کی نگاہ سے اسے دیکھا۔

”میں بھی تم سے پیار کرتی ہوں وقاص اور یہ بھی جانتی ہوں کہ پیار میں کوئی شرط نہیں ہوتی۔ لیکن دل کی تسلی کے لیے ایک سوال ضرور پوچھنا چاہتی ہوں کہ محبت کے اس سلسلہ کو تم کہاں تک لے جاؤ گے؟“

وقاص جذباتی ہو گیا۔

”زندگی کی آخری سانس تک۔ میں سچ سچ تم سے پیار کرتا ہوں۔ محبت سے شروع ہو کر یہ سلسلہ شادی پر ختم ہوگا۔ اس کے بعد ہماری زندگی ایک ساتھ گزرے گی۔“

یہ سن کر عائشہ کی آنکھوں کی چمک بتانے لگی کہ جس چاہنے والے کی اس نے تمنا کی تھی۔ بالکل ویسا ہی اس نے پالیا ہے۔ یہ سن کر عائشہ اور وقاص کی محبت کی کہانی شروع ہو گئی۔ خفیہ ملاقاتوں اور زندگی بھر کا ساتھ نبھانے کی قسمیں اور وعدے ہوتے چلے گئے۔ دن بدن ان کی آشنائی رنگ لاتی گئی۔ ایک دن وقاص نے کہا۔

”انٹر پاس ہوتے ہی میں لاہور جا کر کوئی نوکری کر لوں گا۔ شادی کے بعد ہم لاہور میں رہیں گے اور اپنی دنیا الگ بسائیں گے۔“

وقاص کی یہ بات عائشہ کے دل کو بھاگئی۔ لاہور اس کے بھی خوابوں کا شہر تھا۔ اس لیے وقاص نے اس سے لاہور میں بسنے کی بات کہی تو اس کا دل بھی خوشی سے جھوم اٹھا۔ اور اس خوشی اور جوش میں اس نے اس دن اپنی محبت کا راز اپنی ماں سے کھولتے ہوئے کہا۔

”ماں وقاص بہت اچھا لڑکا ہے۔ ہم آپس میں پیار کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”لیکن وہ ہے کس ذات کا؟ اور کون سی برادری ہے اس کی؟“ ماں نے سوال داغ دیا۔ عائشہ کو خود علم نہیں تھا کہ وقاص کس برادری کا ہے۔ نہ ہی اس نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی تھی۔ اس کے لیے تو سب سے بڑا مذہب عشق تھا۔ ماں نے کہا۔ ”خیر! کسی دن تم اس لڑکے کو لے آنا۔ میں اس سے مل لوں گی اور اس کے بارے میں سب کچھ پوچھ لوں گی۔“

تین چار دن بعد ہی عائشہ نے وقاص کو چائے پر بلا لیا۔ وقاص کو یقین ہو گیا کہ عائشہ کے گھر والوں کی اجازت کے بعد وہ اپنے گھر والوں کو بھی شادی کے لیے رضا مند کرے گا۔ وقاص کی شکل و صورت، قد کاٹھ تو ماں فاطمہ کو پسند آ گیا۔ لیکن جب ذات کے بارے میں پوچھا تو فاطمہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وقاص عیسائی مذہب سے تھا۔ وقاص کے جانے کے بعد فاطمہ نے عائشہ کے کان اٹھائے۔ دل لگایا بھی تو ایک عیسائی سے۔ مسلمان لڑکی کا رشتہ عیسائی سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ وقاص عیسائی مذہب کا ہے۔ یہ جان کر عائشہ سکتے میں آ گئی۔ فاطمہ نے اسے سمجھایا۔

”بیٹی وقاص کو بھول جانے میں ہی تیری بھلائی ہے۔ اس سے تمہارا رشتہ سماج کبھی قبول نہیں کرے گا۔ ہم سب کا حقہ پانی بند ہو جائے گا۔ ایلہ بھی کنواری بیٹھی رہ جائے گی اور تمہارے دونوں بھائیوں کو بھی کوئی اپنی بہن بیٹی نہیں دے گا۔ بھول جا بیٹی۔ وکی تیرے نصیب میں نہیں۔“

عائشہ نے ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو اسے لگا کہ ماں سچ کہہ رہی ہے۔ عیسائی سے محبت کرنے سے اسے بے عزتی اور پریشانیوں کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے باغی پیار کی سزا اس کا کنبہ بھگتے گا۔ اس لیے دوسرے ہی دن اس نے وقاص سے فاصلہ قائم رکھنا شروع کر دیا۔ وقاص کی سمجھ میں نہیں آیا کہ عائشہ اس سے کھنچی کھنچی کیوں رہتی ہے۔ اس نے سبب جاننا چاہا تو عائشہ نے ہر بار اسے ٹال دیا۔ عائشہ نے اس سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ محبوبہ کی اس بے رخی نے وقاص کی حالت دیوانوں جیسی بنا دی تھی۔ کئی ہفتے اسی کشمکش میں بیت گئے۔ بعد میں وقاص کو پتہ چلا کہ عائشہ کی شان نامی نوجوان سے نزدیکیاں بڑھ رہی ہیں اور وہ اس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ دراصل شان عائشہ کی ماں فاطمہ کی پسند تھا۔ وہ طاہرہ اور اقبال کا بیٹا تھا۔ اور صدر بازار میں کپڑے کی کسی دوکان پر کام کرتا تھا۔ فاطمہ اور طاہرہ ہم ذات تھیں۔ ان کی جان پہچان بھی پرانی تھی۔ طاہرہ کو بہو کی تلاش تھی۔ اور فاطمہ بھی جلدی عائشہ کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتی تھی۔ تاکہ وقاص سے اس کی محبت پھر بیدار ہو کر بغاوت نہ کر دے۔ دونوں کے درمیان رشتے کی بات چلی۔ عائشہ اور شان نے ایک دوسرے کو دیکھ کر پسند کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں نے گھومنا پھرنا اور مستقبل کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے۔ وقاص کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ عائشہ کے آگے گڑگڑایا، رویا، پیار کی دہائی دی۔ اس پر بھی عائشہ نے شان کا ہاتھ نہ چھوڑا اور وقاص کو ٹھکراتی رہی۔ اس نے مخالفت شروع کی تو ایک صبح اس کی لاش ہسپتال روڈ پر ریگل پارک میں پائی گئی۔ ہوا یہ کہ لاش سب سے پہلے اس کے کسی واقف کار نے دیکھی اور وقاص کے بڑے بھائی شیخ افضل کو فون کر دیا۔ روتا بلکتا کنبہ تھوڑی دیر میں پارک پہنچ گیا۔ حادثہ کی اطلاع پولیس کو دی گئی۔ تو تھوڑی دیر میں تھانہ انسپکٹر شہزاد احمد ضروری فورس کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ پولیس نے دیکھا کہ وقاص کا سر پھٹا ہوا تھا۔ قریب ہی خون آلود اینٹ پڑی تھی۔ اندازہ لگایا گیا کہ اینٹوں سے وقاص کا سر کچل کر اسے ہلاک کیا گیا ہے۔ موقع پر رضا بٹے کی کارروائی کرنے کے بعد پولیس نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھیج دی۔ اور مقدمہ قتل درج رجسٹرڈ کر لیا گیا۔ شیخ افضل نے اپنی رپورٹ میں وقاص کے قتل کا شک اس کی محبوبہ عائشہ، ماں فاطمہ اور عائشہ کے نئے عاشق شان پر ظاہر کیا تھا۔ پولیس نے نامزد ملزمان کو تلاش کیا تو وہ اپنے اپنے گھروں سے فرار ملے۔ کافی جدوجہد کے بعد ایک مجر کی اطلاع پر پولیس نے فاطمہ کو گرفتار کر لیا۔ فاطمہ سے پوچھ تاچھ کی گئی تو وقاص کے قتل کا سارا راز کھل گیا۔

ہوا یہ کہ عائشہ اور شان کی سگائی ہونے والی تھی اور فاطمہ کا اندیشہ تھا کہ وقاص اس میں اثر ڈالنا ضرور ڈالے گا۔ اس نے اور شان نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے وقاص کے قتل کا منصوبہ بنالیا۔ منصوبہ کے مطابق ایک دن عائشہ نے وقاص کے موبائل پر فون کیا۔

”میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“

وقاص کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ فوراً تیار ہو گیا۔

”بولو کہاں ملنے آؤں؟“

”آدھا گھنٹہ بعد ریگل پارک آ جاؤ۔“ وقاص فوراً اپنی بائیک پر سوار ہو کر ریگل پارک پہنچ گیا۔ عائشہ وہاں پہلے ہی موجود تھی۔ دونوں پارک میں کونے کی ایک بیچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ تبھی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے فاطمہ اور شان نے پیچھے سے آ کر اینٹوں سے پوری طاقت سے اس کے سر پر وار کر دیا۔ دونوں نے تب ہی وار کرنا بند کیے جب وقاص کا سر بری طرح کچل گیا۔ بغیر آواز نکالے ہی اس نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ وقاص کے مرتے ہی تینوں وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ فاطمہ کے گرفت میں آنے کے بعد عائشہ اور شان نے بھی عدالت میں خود سپردگی کر دی تھی۔ پولیس نے جوڈیشل ریمانڈ میں آکر قتل برآمد کر کے عائشہ، اس کی ماں فاطمہ اور اس کے منگیتر شان کو جیل بھجوا دیا اور اب یہ خود غرض لوگ جیل کی ہوا میں تھے۔

☆☆☆

آہستہ آہستہ ڈاکٹر مجھے رفیق غذا کے بدلے ٹھوس غذا دے رہے تھے۔ اب میں چل پھر بھی سکتی تھی۔ ڈاکٹر کے ساتھ میرے خیالات نہیں ملتے تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیوں یہاں ملنے والی تھوڑی بہت سہولتوں کو چھوڑ کر قیدی وارڈ کی لڑکیوں کے ساتھ رہنے کی ضد کر رہی ہوں۔ ہسپتال میں بڑی آزادی باتھ روم اور پانی کی ہوتی ہے۔ پورے فیملی وارڈ میں صرف ایک ٹل کی سہولت تھی۔ ہسپتال میں پیچھے کی طرف ایک ٹل تھا لیکن اسے کھولنے اور بند کرنے کی کوئی آسانی نہیں تھی۔ شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ دن بھر میں صرف آدھا گھنٹہ کے لیے اس میں پانی آتا تھا۔ چار لوگوں کے لیے مٹی کا ایک گھڑا ہوتا تھا کسی طرح وہ بھر پاتا اور کبھی کبھی وہ بھر بھی نہیں پاتا تھا۔ نہانے کا انتظام بھی بڑا عجیب تھا۔ جتنا بڑا اور اتنا ہی صحت کے لئے نقصان دہ تھا۔ ایک اوسط ٹائپ کا حوض تھا۔ باہر سے موٹے پائپ کے ذریعے مرد قیدی اسے آدھا بھر دیتے تھے، لڑکیاں جھنڈ میں اس کے اندر اترتی تھیں۔ اور ایک دوسرے کو ٹھیلتی ہوئی اپنا جسم پانی میں اگلواتی تھیں۔ جو جتنی کمزور ہوتی تھی وہ اتنی دیر بعد حوض میں اترتی تھی۔ اس معاملے میں جیل احکام کا صاف حکم تھا کہ ہفتے میں ایک دن کپڑا چھانٹنے کے لیے پیچھے والے ٹل کے سامنے بڑا چولہا تھا۔ جس کو جلا کر لوہے کے ڈرم میں سوڈا ڈالا جاتا تھا۔ پھر اپنے بدن کے کپڑے دھو لیتے تھے۔ کبھی قیدی ایسا ہی کرتے تھے۔ کسی کسی دن پانی جلدی چلے جانے پر کوئی ایک تو اپنے کپڑے بھی نہیں دھو پاتیں تھی۔ تب انھیں دوسرے دن پانی آنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ تب تک وہ اپنا کپڑا بھی بدل نہیں پاتیں تھیں۔ ایک دن وارڈن بڑا سا عجیب چہرہ بنا کر ایک موٹا بیڈ کور اور کچھ پیاز لے آیا تھا۔ دوسری طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا کہ مردوں کے وارڈ سے بھیجا گیا ہے۔ بیڈ کور ہاتھ میں لے کر اس کی گرامہٹ سے مغلوب ہوئے بنانہ رہ سکی تھی۔

مردوں کے وارڈ سے دو الگ الگ راستوں سے خبر آئی تھی کہ دو قیدی عبدالغفار اور عزیز الرحمن جٹ مجھ سے ملنے کے خواہش مند تھے۔ عبدالغفار سے ملاقات کی اجازت آسانی سے مل گئی تھی۔ میں نے دفتر میں دیکھا کہ ایک کے بدلے جیلر کی ٹیبل کے سامنے تین لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے پولیس کے ہاتھوں غیر انسانی سلوک کا حال سنا، اتنا ہی نہیں لوگوں نے اپنی قمیض اٹھا کر خون سے جھے ہوئے داغ بھی دکھائے۔ اس

لئے جیل کے اندر بیٹھ کر میں خود کو کوس ہی سکتی تھی۔ کیا سوچا تھا؟ ہم حقوق انسانی کے لیے آواز اٹھائیں گے، جلسے جلوس نکالیں گے۔ اور پکڑے جانے پر وہ ہمارے گلے میں پھولوں کے ہار تو نہیں ڈالیں گے؟

اس لیے جیل کے اندر بیٹھ کر انھیں نہ چھیڑنا ہی بہتر ہوگا۔ مجھے ان سے کیا لینا دینا۔ میری کسی سے کون سی قدیمی یا ذاتی دشمنی تھی۔ لیکن قسم ہے اس شہرے کے سادہ لوح عوام کی محرومی کی کہ حاکم وقت بہت ہی سنگدل ظالم اور کٹھن شخص تھا۔ اسے نہ وطن پر رحم آتا تھا اور نہ ہی اسے عوام سے کوئی ہمدردی تھی۔ مجال ہے اس نے کبھی لوگوں کے اصل مسائل اور حقیقی ایشوز پر بات کی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس یہ لوگوں کی تمام تر توانائیاں ایسے ماحول میں جھونکتے اور ضائع کرتے رہتے۔ جن کا عملی فائدہ نہ اسلام کو اور نہ عوام کو۔ نہ موجودہ نسلوں کو نہ آئندہ نسلوں کو۔ تخلیق اور تعمیر سے یکسر عاری، ہوائی قلعوں کے قیدی، خلائی منصوبوں کے برخالق حقوق انسانی سے مکمل طور پر بے خبر جوان خدائی دولت مند ہونے کے باوجود ایک روپیہ ٹیکس نہیں دیتے۔ ان کے بارے کبھی کوئی جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتا کہ ان کے مقدس ذرائع آمدنی کیا ہیں۔ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ کہاں سے آیا؟ یہ وہ فنکار ہیں جو خود مغرب اور اہل مغرب کی ہر شے سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے۔ لیکن معصوم لوگوں کو مغرب کے خلاف مسلسل پوازن کرتے رہتے ہیں۔ یہ عوام کی اگلی زندگی کے نقشے کھینچتے اور زائچے تو بہت بناتے ہیں۔ لیکن ان کی موجودہ زندگیاں بہتر کرنے کے لیے کبھی کوئی مشورہ نہیں دیتے۔ یہ غریب عوام کو مرنے کے بعد جنت میں جانے کے نسخے تو بتاتے ہیں لیکن انھیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ ان کی یہ زندگیاں جہنم سے بہتر کیسے ہو سکتی ہیں۔ ان کے پاس کوئی شے اپنی اور۔۔۔ اور بچل نہیں۔۔۔ یہ ریلیاں کہاں سے اپورٹ ہوتی ہیں؟ یہ ملین مارچ کہاں سے آیا؟ یہ وی فارو کڑی کا نشان کس کی ایجاد ہے؟ ہاتھوں کی زنجیر کا سرچشمہ کہاں ہے؟

یہ تو وہ ہیں جو احتجاج کے جینون اور بچل طریقے بھی نہیں سوچ سکتے تقریباً ہر شے اپورٹڈ ہے یا خود ساختہ۔ یہ سب دھوکہ ہے۔ مثلاً ملین مارچ کو ہی دیکھ لیں۔ یہ لوگ ملین مارچ کے پس منظر سے ہی واقف نہیں۔ آپ لوگ خود نیٹ پر بیٹھیں اور معلوم کریں کہ یہ عظیم ماؤ کا ملین مارچ کتنے عرصہ پر محیط تھا؟ اس میں کتنے لاکھ لوگ تھے؟ ان لوگوں پر کیا گزری؟ کیسی کیسی بھوک ننگ اور اذیت ان مجاہدوں نے اپنی جانوں پر نہ بھگتی اور سب سے بڑی بات یہ کہ کہاں سے چلے کتنے تھے اور منزل تک پہنچے کتنے؟ اور جب پہنچے تو کس حال میں تھے؟ یہ اپنی تو ندیں مرغن غذا سے ٹھونس کر منزل وائر سے لیس ہو کر چند کلومیٹر کو ملین مارچ کہتے ہیں۔ تو میں کانپ اٹھتی ہوں۔ اتنا بڑا اور ننگا جھوٹ۔

وی فارو کڑی کا نشان سروسٹن چرچل نے دوسری جنگ عظیم میں متعارف کرایا۔ جو اس ہولناک جنگ کے فاتحین میں سے تھا۔ جبکہ یہ ٹیڑھی میٹھی انگلیوں اور عجیب و غریب شکلوں والے ایویں وہ انگلیاں اٹھائے پھرتے ہیں۔ جنہیں کرنسی گننے سے ہی فرصت نہیں اور جنہوں نے کبھی ان انگلیوں سے ڈھنگ کا کوئی کام ہی نہیں لیا۔ کیا اس شہر میں ملاوٹ کوئی مسئلہ نہیں۔ کیا ان کو اندازہ نہیں کہ اس شہر میں ملاوٹ کرنے والے مافیہ ہر سال ہمارے کتنے ملین بچے مار دیتے ہیں۔ تعلیم کو انڈسٹری بنانے والے ہماری کس کس نسل کا قتل عام کر رہے ہیں۔ جعلی دواؤں والے کتنے بھیا نک ڈرون ہیں۔ جو عسکروں سے عوام پر نازل ہیں۔ کیا یہ لاعلم ہیں کہ ہر روز کتنی عافیہ صدیقیاں عدم اور وجود کے درمیان مصلوب کن کن بے غیرتوں کی بے عزتی پر مرثیہ خواں ہیں؟ یہ ان پر بیخ پا کیوں نہیں ہوتے؟ مسلمانوں کو منتشر کر کے متصادم کر دینے، ان اصل دشمنوں کی طرف دھیان کیوں نہیں

دیتے جو معاشرہ کو مسلسل دیمک کی طرح اندر سے کھوکھلا کر رہے ہیں۔ ملاوٹ کرنے والوں پیشہ ور جھوٹے گواہوں، جعلی دوا سازوں، قبضہ گروپوں، عامل بابوں وغیرہ کو دائرہ اسلام سے خارج کیوں نہیں کرتے۔ تحریک حقوق انسانی ان کے خلاف جہاد کرے گی۔ میرے آقا محمدؐ کا فرمان ہے۔
 ”جس کو مسلمان کا غم نہ ہو وہ میری امت میں سے نہیں۔“

فرمایا۔

ایمان کے بعد افضل ترین نیکی خلق کو آرام دینا ہے۔ کوئی مسلمان تیرے ہاتھ اور زبان سے ایذا نہ پائے۔ جو چیز تو اپنے لیے پسند نہیں کرتا کسی مسلمان کے لیے بھی پسند نہ کرے۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ ایسی چیز بیچے جس میں کسی نقص کے ہونے کا اسے علم ہو۔ جو شخص اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ کہاں سے مال کماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی پروا نہیں کرے گا۔ کہ اسے کہاں سے جہنم میں داخل کرے۔ جیلر کے دفتر میں ملاقات کے بعد یہ طے ہوا کہ دوبارہ ملنے کے لیے جیلر سے کہہ دینے سے ہی کام ہو جائے گا۔
 ”ہاں وہ تو دیکھ رہی ہوں۔“ اور میں اٹھ کر چلی آئی۔

لیکن جیلر سے کہنے پر بھی کچھ نہیں ہوا۔ عزیز الرحمن جٹ سے ملاقات کے لیے باضابطہ طور پر اجازت لینا پڑی۔ میں اسے بھائی کہہ کر ملنا چاہتی تھی۔ سننے میں آیا تھا کہ تحریک حقوق انسانی کے شہید لیڈر وقار حسن کا سرگرم رکن تھا۔ جیل میں لوگ اس کا نام سنتے ہی کانپ اٹھتے تھے۔ پانچ دن بعد جب ہم عزیز الرحمن جٹ کی ملاقات کے لیے جا رہے تھے۔ تو اس وقت جیلر نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا۔ کہ کسی قسم کی اسٹرائیک کی بات ان سے مت کہیے گا۔ یوں تو یہ بولنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن جب منع کر دیا تو تب جیلر کی کوئی مجبوری رہی ہوگی۔ مجھے فکر تو اس بات کی تھی کہ میں نے بھیا تو کہہ دیا لیکن ڈپٹی جیلر اور باوردی پولیس اہلکاروں کی بھیڑ میں انہیں پہچان کیسے پاؤں گی؟

فیملی وارڈ کے چابی گھر میں چھوٹا سا کھولی نما کمرہ لوگوں کی بھیڑ سے کچھ کھچ بھرا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اسے پہچانوں گی کیسے؟ لیکن ایک تحریک کا گرم جوش کارکن لوگوں گھیرے میں کھلم کھلا کھڑا ہوتا ہے۔ تب اسے پہچاننے میں پل بھر کا وقت بھی نہیں لگتا۔ دوسرے ہفتے پھر انٹرویو کی سلسلہ چلی تھی۔ یہ انٹرویو جیلر کے دفتر میں فیملی وارڈ کی موجودگی میں ہوگا۔ کیا بات ہے پچھلی بار ملاقات کے لئے تمہیں بھوک ہڑتال کرنی پڑی تھی۔ ارے پاگل۔ بھوکے پیٹ کیوں رہو گی۔ احتجاج شروع کر دینا۔ جیلر نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

اور غار بابو یہ کیا سکھا رہے ہیں بہن کو؟

ارے بھئی۔ کوئی پریشانی ہونے پر مجھ سے کہنا۔ میں انتظام کر دوں گا۔

اچھا ٹھیک ہے۔ تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ادھر سے ہم لوگ سب سمجھ لیں گے۔ اس کے بعد قریب قریب باقاعدہ طور پر عزیز الرحمن سے ملاقات ہوتی رہی۔ صرف پندرہ منٹ کا وقت ہوتا۔ اسی میں کتنی باتیں جاننے اور بتانے کی ہوتی تھیں۔ قمیص کی پٹھی ہوئی بانہ کے نیچے سے اچانک کبھی کبھی ایک لمبائی میں جلا ہوا داغ دکھائی دے جاتا تھا۔ یہ میرے جسم پر تھانے میں کیے گئے ظلم کی نشانی تھی۔ کسی بات کو دھیان سے سنتے سنتے اچانک ہنستے ہوئے جیلر سے کہتے۔

”دیکھتے نہیں آپ۔ میں اپنی بہن۔۔۔ لیڈر بہن سے بات کر رہا ہوں۔ آپ کو سننے نہیں دوں گا۔ اسی لئے پھسپھسا کر بات کر رہا ہوں آپ یہاں کھڑے ہو کر کیا کریں گے۔ آپ جائیے“ جیلر کے دفتر کے سامنے اسٹینوکائٹ ہیل تھا۔ اسٹینوکائٹ ہیل پر ریکسن لگا ہوا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک کلا تھ لٹک رہا تھا۔

شام کا آکاش بالکل باہر کے آکاش کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ ادھر نہ دیکھنے پر کوٹ لکھپت جیل کو بہت ہی اچھا کہا جاسکتا تھا، کیونکہ یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں مجھے اکیلے بند رکھنا ممکن نہیں۔ ایک بڑے سے آنگن کے دونوں طرف بڑے وارڈ ہیں۔ الگ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لئے ہم آٹھ قیدی لڑکیاں ایک کمرے میں رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے پیڑ، منتظم کی تھوڑی بہت لا پرواہی اور بڑی تعداد میں لڑکیوں کی موجودگی، جو خاص طور سے ظلم، درندگی اور قتل کی وارداتوں میں گرفتار ہو کر آتی تھیں۔ زندگی سے دست و گریبان تھیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ قیدی لڑکیوں کا بھی ہنسی اور سنگت کا ایک ماحول ہوتا ہے۔ ریشماں خان ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

وہ ایک جواں سال ٹیکسی ڈرائیور ساجد کے ساتھ جیل میں آئی تھی۔ قید کے دوران وہ میرے بہت قریب آگئی تھی۔ عمر قریب بائیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ انگلش سیکھنے میں اس کی بہت دلچسپی تھی۔ اس طرح ریشماں خان سے میرا تعلق بڑھتا چلا گیا۔ وہ پشتو بہت روانی سے بولتی تھی۔ وہاں کی لڑکیاں اس کی زبان سمجھ نہیں پاتی تھیں اس لیے وہ کئی دنوں تک کسی سے بات نہیں کر پاتی تھی۔ ریشماں خان کی شادی نو عمری میں ہی مسجد کے خطیب مولانا ارشد خان سے سرانجام پائی تھی۔ وہ آبائی طور پر چونیاں کے رہائشی ڈاکر خان کے بیٹے تھے۔ ارشد خان برسوں پہلے مصطفیٰ آباد میں آکر بس گئے تھے۔ تقریباً پندرہ سولہ سال سے مصطفیٰ آباد میں واقع مسجد میں وہ امام تھے۔ مولانا شادی شدہ تھے۔ لیکن چند سال قبل ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ریشماں خان سے شادی کر لی۔ پہلی بیوی سے ان کے پانچ بچے تھے۔ جن میں سے ایک بیٹا باہر ملک رہتا تھا۔ ریشماں خان سے نکاح کے وقت مولانا کی عمر 52 سال تھی اور ریشماں خان اٹھارہ برس کی تھی۔ مولانا اور ریشماں خان کی عمر میں تقریباً پینتیس برس کا فرق تھا۔ وقت گزرا تو ریشماں خان ایک بیٹی چندہ کی ماں بن گئی۔ بچی کی پیدائش کے بعد اس کی جسمانی ساخت میں مزید نکھار آ گیا تو تن میں جنسی حسرتیں بیدار ہونے لگیں۔ ریشماں خان اب صحیح معنوں میں جوان ہوئی تھی۔ جب کہ مولانا کی عمر ڈھل چکی تھی۔ ریشماں خان کے پڑوس میں ساجد علی رہتا تھا۔ وہ ریشماں خان کا ہم عمر تھا۔ ساجد علی پیشے کے اعتبار سے ڈرائیور تھا اور مولانا کا رشتہ دار بھی۔ اسی وجہ سے اس کا مولانا کے گھر آنا جانا تھا۔ پھر بہتے ہوئے بہت سے خیالات دل کے نشیب میں اتر کر کہیں جذب ہو گئے۔ بہت سے ایسی نشیب میں نغرا ہوا پانی بن کر ٹھہر گئے۔ تھکی بڑھے تو جھک کر خود کو سیراب کر لیتی ہے۔

پہلے تو ریشماں خان نے ساجد علی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ لیکن ساجد علی کے جلدی جلدی گھر آنے اور لپچائی نظروں سے دیکھنے سے اس کے اندر بھی شیطان انگڑائی لینے لگا۔ ساجد کو اندازہ ہو گیا کہ ریشماں خان بھی اسے حسرت آمیز نظروں سے دیکھتی ہے۔ اور اس سے بات کرتے وقت اس کا چہرہ کھل جاتا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ ریشماں خان بھی اسے چاہنے لگی ہے۔ ساجد علی، ریشماں خان سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا۔ ایک دن ہمت کر کے ساجد علی نے ریشماں خان سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ سیدھا اس کے گھر پہنچا۔ اس وقت ریشماں گھر

میں اکیلی تھی۔ اور خاموش بیٹھی تھی۔ ساجد نے یہی وقت غنیمت سمجھا اور ریشماں خان کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
 ”تمہیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم بھی بگھیسی رہتی ہو۔ تم اپنی زندگی سے خوش نہیں ہو۔ کیا بات ہے؟“
 ”وجہ تم نہیں جانتے؟“ ریشماں خان نے اناس پر سوال کر دیا۔

”جانتا ہوں۔ تمہارے ساتھ نا انصافی ہوئی ہے۔ پتہ نہیں تم کیسے نبھا رہی ہو۔ جب جوانی کا سورج ڈھلنے لگتا ہے تو سائے سایہ داروں سے بڑھ جاتے ہیں۔“ ساجد علی نے چاہت بھری نگاہوں سے ریشماں خان کی طرف دیکھا۔
 ”نبھا کہاں رہی ہوں۔ قسمت کا بوجھ ڈھور ہی ہوں۔ ایک زندہ لاش کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں۔“
 ”کب تک یوں تڑپ تڑپ کر جیو گی؟“ ساجد نے اس کے دل کی تھالی۔
 ”جب تک نصیب میں لکھا ہے۔“

”نصیب بدلا جاسکتا ہے۔“ ساجد مسکراتے ہوئے بولا۔ کیا پتہ نصیب میں کوئی اور شامل ہونے والا ہو۔“
 ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔؟“

ساجد نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا تو ریشماں پہلے تو جھجکی پھر اس نے بھی ساجد کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”ریشماں خان میں تو کب سے تمہاری چاہت دل میں پالے ہوئے تھا۔ لیکن ڈرتا تھا کہ نبھانے تمہارے دل میں کیا ہو؟“
 دونوں طرف کی رضامندی کے بعد دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر ریشماں نے آہستہ سے کہا۔
 ”کل دو پہر کو آ جانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ ساجد نے اس کا رخسار چومنا اور اگلے دن کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

بہت دنوں بعد آنکھیں بھی دھلی دھلی تھیں۔ کچھ موسم بھی نہایا نہایا تھا۔ آج ریشماں خان کو دنیا بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار اگلی دو پہر ساجد علی آیا اور پھر ریشماں خان نے اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ دونوں جسم اتا و لے اور بے قرار تھے۔ دونوں جنسی جذبات سے شرابور ہو گئے اور آسودہ حال بھی۔ ساجد علی نے ایک بار ریشماں خان کا جسم کیا جیتا وہ اس کی غلام ہو گئی۔ اب جب بھی موقع ملتا وہ ساجد علی کے جسم سے اپنے جسم کی پیاس بجھا لیتی۔ ریشماں خان اور ساجد علی اپنی طرف سے پوری احتیاط برتتے تھے۔ مگر ایسا تعلق کب تک چھپا رہ سکتا ہے۔
 بار بار ساجد علی کا ریشماں خان کے گھر آنا اور اس کے آتے ہی دروازہ بند ہو جانا۔ یہ بات لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع لگیں۔ چہ میگوئیاں شروع ہوئیں تو مولانا کو بھی پتہ چل گیا۔ مولانا انھیں رنگ ہاتھوں پکڑ تو نہیں پائے مگر انھیں یقین ہو گیا تھا کہ ریشماں خان بہک گئی ہے۔ اس لیے مولانا نے ریشماں خان پر اپنا غصہ اتارنا شروع کر دیا۔ وہ بات بات پر ریشماں خان کو ڈانٹنے، ڈپٹنے لگے اور پھر بات مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ اب مولانا گھر سے جاتے وقت باہر سے تالا بھی لگا جاتے۔ مگر جوان امگلوں کو سیلاب کہاں رکنے والا تھا۔ ریشماں خان نے کسی طرح دوسرا رستہ بھی نکال لیا۔

ریشماں خان اب ہمیشہ کے لیے ساجد علی کی بننے کے لیے وکیلوں کے چکر لگانے لگی کہ کسی طرح مولانا سے طلاق حاصل ہو جائے۔ وکیلوں نے اسے بتایا کہ مولانا آسانی سے اسے طلاق نہیں دیں گے۔ ریشماں خان کو اب ایک ایک دن بھاری ہو رہا تھا۔ وہ اب ایک لمحہ بھی مولانا

کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ تو دوسری طرف ساجد علی اس سے دوری برداشت نہیں کر پار ہا تھا۔ تب دونوں نے ایک غیر قانونی راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ منصوبہ بندی پر عملدرآمد کرنے کے لیے تاریخ اور وقت متعین کیا گیا۔ منصوبہ کے مطابق ریشماں خان نے ساجد علی کے ذریعے لا کر دی ہوئی نیند کی گولیاں پییں کر مولانا کے کھانے میں ملا دیں۔ کھانا کھاتے کے بعد ہی مولانا گہری نیند میں غرق ہو گئے۔ تو رات تقریباً دس بجے ریشماں خان نے ساجد علی کو بلا لیا۔ دونوں نے پہلے مولانا کو ٹیٹا پھر گلا گھونٹ کر مولانا کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد ساجد علی سوزو کی کار لے آیا۔ جسے وہ کرایہ پر چلاتا تھا۔ مولانا کی لاش کو کار میں ڈال کر ساجد علی اکیلا ہی وہاں سے چل پڑا اور لاش چھانگا مانگا کے جنگل میں پھینک آیا۔ اب انھیں آئندہ کے منصوبے پر عمل کرنا تھا۔

منصوبے کے تحت جاتے وقت ساجد علی، ریشماں خان کے گھر کا دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ریشماں خان نے اپنے گھر کی چھت پر جا کر پڑوسی مولانا نفیس احمد کو اطلاع دی کہ اس کے شوہر اب تک گھر نہیں لوٹے ہیں۔ جاتے وقت وہ روز کی طرح باہر سے تالا لگا گئے تھے۔ سب سے پہلے پڑوسیوں نے گھر کا تالا کھولا۔ مولانا کے لاپتہ ہونے کی خبر اب تک پورے علاقے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ مولانا کو جگہ جگہ تلاش کیا گیا۔ مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ تب تک رات میں کچھ لوگوں کے ساتھ متعلقہ تھانہ جا کر ریشماں خان نے شوہر کی گمشدگی کی تحریر دی۔

ادھر اگلے دن چھانگا مانگا کے لوگوں نے جنگل میں ایک بوڑھے شخص کی لاش دیکھی۔ تو اس کی اطلاع انھوں نے تھانہ چھانگا مانگا کو دی۔ پولیس نے مقتول کی تلاشی لی تو جیب سے ایک ڈائری ملی۔ اس پر درج فون میں سے ایک نمبر پر فون کر کے بات کی گئی۔ تو مقتول کی شناخت مصطفیٰ آباد کے مولانا ارشد خان کے طور پر ہو گئی۔ چھانگا مانگا پولیس نے مصطفیٰ آباد پولیس کو مولانا کی لاش پر آمد ہونے کی اطلاع دے دی۔ اطلاع ملنے پر ریشماں خان بھی کچھ لوگوں کے ساتھ موقع واردات پر پہنچی اور لاش دیکھتے ہی پچھاڑ لگا کر گر پڑی۔ کسی طرح اسے سنبھالا گیا۔ ریشماں خان نے مقتول کی شناخت مولانا ارشد خان کے طور پر کر دی۔ لاش کا پتہ نامہ بنا کر اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا گیا۔ اس کے بعد اندھے قتل کا یہ مقدمہ نامعلوم قاتلوں کے نام درج کر لیا گیا۔

ریشماں خان سے پوچھتا چھ کی گئی تو اس نے بتایا کہ روز کی طرح مولانا عشاء کی نماز پڑھنے گئے تھے اور باہر سے دروازے پر تالا لگا گئے تھے۔ رات کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب وہ نہیں لوٹے تو اسے تشویش ہوئی۔ تب اس نے پڑوسی مولانا نفیس احمد کو مولانا کے ابھی تک نہ آنے کی اطلاع دی۔ مولانا نفیس احمد نے سب سے پہلے باہر دروازہ کا تالا کھلوا دیا اور پھر پولیس کو اس کی اطلاع دی۔

بیوی کی عمر کا فرق پولیس کو کھٹک رہا تھا۔ ریشماں خان کا رونا بھی بناوٹی لگ رہا تھا۔ پولیس نے پہلے ریشماں خان کے فون کی کال ڈیٹیل نکلوائی اور مجبوروں کو بھی سراغ رسانی کے لیے لگا دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک نمبر پر ریشماں خان کی لمبی لمبی باتیں ہوتی تھیں۔ پولیس نے تفتیش کی تو پتہ چلا کہ یہ نمبر محلے کے ہی ساجد علی کا تھا۔ اگلے ہی دن پولیس نے جب ساجد علی کو حراست میں لے کر پوچھتا چھ کی تو پورے معاملے سے پردہ اٹھ گیا۔ ریشماں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ چند روزہ جسمانی ریمانڈ کے بعد عدالت میں پیش کیا گیا۔ جہاں سے دونوں کو جیل بھیج دیا گیا۔ ریشماں خان جیل میں

اپنی محبت اور زندگی کے ہر دکھ کو بھلائے رکھتی تھی۔ کھیل کود اور فنی مذاق اس کا مشغلہ تھا۔ لیکن رات کو نیند میں سسک پڑتی تھی۔

عائشہ کے ساتھ ریشماں خان کی دوستی دیکھنے کے لائق تھی دونوں ایک دوسرے کی زبان سے بالکل انجان تھیں۔ لیکن گھنٹوں آنگن کے بچوں بیچ پیر پھیلا کر یا پھر رات کو کمبل میں لیٹے لیٹے عائشہ خاص پنجابی اور ریشماں خان پشتو زبان میں باتیں کیا کرتیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ ان کے بیچ بہت زیادہ لسانی تربیل کی پریشانی تھی۔

اکتوبر کا مہینہ ختم ہو چکا تھا۔ پیڑ پودوں سے گھرے کمروں میں کافی نمی تھی۔ ایسی حالت میں وہ بیڈ کو کافی آرام دہ تھا۔ پیاز اور سوکھی مرچ بھیجے والا ہمدرد تو اچھا لگا تھا۔ لیکن اس وقت اس کا مطلب میں ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پائی تھی۔ اب سمجھی ہوں۔ عائشہ کی بہن جب اس سے ملنے آئی تھی۔ تب اسے ڈھیر ساری نصیحتیں، اپنے آنسو اور اپنے بھائی کے لگائے پیڑ کے نیبو دے جاتی تھی آہ۔۔۔ کتنی تازہ مہک تھی ان میں۔ اگر جیل نہ جاتی تو کبھی اس بات کی خبر ہو پاتی کہ مسور کی دال کا سوپ نیبو ڈال کر پینے میں کتنا اچھا لگتا ہے۔ اوپر سے جس دن عذرا بھابھی اس میں سوئی موٹی روٹی کو چور کو نمک اور پیاز ڈال دیتی تھی۔ تو مزادو بالا ہو جاتا تھا۔

عذرا بھابھی کو اگر ہر سال بچہ پیدا ہو جاتا تھا تو اس کا کوئی دوسرا ذمہ دار نہیں۔ اگر وہ بچے بھوکے پیاسے رہ کر روتے تھے اور چار پانچ سال کی عمر میں ایک بانس کو بازار لے جاتے وقت منہ کے بل گرنے سے دانت ٹوٹ گئے تھے تو اس کا ذمہ دار ضرور عذرا اور اس کا غیر ذمہ دار شوہر ہی تھا۔ اس لیے بیمار بچے کو کھانا کھلانے کے بہانے وہ محفوظ جنگل میں لکڑی کاٹنے جاتے تھے۔ اس جرم کو معمولی سمجھنا قابل دلیل نہیں ہوگا۔ اس لیے جیل ہو جانے پر بھی کسی کو قصور وار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ان دونوں کو قید ہو جانے پر ان کے بچوں کا کیا ہوگا۔ اس طرح کی عجیب مانگ کی وجہ صرف لاعلمی اور قانون کی نافرمانی پر ہو سکتی تھی۔ یہ نہ سمجھ پانا ہی تھا۔ اس لیے عذرا بھابھی دن رات روتی رہتی تھی بے خبری میں میرے پاؤں دبانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے ڈانٹ بھی کھاتی تھی۔

ان دنوں شہر میں تحریک حقوق انسانی نے بہت زور پکڑ لیا تھا۔ لوگ اپنے اندر ایک باعزت زندگی گزارنے کی خواہش اور نیت پیدا کیے ہوئے تھے۔ ایسی زندگی جس میں چند مخصوص مراعات یافتہ ”بد معاش“ طبقات انسانوں پر حیوانوں جیسی زندگیاں مسلط نہ کر سکیں۔ لوگوں کو اقتصادی جذباتی مذہبی غرض یہ کہ کسی طرح بھی ایکسپلاٹ نہ کر سکیں۔ ایک ایسی زندگی جس میں معاشی انصاف سے عدالتی انصاف اور احتساب تک عام ہو۔ ایسی زندگی کی شروعات کے لیے ہم وطن کو قسم کھا کر محمود غزنوی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہر سیاسی بت پاش کر کے ارض وطن کے سیاسی برہمنوں سے اس ”سومنا تھ“ کا قبضہ چھننا ہوگا۔ اس ہیر کو کیدو سے بچانے اور عوام کے رانجھا تک پہنچانے کے لیے ان کے دماغ درست کرنا ہوں گے۔ بنیادی حقوق کے ساتھ ساتھ حرام خوری اور کام چوری پر لعنت بھیج کر محنت کو اپنا شعار بنانا ہوگا۔ کام کے دوران سگریٹ پینے اور فون سننے کو بھی حرام سمجھنا ہوگا۔ اور خواہ کوئی خا کر وب ہی کیوں نہ ہو۔ اسے اپنے کام پر فخر کرنا سیکھنا ہوگا کہ دیانتداری سے جوتا گاٹھنے والا موچی راشی منصف اور کام چور استاد سے کروڑوں گنا زیادہ محترم ہے اور پھر پیٹھے نہیں پر فارمنس مقدس ہوتی ہے۔

انہی دنوں نمرہ نام کی لڑکی پنجاب کے سرحدی علاقے سے میرے سیل میں آئی تھی۔ نمرہ کا بدن گھٹایا تھا۔ بے حد گرم مزارج اور بہت کم

بولتی تھی۔ ہر روز لاک اپ سے پہلے باغیچے سے گلاب کا پھول توڑ لاتی تھی۔ اور وارڈ کے سیلن بھرے فرش پر سفید رنگ سے مینا کاری کرتی تھی۔ کبھی جھنڈا کبھی کچھ اور بیل بوٹے بناتی تھی۔ وارڈن کے منع کرنے پر دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے اسے سر سے پاؤں تک گھورتی تھی۔۔۔ نہیں میرا مطلب ہے روز روز باغیچے سے پھول توڑتی تھی۔ اس لیے بڑبڑاتے ہوئے وارڈن چل دیتا تھا۔

میٹرن تھوڑی شوقین تھی۔ اکثر تین چار گلاب یا گندھ راج کے پھول اپنے جوڑے میں لگائے رہتی تھی۔ کب چودہ اگست گزر گیا۔ پتہ ہی نہ چل پایا۔ ہسپتال کی نیم غنودہ جگہ پر یہ خبر پہنچ ہی نہ پائی تھی۔ لیکن چودہ اگست کی تیاری زور شور سے کی جا رہی تھی۔ قیدی عورتوں کے ساتھ ساتھ جیل احکام بھی پر جوش تھے۔ میرے لیے مایوس کن خبر یہ تھی کہ مجھے چودہ اگست کا سیمینار سننے کے لیے نہیں لے جایا جائے گا۔ بقول میٹرن کے میں ایک خطرناک قیدی ہوں۔ کسی بھی وقت چکمہ دے کر بھاگ سکتی ہوں۔

نظم و ضبط میں خلل شروع ہوا تو ہیڈ وارڈن نے کہا کہ تم مردوں کے وارڈ میں محفل میلاد سننے ضرور جاؤ گی۔ ہم نے تحریک آزادی میں انگریز کے خلاف لڑنے والی عورتوں کی تاریخ پڑھ رکھی ہے۔ وہ بے حد محبت وطن تھیں۔ وہ آزادی کو اپنی زندگی سے بھی عزیز سمجھتی تھیں۔ محفل میلاد سخت حفاظتی اقدامات میں ہو رہی تھی۔ محفل میلاد میں پہلی بار لڑکوں سے بات چیت کا موقع بھی ملا۔ میلاد شروع ہونے سے پہلے پانچ قیدی لڑکے مجھے بلا رہے تھے۔ کہ وہ کل ہی پکڑ کر لائے گئے ہیں۔ ان پر سول نافرمانی کا کیس تھا۔ ایک دو ہفتے میں ان کو لوٹ جانا تھا۔ ان کی رہائی کے دن دو پہر تین بجے مجھے دفتر لے جانے کے لیے وارڈن آیا۔ کہ رہائی پانے والے تین قیدی انعام الحق، عبداللطیف، اور علی اعجاز کی ضد ہے کہ وہ مجھ سے ملے بنا گیٹ سے باہر نہیں نکلیں گے۔ یہ دفتر وہی تھا جہاں مجھے پہلے دن اتار پھنکا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دفتر میں شورغل مچا ہوا تھا۔ جیلر کے آفس میں کھڑے انعام الحق، عبداللطیف اور علی اعجاز چلا چلا کر ٹیبل پیٹ رہے تھے۔ کہ جیلر کہاں ہے۔ ہم لوگ جیلر سے ملنا چاہتے ہیں۔ دوڑ پٹی سپرینٹنڈنٹ انھیں سمجھانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

”آپ لوگ مار یہ سے ملنا چاہتے تھے۔ یہ دیکھئے وہ آگئی اب غصہ تھوک دیجئے۔“

”دیکھ ہم کب سے انتظار میں تھے۔ یہ جیل انتظامیہ کی بد بخشی نہیں تو اور کیا ہے؟“ تقریباً چھ فٹ لمبے علی اعجاز نے چلا چلا کر آفس کو سر پر اٹھا لیا تھا۔

”کہاں ہے جیلر؟ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔“ میں برآمدے میں آفس کی سڑھیوں کے پاس کھڑی تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ جیلر اسٹینو کے کمرے میں دبک کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آفس کے اندر جانے سے معلوم ہوا کہ ہو مجھ سے ملے بغیر نہیں جانا چاہتے تھے۔ یہ بات سن کر ایک اہلکار حسب عادت کوئی گندی بات بول گیا۔ جیلر نے ان میں سے کسی سے بھی ملاقات نہیں کی۔ لیکن اس سپاہی کو اپنی بات کی معافی مانگنی پڑی تھی۔ مجھ سے ملنے کے بعد وہ لوگ رہا ہو کر باہر چلے گئے تھے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اسی لیے ہم نئی نئی ایجاد کے ماہر ہو گئے ہیں۔ مثلاً پینے کے پانی کے علاوہ دن بھر میں بہت کم پانی ملتا تھا۔ بہاتے وقت اس پانی کا زیادہ حصہ بالوں کو دھونے میں برباد ہو جاتا تھا۔ بہت مشکل سے بلیڈ کا آدھا ٹکڑا حاصل کر کے اپنے بال کاٹنے کے بعد کچھ راحت ملی تھی۔

میری قید شاید مزے میں ہی کٹ جاتی۔ لیکن میں کس قدر پابند تھی اور ذہن کتنا آزاد تھا۔ میری سوچیں وہاں تک پہنچنا چاہتی تھیں جہاں تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ واپس آتی تھیں تو بے بسی کی خراشیں کئی دن تک دکھتی رہتی تھیں۔

عائشہ آفس گئی تھی۔ جیلر نے اس کے منگیتر شان سے ملنے کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ جوڑے میں پھول اڑس کر گئی تھی۔ واپس لوٹی تو اس کا چہرہ متمایا ہوا تھا۔ وارڈ کے اندر آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

عائشہ نے بتایا کہ شان بے حد کمینہ آدمی ہے۔ وہ عدالت میں وعدہ معاف گواہ بن کر قتل کا الزام میری ماں فاطمہ پر لگانا چاہتا ہے۔ شان نے منگیتر ہونے کے اختیار سے ڈھیر سارے لوگوں کے سامنے عائشہ کو گندی زبان میں ذلیل کیا تھا۔ جیل آنے کے جرم میں اس نے عائشہ سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ بھی بڑی استقامت سے سنا دیا۔ اب عائشہ جی بھر کے پوری مرد ذات کو گالیاں دے رہی تھی۔

دہلی پتلی چھریے بدن کی کرن بی بی ماں عشرت جہاں اور آشنا لقمان ڈوگر کے ساتھ اپنے خاوند پولیس ہیڈ کانسٹیبل شاکر علی کے قتل کے جرم میں مجرم بن کر آئی تھی۔ شاکر علی تھا نہ سول لائن میں بحیثیت ہیڈ محرر تعینات تھا۔ وہ اپنی بیوی کرن بی بی عرف گڑیا اور دو بچوں کے ساتھ پولیس لائن میں واقع سرکاری کوارٹر میں رہائش پذیر تھا۔ اس کی ڈیوٹی کبھی رات کی شفٹ میں ہوتی تو کبھی دن میں۔ ایک رات وہ ڈیوٹی کر کے گھر آیا تو کھانا کھا کر وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ کہ کبھی کسی کا فون آیا کہ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ گھر کے باہر کھڑی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ جب وہ دیر تک واپس نہیں لوٹا تو اس کی بیوی کرن کو فکر ہوئی۔ اس نے شاکر علی کے موبائل پر فون ملایا۔ مگر وہ سوچ آف ملا۔ جب رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تو کرن کی تشویش اور بھی بڑھ گئی۔ پریشانی یہ تھی کہ شاکر علی کو موبائل بھی آف تھا۔ جب کچھ اور نہیں سوچا تو کرن نے اس بات کی اطلاع شاکر علی کے ساتھ نائب محرر طاہر علی کو کر دی۔ طاہر علی نے کرن سے صبح تک انتظار کرنے کو کہا۔ لیکن صبح بھی شاکر علی واپس نہیں آیا۔ تو کرن اور بھی زیادہ پریشان ہو گئی۔ دن بھر بھی شاکر علی کا انتظار کیا جاتا رہا۔ جب دل میں اندیشوں کے بادل اٹھنے لگے تو کرن نے شوہر کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی۔ وہ معاملہ ہیڈ محرر کی گمشدگی کا تھا۔ ڈی۔ پی۔ اوفخار احمد کی ہدایت پر پولیس فوراً حرکت میں آ گئی۔ شاکر علی کے اس طرح لاپتہ ہو جانے کا مطلب پولیس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

وقت کی اگلی صبح سبزی منڈی چوکی کے دو سپاہی ڈیوٹی سے واپس لوٹ رہے تھے جب وہ غازی آباد چیک پوسٹ کے قریب پہنچے تو سڑک کے کنارے کچھ دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ سڑک کے کنارے گھاس پھوس اور کیلے کے پتوں کے نیچے سے دو انسانی پیر باہر جھانک رہے تھے۔ انھوں نے قریب جا کر پتوں کو دیکھا سناٹے میں رہ گئے۔ وہ لاش کسی اور کی نہیں گمشدہ ہیڈ محرر شاکر علی کی تھی۔ لاش خون سے لت پت تھی۔ اور اس کے سر میں گولی کے دو سوراخ تھے۔ گمشدہ ہیڈ محرر کے قتل کی اس خبر سے پورے پولیس محکمے میں کھلبلی مچ گئی۔ کچھ ہی دیر میں سارے اعلیٰ افسران پولیس فورس کے ساتھ موقع پر پہنچ گئے۔ اعلیٰ افسران نے موقع واردات کا معائنہ کیا۔ تو پتہ چلا کہ قاتلوں نے شاکر علی کا قتل کسی دوسری جگہ کر کے لاش وہاں پھینک دی تھی۔ موقع پر کسی گاڑی کے نائروں کے نشانات بھی موجود تھے۔ اور قتل غائب ہونے والی رات ہی کر دیا گیا تھا۔ شاکر علی آبائی طور سے فرید پور کا

رہنے والا تھا۔ اس کے قتل کی خبر سن کر اس کے کنبے میں کہرام مچ گیا۔ اس کے والد ناصر علی و دیگر گھروالے بلاتا خیر سول لائن آگئے۔ مقتول کی بیوی کرن کارور کو برا حال تھا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر بار بار اپنے بیوہ ہو جانے اور اپنے دونوں بچوں کے یتیم ہو جانے کی بات دہرا رہی تھی۔ شا کر علی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ واضح نہیں ہو سکا کہ اس کا قتل ہتھیار سے کیا گیا ہے اس کے سر میں لگی دونوں گولیاں سر کے آر پار ہو گئیں تھیں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد شا کر علی کے جنازے کو پولیس لائن میں لایا گیا۔ جہاں پولیس افسران نے ٹمپکن ماحول میں اسے آخری سلامی دے کر اس کے گھر والوں کے سپرد کر دیا۔ گھر والوں نے اس کے جنازے کو اس کے آبائی گاؤں لے جا کر سپرد خاک کر دیا۔

دو تین دن بعد جب ماحول قدرے پرسکون ہوا تو پولیس نے کرن سے پوچھنا چھ کرنے کی کوشش کی۔

”ہم چاہتے ہیں کہ وردی پر ہاتھ ڈالنے والے جلد سے جلد سلاخوں کے پیچھے چلے جائیں۔ اس کے لیے پولیس پوری کوشش میں مصروف ہے۔ لیکن اس کام میں تمہیں بھی ہماری مدد کرنی ہوگی۔ دیکھئے شا کر علی کسی انجان آدمی کے ساتھ تو گیا نہیں ہوگا۔ اس کا کوئی با اعتماد ساتھی ہوگا۔ کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟“

”نہیں سر۔ میں تو گھر میں رہتی تھی اور اپنی باہر کی زندگی کے بارے میں وہ مجھ سے ذکر نہیں کرتے تھے۔“ کرن نے سکتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے بعد کرن نے رونا شروع کر دیا۔

پولیس ابھی اس سے مزید پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن ماحول کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ایسا نہیں ہو سکا۔ البتہ اتنی باتوں سے پولیس افسران کو اندازہ ہو گیا کہ کرن اتنی سیدھی نہیں ہے۔ جتنی سیدھی دکھائی دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں پولیس کا شک اس پر گہرا ہونے لگا۔ جب کرن شک کے دائرے میں آگئی تو پولیس نے اس کی کال ڈیٹیلز نکلوائیں۔ تو پولیس کو چونکا دینے والی بات کا علم ہوا۔ اس میں ایک نمبر ایسا تھا جس پر اس کا رابطہ مسلسل قائم رہتا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ قتل والی رات کو بھی اس نمبر پر کرن کی باتیں ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ وہ اپنے موبائل میں دوسم کارڈ استعمال کرتی تھی، دوسرے سم سے اس کی ایک ہی نمبر پر بات ہوتی تھی۔ جبکہ پہلی سم سے وہ شا کر و دوسرے لوگوں سے بات کرتی تھی۔ پولیس نے اس نمبر کا پتہ لگوا یا تو علم ہوا کہ وہ نمبر کسی لقمان ڈوگر نامی شخص کے نام پر ہے اور وہ لاہور میں رہتا ہے۔ لقمان چونکہ ڈوگر تھا اس لیے اس بات کی گنجائش ہی باقی نہیں تھی کہ وہ کرن کا کوئی رشتہ دار ہوگا۔ اس معلومات کے بعد کرن باقاعدہ طور پر شک کے دائرے میں آگئی۔ کسی بھی حادثے کے اثرات جودل کے اندر بہت ہی گہرائی میں ٹھہر جائیں اسے کسی کے ساتھ SHAER کرنا ممکن ہی نہیں۔ یہ اثرات دھیرے دھیرے خود ہی روپ بدلتے ہیں۔ لیکن ان کی چوٹ کا نشان کبھی روپ نہیں بدلتا۔ وہ ہمیشہ قائم و دائم رہتا ہے۔

کرن اسی دوران عدت میں بیٹھ چکی تھی۔ اس لیے پولیس اس سے پوچھنا چھ نہ کر سکی۔ لیکن کرن کی ماں عشرت جہاں سے پولیس نے پوچھنا چھ کی۔ کیونکہ کرن کا دوسرا اسم اسی کے نام سے تھا۔ عشرت جہاں پولیس لائن میں ہی ملازم تھی۔ اس لیے پولیس نے اس سے کئی طریقوں سے پوچھنا چھ کی تو کئی چونکا دینے والی باتیں سامنے آئیں۔ ادھر پولیس نے سراغ لگایا کہ لقمان ڈوگر نامی نوجوان کچھری میں ہاؤس کورٹ وکیل ہے۔ پولیس نے اس کی تلاش میں چھاپے مارے تو ہاتھ نہیں آیا۔ لیکن کرن کو پوچھنا چھ کے لیے حراست میں لے لیا۔ پوچھنا چھ میں کرن نے پولیس کو

ورغلا نے کی کوشش کی۔ مگر جب پولیس نے اپنا رنگ دکھایا تو وہ ٹوٹ گئی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپاتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں صاحب۔۔ میں نے ہی اپنے شوہر شاکر علی کا قتل کروایا ہے۔ میں ہی اس کی قاتلہ ہوں۔“

کرن سے پوچھتا چھ کے بعد پولیس نے لقمان ڈوگر کی تلاش مزید تیز کر دی۔ پوچھتا چھ کے بعد پولیس کے علم میں جلد ہی یہ بات بھی آ گئی کہ اس گناہ میں کرن کی ماں عشرت جہاں بھی برابر کی شریک تھی۔ یہ پتہ چلتے ہی پولیس نے اسے بھی گرفتار کر لیا اور دونوں ماں بیٹی کو عدالت میں پیش کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ لقمان ڈوگر کا بھائی پولیس میں تھا۔ وہ بھی سول لائن میں تعینات تھا۔ پوچھتا چھ میں اس نے بھی کئی سچ بیان کیے۔ جب لقمان ڈوگر پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تو پولیس نے اس پر پچاس ہزار روپے کا انعام مقرر کر دیا۔ آخر پولیس نے ایک اطلاع کی بنیاد پر لقمان ڈوگر کو بھی گرفتار کر لیا۔ پوچھتا چھ میں پولیس کو ایک خوبصورت چہرے والی تریاچر عورت اور اس کے عاشق کی روٹنے کھڑے کر دینے والی کہانی سامنے آئی۔

کرن عرف گڑیا پولیس لائن میں اپنی ماں عشرت جہاں کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ بچپن سے ہی تیز طرار تھی۔ لقمان ڈوگر بھی پولیس لائن میں اپنے بھائی کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ آبائی طور پر آلہ آباد کار رہنے والا تھا۔ کرن اور لقمان ڈوگر ایک ہی سکول میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ دونوں کے درمیان گہری دوستی تھی۔ بعد میں دونوں کے سکول تو بدل گئے لیکن تعلقات بعد میں بھی برقرار رہے۔ کرن خوبصورت تو تھی ہی اور خواہش پسند ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کو بھی زندہ دلی کے ساتھ جینے میں بھی یقین رکھتی تھی۔ وہ اپنی حالت پر غور کرتی تو کئی تخریبی داغوں کے باوجود انتہائی مضبوط پاتی تھی۔ اس لیے لقمان ڈوگر سے اس کی آنکھ لڑ گئی۔ لقمان ڈوگر تو پہلے ہی اس کا دیوانہ تھا اس لیے عشق چل نکلا۔ پھر یہ عشق کچھ اس طرح پروان چڑھا کہ انھوں نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھالیں۔ ایسی ہی تنہائی کی ملاقاتوں میں ایک دن دونوں نے ذات کی دیوار بھی گرا دی اور من کے ساتھ تن سے بھی ایک ہو گئے۔

ایک دن کرن کی ماں کو ان کے عشق کا پتہ چلا تو اس نے کرن کو سمجھایا اور اونچے نیچے کا واسطہ بھی دیا۔ لیکن کرن نے کسی طرح ماں کو سمجھا دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کرن اور لقمان ڈوگر کے درمیان پیار کا کھیل چل رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور سکوت کے عالم میں ٹھہرے ہوئے یہ لمحے ایک مکمل زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ کہ اسی درمیان کرن سے جلدی سے جلدی ملنے کا وعدہ کر کے لقمان ڈوگر پڑھائی کے لیے لاہور چلا گیا۔ یہ تقریباً پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ اسی دوران عشرت جہاں نے اپنی بیٹی کرن کا نکاح شاکر علی سے کر دیا۔ شاکر علی پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اس کے والد بھی پولیس میں رہ چکے تھے۔ کرن کی شادی ہو گئی۔ تو اس نے اسے قسمت کا کھیل سمجھ لیا اور لقمان ڈوگر کو بھلانے کی کوشش کرنے لگی۔ لقمان ڈوگر کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ لیکن وہ کربھی کیا سکتا تھا؟ ادھر کرن نے خود کو گڑہستی میں بدل تو لیا تھا لیکن وہ اپنے دل سے لقمان ڈوگر کو نہیں نکال سکتی تھی۔ وقت گذرتا رہا اور وہ دیکھتے دیکھتے شاکر علی کے دو بچوں کی ماں بن گئی۔ ادھر لقمان ڈوگر نے ایل ایل بی پاس کر کے ضلع پچھری ہاؤس کورٹ میں وکالت کرنی شروع کر دی تھی۔

یہ ایک سال پہلے کی بات ہے کہ فرید پور میں ایک شادی کے پروگرام میں اچانک کرن اور لقمان ڈوگر کی ملاقات ہو گئی۔ طویل عرصے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خوب باتیں کیں۔ اس کے بعد دونوں کے ایک دوسرے کے موبائل نمبر بھی لے لیے۔ کرن نے شاکر علی سے

لقمان ڈوگر کی ملاقات اپنا منہ بولا بھائی کہہ کر وائی اور یہ بھی بتایا کہ بچپن میں وہ دونوں ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ پھر اگلے دن سے ہی دونوں کے پیار کی داستان موبائل کے ذریعے پھر سے شروع ہو گئی۔ دل کی کبھی بات مان کر وہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے۔ ملنے کی بات ہوئی تو لقمان ڈوگر کرن سے پروگرام طے کر کے ایک دن سول لائن آگیا اور سیدھا کرن کے گھر پہنچا۔ اس وقت شا کر علی ڈیوٹی پر تھا۔ دونوں مدت کے بعد تنہائی میں ملے تو دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں سما گئے جذبات بھڑکے تو کرن نے شوہر سے بے وفائی کرتے ہوئے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کی۔ اس ملاقات کے بعد لقمان ڈوگر ہر مہینے کرن سے ملنے آنے لگا۔ لقمان ڈوگر کے گھر میں آنے کی بات شا کر علی کو معلوم ہو گئی تھی۔ لیکن وہ اسے کرن کا منہ بولا بھائی ہی سمجھ کر اس کی طرف سے آنکھیں بند کئے رہا۔ لقمان ڈوگر شاطر دماغ تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ کرن کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے کے خواب دیکھنے لگا۔ ایک دن اس نے اپنے دل کی یہ بات کرن کو بتادی۔ جب لقمان ڈوگر کی آمد و رفت کا سلسلہ زور پکڑنے لگا تو شا کر علی کو کرن اور اس کے تعلقات پر شک ہونے لگا۔ ایک دن اس نے دونوں کو تنہائی میں ملنے دیکھا تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد شا کر علی نے کرن کو حکم دے دیا کہ آئندہ وہ لقمان ڈوگر سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ جب ذہن پر خوف اور شک کے تاریک سائے چھا جائیں تو درختوں سے چھن کر آنے والی روشنی بھی گھات میں چھپے ہوئے آدمی بن کر دکھائی دیتی ہے۔ کرن ڈرامہ باز عورت تھی۔ اس نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے وعدہ کر لیا کہ اب وہ کبھی لقمان ڈوگر سے نہیں ملے گی۔ لیکن وہ اپنا وعدہ دنوں تک نہ نبھاسکی۔ ایک دن شا کر علی کو پتہ چلا کہ لقمان ڈوگر اب بھی کرن سے ملتا ہے۔ یہ جاننے کے بعد اس نے کرن کو دھمکی دے دی۔

”اگر تو نے اب بھی اس سے رشتہ رکھا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔“

اس نے اگلے دن ہی لقمان ڈوگر کو فون کر کے ساری باتیں بتا کر کہا۔

”لقمان میں ہر حال میں تمھاری ہونا چاہتی ہوں۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنے پیار کے لیے اپنے شوہر کو قربان کر دوں۔“

پھر لقمان ڈوگر خود بھی کرن کو پانے کے لیے بے تاب تھا۔ اس لیے کرن سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد اس نے شا کر کو راستہ سے ہٹانے کو فیصلہ کر لیا۔ خواہش پسند کرن کو امید تھی کہ شا کر علی کی موت کے بعد اسے پولیس کی نوکری مل جائے گی۔ اس نے سوچا تھا کہ شا کر علی کے بچوں کو اس کے دادا دادی کے پاس چھوڑ کر وہ آزاد ہو جائے گی۔ پھر لقمان ڈوگر کے ساتھ رہے گی۔ لقمان ڈوگر نے شا کر علی کے قتل کے اس منصوبے میں اپنے سگے بھائی ناصر کو بھی شامل کر کے ایک ریوالور کا انتظام کر لیا۔ منصوبہ بن جانے کے بعد ایک دن لقمان ڈوگر کرن کے پاس آ کر اسے نشہ کرنے والی سیال دوا دے گیا۔ شا کر علی کا قتل کرنے کے لیے رات کا ایک وقت طے کر لیا گیا۔ اس دن لقمان ڈوگر اپنے بھانجے خیام کو لے کر آیا، کار سے سول لائن پہنچا اور تنہا سول لائن کے باہر کھڑا ہو کر کرن کے فون کا نمبر استعمال کرنے لگا۔ کرن نے اپنی ماں عشرت جہاں کو ساری بات بتا کر اسے بھی منصوبے میں شامل کر لیا تھا اور اسے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ شا کر علی ڈیوٹی سے گھر پہنچا تو کرن نے کھانے میں نشیلی دوا ملا دی۔ کھانا کھانے کے بعد شا کر علی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی بیوی اس کے قتل کا جال بچھائے بیٹھی ہے۔ شا کر علی گہری نیند سو گیا تو کرن نے لقمان ڈوگر کو فون کر دیا۔ اس کی طرف سے اشارہ ملنے ہی وہ شا کر علی کے گھر پہنچا۔ وہاں چاروں نے مل کر شا کر علی کو کار میں بٹھا دیا۔ یہ سب کرتے ہوئے

انہوں نے ایک تکیہ بھی ساتھ لے لیا تھا۔ تاکہ کوئی دیکھے تو شاکر علی کو بیمار سمجھے۔ شاکر علی کو لے کر وہ لوگ بائی پاس پہنچے۔ اور اس کی کپٹی سے تکیہ لگا کر لقمان ڈوگر نے اس کے سر میں دو گولیاں مار کر اسے موت کی نیند سلا دیا۔

اس کے بعد لقمان ڈوگر گلاب نگر گیا۔ اور وہاں ایک رشتہ داری میں آرام کرنے کے بعد لاہور چلا گیا۔ ادھر منصوبے کے مطابق کرن نے پولیس کو بتایا کہ شاکر علی کچھ لوگوں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گیا تھا۔ اگلے دن اس نے شاکر علی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی تھی۔ شاکر علی کی لاش ملنے کے بعد کرن نے رونے کا خوب ڈرامہ بھی کیا تھا اور اس کی ماں عشرت جہاں بھی پولیس کو گمراہ کرتی رہی تھی۔ لیکن پولیس کے سامنے دونوں کی ایک نہ چل سکی۔ اور موبائل کی کال ڈیکلس سے ان کا راز فاش ہو گیا۔ ریمانڈ کی مدت میں پولیس نے لقمان ڈوگر کی نشاندہی پر قتل میں استعمال ریوالور، کارتوس، شاکر علی کا موبائل فون، خون آلود لقمان ڈوگر کی ٹی شرٹ اور تکیہ برآمد کر لیا۔ مفصل پوچھ تاچھ کے بعد اسے عدالت میں پیش کر کے جیل بھیجوا دیا گیا اور لقمان ڈوگر کا بھانجا خیام تادم تحریر بھی مفروضہ تھا۔

کرن کے ساتھ سخت مزاج کا لفظ لگانا ہی شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ سفید رنگ چہرے پر کالائل اور آواز کرخت تھی۔ اس دن کرن کالے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وارڈن کے پیچھے پیچھے آفس کی طرف جارہی تھی۔ شاید عدالت سے اس کے مقدمے کا کوئی حکم نامہ آیا تھا۔

”کرن چلتے وقت منہ کیوں چھپاتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”مار یہ عورت کو شرم و حیا رکھنی چاہئے۔ میری بے بسی قابل رحم ہے۔ میں جو کچھ محسوس کرتی ہوں وہ الفاظ کی شکل میں آکر اس کی حقیقت اور خوبصورتی نا تمام رہ جاتی ہے۔ اس وقت میں تنہا ہوں اور مجھ میں اتنی قدرت نہیں کہ میرے حلق سے پانی ٹپک سکے۔“ کرن نے جواب دیا۔

چھریرے بدن کی ایک اور عورت ساجدہ۔ میں بہت دنوں بعد اس کا نام جان پائی تھی۔ حالانکہ شکل سے اس کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔ وہ چوں سے گھس گھس کر سیل کی دیوار پر تحریک حقوق انسانی کے نعرے لکھا کرتی تھی۔ ہیڈ وارڈن چونے کی بالٹی اور دو قیدی مردوں کو ساتھ لے کر اس پر پونچھا پھینکنے آیا تھا۔ میں اکیلی تھی۔ اس لیے چپ چاپ کھڑے رہنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس شخص نے اونچی آواز میں کہا۔

”یہ سب کیا کرتی ہیں۔ ہماری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ سب کیوں لکھتی ہیں۔“ پھر پلکیں جھپکائے بغیر اس کے گلے کی آواز مدھم ہوتی چلی گئی۔ میں شکست خوردہ سی بے جان تصویر کی طرح کھڑی رہی۔ وہ غصے کی حالت میں بول رہا تھا۔ ”آزادی اظہار مقدس ہونے کی حد تک ضروری ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کوئی پہاڑی کو ہمارے کان پر بیٹھ کر کانیں کانیں کرنے لگے۔ یا کوئی باولا کتا ہمارے کان میں نتھنی ڈال کر بھوکنا شروع کر دے۔ آئندہ اس قسم کی کوئی تحریک دیوار پر نہ لکھی جائے۔“

انہی دنوں شازیہ نام کی ایک لڑکی اپنے بھائی حسنین کے ساتھ شبانہ کے قتل کے الزام میں گرفتار ہو کر جیل آئی تھی۔ بے رنگ بے خون ہونے کے باوجود گول چہرہ اور گائے جیسی کالی بھیجی پٹی آنکھیں تھیں۔ شازیہ کا جرم صرف یہ تھا کہ اس نے اپنے بھائی حسنین اور اس کی محبوبہ شبانہ کو پناہ دی تھی۔

شبانہ صدی مزاج لڑکی تھی۔ وہ 19 سال کی ہو گئی تھی۔ پھر بھی اس کی یہ عادت نہیں گئی تھی۔ اس کی ضد تھی کہ وہ شادی کرے گی تو حسنین سے ہی کرے گی۔ ورنہ زندگی بھر کنواری بیٹھی رہے گی۔ حسنین شبانہ کے گھر سے کچھ فاصلے پر واقع علی نگر میں رہتا تھا۔ باپ اور رنگ زیب نے شبانہ کو

بہت سمجھایا کہ وہ اپنا دھیان پڑھائی میں لگائے۔ گریجویشن کرنے کے بعد وہ کسی اچھے لڑکے سے اس کی شادی کر دیں گے۔ لیکن وہ اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ جوان بیٹی کوئی الٹا سیدھا قدم اٹھائے۔ اس لیے اورنگ زیب نے اس کی ساتھ سختی کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ وہ کوئی ٹیکی ٹواب کے لیے نہیں خوبصورتی سمجھ کر کرتا تھا۔ انھوں نے خدا اور رسول کا واسطہ دے کر شبانہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے اوپر تو پیار کا ایسا بھوت سوار ہوا تھا کہ باپ کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔

اورنگ زیب نے کئی بار حسنین کو بھی سمجھایا کہ وہ ان کی بیٹی کا پیچھا چھوڑ دے لیکن اس پر بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ آخر کار انھوں نے تھانہ علی نگر میں شکایت درج کروادی پولیس نے حسنین کو تھانے بلایا۔ حسنین نے پولیس کو بتایا کہ وہ شبانہ کو پریشان نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اور شبانہ ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اس کی بے باکی دیکھ کر پولیس بھی سمجھ گئی کہ معاملہ عشق کا ہے۔ پولیس نے شبانہ کو بھی تھانے میں طلب کر لیا۔ تو اس نے بھی صاف کہہ دیا کہ وہ حسنین سے پیار کرتی ہے۔ تھانے میں بیٹی کے اس طرح کہنے سے اورنگ زیب نے اپنی بے عزتی محسوس کی۔ کیونکہ انھوں نے حسنین پر چھیڑنے کا الزام عائد کیا تھا۔ بہر حال پولیس نے بھی شبانہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کسی کی بھی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اپنی زندگی وہ خود ڈیزائن کرنا چاہتی تھی۔ دکھ سکھ کے رنگوں سے بنا وہ آرٹ کا شاہکار بھی ہو سکتی تھی اور بے ترتیبی کا نمونہ بھی۔ پولیس نے اسے ڈانٹا پھنکارا۔ حسنین کو بھی خبردار کیا کہ وہ مستقبل میں شبانہ سے کوئی بات نہ کرے۔ پولیس کے خوف سے حسنین نے لکھ کر دے دیا کہ وہ شبانہ سے آئندہ نہیں ملے گا۔ تھانہ سے گھر لوٹنے کے بعد شبانہ کافی تناؤ میں تھی۔ اس کے دماغ میں یہی گھوم رہا تھا کہ اس کے پیار کے دشمن اس کے ماں باپ ہی ہیں۔ اس نے سوچا کہ جب اس کے عاشق سے ملنے ہی نہیں دیا جائے گا تو اس کا اس دنیا میں جینا بے کار ہے۔ اس لیے طیش میں آ کر اس نے پچھلے سے لٹک کر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن گھر والوں نے اسے بچا لیا۔ شبانہ کے اس اقدام نے گھر والوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

اورنگ زیب آبائی طور پر نشاط آباد کے رہنے والے تھے۔ اس لیے انھوں نے شبانہ کو کچھ دنوں کے لیے نشاط آباد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ وہاں جانے کے بعد وہ اپنے محبوب کو بھول جائے گی۔ تو کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کر دی جائے گی۔ شبانہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے فوراً حسنین سے رابطہ کر کے کہا۔

”حسینی جب ہم دونوں بالغ ہیں تو ہمیں اپنی مرضی سے شادی کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ میں تو لڑکی ہوں اس کے بعد بھی میں تھانے میں نہ تو اپنے گھر والوں سے ڈری اور نہ پولیس سے۔“

”اچھا اب یہ بتاؤ۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”جو پہلے تھا سواب بھی ہے۔“

”میرے مئی پاپا مجھے نشاط آباد بھیجنے کی تیاری کر رہے ہیں اس کے پیچھے نجانے ان کی کیا منشاء ہے۔ مگر میں نے منع کر دیا ہے۔“ شبانہ نے بتایا۔

”تیری آنکھوں میں کا جل میں اپنے ہاتھوں سے لگانا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں ایک کا جل دوں گا۔ جو میرا دوست مدینہ منورہ سے لایا تھا۔ اس کا جل کو تم ساتھ ہی رکھنا۔“

اگلے دن حسنین عرف حسنی نے اسے وہ کاجل دے دیا۔ جیسے اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ شبانہ اور حسنین کے پیار کی مہک آس پاس کے لوگوں کو بھی لگنے لگی تھی۔ اورنگ زیب کے سات بچوں میں سے 6 لڑکیاں تھیں۔ شبانہ کی وجہ سے دیگر لڑکیوں کی شادی میں پریشانی نہ آئے۔ اس لیے انھوں نے شبانہ کو نشاط آباد میں بھیج دیا۔ شبانہ وہاں سے بھی حسنین سے باتیں کرنا نہیں چھوڑیں۔ نفرت اور دھونس سے کسی کو اپنے جیسا تو بنایا جاسکتا ہے لیکن اپنا نہیں بنایا جاسکتا۔ اورنگ زیب اب اس کے لیے لڑکا تلاش کر رہے تھے۔ تھوڑی کوششوں کے بعد انھیں نشاط آباد کے ہی قصبہ ٹولودالا میں ارسلان نامی لڑکا مل گیا۔ جو شہر میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں نوکری کرتا تھا۔ اورنگ زیب یہ کام پوشیدہ طور پر کر رہے تھے تاکہ اس کا علم شبانہ کو نہ ہو سکے۔ شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ شادی کی تاریخ قریب آنے پر اورنگ زیب نے شبانہ کو اس کے ہونے والے شوہر ارسلان کی تصویر دکھائی۔ اپنی شادی کی بات سنتے ہی شبانہ آگ بگولہ ہو گئی اور صاف کہہ دیا کہ وہ حسنین کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی اور زبردستی شادی کرانے کی کوشش کی تو انجام ٹھیک نہیں ہوگا۔ شبانہ کو سبھی رشتہ داروں بڑے بزرگوں نے سمجھایا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ ادھر اورنگ زیب نے بھی طے کر لیا کہ کچھ بھی ہو وہ شبانہ کی شادی ارسلان سے ہی کریں گے۔ شادی کی تاریخ جوں جوں قریب آرہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے اس سلسلے میں حسنین سے بات کی تو اسے بھی دکھ ہوا۔ ان دنوں شبانہ کے حالات ہی ایسے تھے کہ وہ دعائیں کر کے تھک گئی اور شنوائی نہیں رہی تھی۔ آخر تک آکر اس نے گڑ گڑا کر اپنے خالق حقیقی کو پکارنا شروع کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ کوئی نورانی پروں والا فرشتہ اسے اس دلدل سے ضرور نکال دے گا۔

چونکہ شبانہ کے گھر سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور اس پر نظر بھی رکھی جا رہی تھی۔ اس کا موبائل فون بھی اورنگ زیب نے چھین لیا تھا۔ موقع ملتے ہی واپسی رشتہ دار سے موبائل لے کر حسنین سے بات کر لیتی تھی۔ کوٹ مومن میں ہونے کی وجہ سے حسنین بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے شبانہ سے کہا۔

”تم اس وقت چونکہ گھر والوں میں پھنسی ہوئی ہو۔ اس لیے تم ابھی شادی کر لو۔ بعد میں ہم تم کوئی نہ کوئی ترکیب نکالیں گے۔“

”حسنی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہاری ہونے والی بیوی کسی اور کی بانہوں میں جا کر اس کی ہم بستر بنے۔ یہ تمہیں اچھا لگے گا۔ میرے سارے وجود پر صرف تمہارا حق ہے۔ اس لیے تمہارے علاوہ کوئی دوسرا میرے جسم کو چھوئے یہ مجھے منظور نہیں۔ بات یقین و ایمان کی ہے۔ ڈوبتے ڈوبتے بیچ سمندر میں بھی کنارہ مل جاتا ہے۔ تم نے ارسلان سے شادی کرنے کی بات کیسے کہہ دی۔“ شبانہ بولی

”شبانہ! انسان کو مخالف حالات میں صبر سے کام لینا چاہئے۔ خوابوں کی تعبیر کو تکمیل تک پہنچانے میں میرا ساتھ دینے والا اور کوئی نہیں ہے۔ میں ہر قیمت پر تمہارا ہاتھ تھام لینا چاہتا ہوں۔ تم فکر مت کرو۔ میں بعد میں حالات سنبھال لوں گا۔“

شبانہ حسنین سے بے حد پیار کرتی تھی۔ اس کے سمجھانے کے باوجود بھی وہ شادی کی مخالفت کرتی رہی۔ شادی سے ایک دن قبل اس نے گھر میں فٹائل پی کر خودکشی کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ اس کی حالت بگڑی تو اسے فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔ کافی کوشش کے بعد ڈاکٹروں نے اسے بچا لیا۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی وہ اپنے محبوب حسنی سے شادی کرنے کی بات کہہ رہی تھی۔ اگلے دن بارات آئی تو آنا فانا شادی کی

رمیں ادا کرائی گئیں۔ شبانہ بے دلی سے انھیں پورا کرتی رہی تھی۔ جب آنکھوں میں کا جل لگانے کی بات آئی تو شبانہ نے وہی کا جل لگایا جو مدینہ منورہ سے لایا گیا تھا۔ شبانہ کو کچھ سکون ملا کہ کا جل ہے تو حسنی کے نام کا۔ شبانہ جب رخصت ہو کر سرال پہنچی تو سہاگ بیج اسے کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ ارسلان رات میں جیسے ہی اس کے قریب آ کر بیٹھا تو وہ تھوڑا اور پیچھے کھسک گئی۔ ارسلان نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا تو شبانہ کے چہرے پر پسینے سے تردیکھ کر حیران رہ گیا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ شبانہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

”ٹھیک ہے تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو آج ہم تمھیں پریشان نہیں کریں گے۔ تم اب لیٹ جاؤ۔“

اس کے بعد شبانہ نے کئی دنوں تک کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ارسلان سے خود کو بچائے رکھا۔ لیکن ایسا وہ کب تک کر سکتی تھی۔ آخر ایک دن ارسلان نے اسے اپنی مردانگی کا جو ہر دکھا ہی دیا۔ شبانہ نے بھی حالات سے سمجھوتا کر لیا۔

ایک دن صبح کے آس پاس کسی نے پولیس کنٹرول کوفون کے ذریعہ مطلع کیا کہ گارڈن پارک میں ایک لڑکی کی لاش پڑی ہے۔ یہ پارک سرانے کالے خاں بس اڈہ کے نزدیک ہے۔ اور تھانہ سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ تھانہ انچارج ندیم احمد، سب انسپکٹر دلشاد احمد اور دیگر اسٹاف موقع واردات پر پہنچ گئے۔ وہ لاش ریلوے اسٹیشن کے پاس واقع پارک میں چار دیواری کے پاس پڑی تھی۔ مقتولہ کی گردن کسی تیز دھار ہتھیار سے کاٹی گئی تھی۔ لڑکی گلابی رنگ کی ساڑھی پہنے تھی اور دلہن کے میک اپ میں تھی۔ اس کی عمر 21، 22 سال رہی ہوگی۔ موقع واردات پر خون بھی پڑا تھا۔ اور وہیں پر کڑھائی کی ہوئی کچھ مہنگی ساڑھیاں، شلوار قمیص کے ان سلے پیس، کا جل اور چوڑیاں وغیرہ بھی پڑی تھیں۔ وہاں موجود لوگوں سے مقامی پولیس نے شناخت کرانی چاہی۔ لیکن کوئی بھی اسے پہچان نہ سکا۔ تفتیشی ٹیم بھی موقع واردات پر پہنچ گئی۔ پھر لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی گئی اور معاملہ درج رجسٹرڈ کر لیا گیا۔ اے ایس پی فرحت اللہ بابر نے اس بلاسٹنڈ مرڈر کو سلجھانے کے لیے ڈی۔ پی۔ او شفقت شاہ کی ہدایت میں ایک پولیس ٹیم بنا دی اور مقتولہ کی شناخت کے لیے اس کے فوٹو چھاپ کر عوامی مقامات پر چسپاں کر دیے لیکن مقتولہ کی شناخت میں پولیس کو کامیابی نہیں ملی۔ ایک دن انسپکٹر ندیم احمد کے موبائل فون پر کسی شخص نے بات کی۔

”سر میرا نام اورنگ زیب ہے۔ کل میرے داماد فراز نے شالیمار بس اڈہ پر ایک بڑا سا ہوڑنگ لگا دیکھا تھا۔ اس پر جس لڑکی کی فوٹو چسپاں ہے۔ وہ ہماری بیٹی سے ملتا جلتا ہے۔ اپنے داماد کی بات سن کر میں آج شالیمار بس اڈہ پر لگے اس ہوڑنگ کو دیکھنے گیا۔ ہوڑنگ میں دکھائی گئی فوٹو میری بیٹی سے کافی میل کھاتی ہے۔“

”ہمیں لاش کے پاس اور کچھ سامان بھی پڑا ملا ہے۔ آپ فوراً تھانہ آ جائیں۔“

اورنگ زیب اپنے داماد فراز کے ساتھ تھانہ پہنچ گئے۔ اور انھوں نے انسپکٹر ندیم سے ملاقات کی تو انسپکٹر ندیم احمد نے انھیں لاش کے فوٹو گراف و دیگر سامان دکھایا۔ اورنگ زیب فوٹو دیکھتے ہی روتے ہوئے بولے۔

”صاحب یہ فوٹو میری بیٹی شبانہ کا ہے۔ وہ کئی دنوں سے نشاط آباد میں اپنے سرال سے غائب تھی۔ ہمیں شبانہ کے سرال والوں پر ہی

شک تھا۔ ہم نے ان کے خلاف فاروق آباد تھانہ میں رپورٹ بھی درج کر دادی تھی۔“

”لیکن سسرال والے شبانہ کو مارنے کے لیے اسے کوٹ مومن کیوں لائیں گے۔ اگر انھیں یہ کام کرنا ہوتا تو نشاط آباد ہی میں کر سکتے تھے۔“ انسپکٹر ندیم احمد نے کہا۔

”آپ برا مت مانئے میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ شبانہ کا شادی سے پہلے کسی اور سے کوئی چکر تو نہیں تھا۔“ اورنگ زیب نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

”صاحب علی نگر کے رہنے والے حسنین نامی ایک لڑکے سے وہ شادی کرنے کی ضد کر رہی تھی۔ یہ معاملہ تھانہ تک بھی پہنچا تھا۔ اس کے بعد ہم نے شبانہ کو نشاط آباد میں اس کی شادی کر دی تھی۔“

اورنگ زیب کے بیان کے بعد پولیس نے شبانہ کے موبائل فون کی کال ڈکلیس کھنگالی تو معلوم ہوا کہ وہ سب سے زیادہ باتیں اپنے محبوب حسنین سے ہی کرتی تھی۔ اس کے بعد انسپکٹر ندیم احمد اپنی ٹیم کے ہمراہ علی نگر واقع حسنین کے گھر پہنچ گئے۔ حسنین گھر پر ہی مل گیا۔ پولیس اسے پوچھتا چھ کے لیے تھانہ لے گئی۔ حسنین سے جب شبانہ کے قتل کے بارے میں پوچھتا چھ کی گئی تو اس نے چونک کر کہا۔

”سر شبانہ کا قتل ہو چکا ہے۔ اس کا علم مجھے ابھی ہو رہا ہے۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا کس نے کر دیا اس کا قتل؟“

”دیکھ حسنین! انسان کوئی چیز نہیں۔ اسے ایک نہ ایک دن اپنی تمام تر طاقت سمیت خاک ہو جانا ہوتا ہے۔ راکھ بن جانا ہوتا ہے یا پرندوں کی خوراک میں تبدیل ہو جاتا ہوتا ہے۔ انسان چلتا پھرتا مٹی کا ڈھیر ہے۔ کیڑوں، شعلوں اور پرندوں کی خوراک میں انتقام اور تکبر زیب نہیں دیتا۔ بے شک انسان خطا کا پتلا ہے اور کمزور بھی۔۔۔ اب تم ہم سے جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری شبانہ سے مسلسل باتیں ہو رہی تھیں۔ اس کا ہمارے پاس پختہ ثبوت ہے۔ دیکھ یہ تمہارے فون ہی کال ڈکلیس ہیں۔ تم اسے تو نہیں جھٹلا سکتے۔ زندگی میں ہر انسان سے غلطی ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ غصے میں آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے تم سے بھی یہی ہوا ہوگا۔ تم سچائی بتا دو۔“

پولیس کے اس نفسیاتی دباؤ کا فوری اثر یہ ہوا کہ حسنین ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”سر مجھے بچالو۔ میں نے ہی شبانہ کا قتل کیا ہے۔ اس نے میرے سامنے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اس کا قتل کرنے کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا۔“ اس کے بعد حسنین نے شبانہ کے قتل کی جو کہانی سنائی۔ وہ کافی حیرت میں ڈالنے والی تھی۔

ایک بار اورنگ زیب کے ہاتھ روم میں لگاٹل کا پائپ ٹی پوائنٹ والے جوڑے سے پھٹ گیا۔ اس سے کنبے کے لوگوں کو پانی کا مسئلہ بن گیا۔ وہ ایک ہارڈ ویئر کی دکان پر گئے تو اس نے حسنین کو پائپ ٹھیک کرنے بھیج دیا۔ حسنین علی نگر میں رہتا تھا۔ اور اس نے پلمبر ٹریڈ میں ڈپلومہ کر رکھا تھا۔ وہ بائیس سال کا ہٹا کٹا جوان تھا۔ جب وہ اورنگ زیب کے گھر گیا۔ تو گھر کا صدر دروازہ شبانہ ہی نے کھولا۔ اس وقت وہ بھی سترہ سال کی الہڑ جوان تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنا دل ہار گئے۔ باتوں ہی باتوں میں حسنین نے شبانہ سے اس کا نام پوچھ لیا۔ اور اس سکول کا نام بھی، جہاں وہ پڑھتی تھی۔ پھر اسے اپنا موبائل نمبر دیتے ہوئے کہا۔

”مستقبل میں جب بھی ضرورت ہو کال کر دینا۔ میں خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ اس کے بعد وہ شبانہ سے سکول میں آتے جاتے ملنے لگا۔ دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی۔ اس لیے دونوں نے خط کے ذریعے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ تاکہ وہ اس سے باتیں کر لیا کرے۔ دھیرے دھیرے یہ محبت جسمانی رشتوں تک پہنچ گئی۔ اور انھوں نے تا عمر ایک ساتھ رہنے کی قسمیں بھی کھالیں۔ عشق اور مشک کہیں نہیں چھپتے۔ کسی طرح اس کی بھگ اور نگ زیب کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ انھوں نے بیٹی کو سمجھایا۔ لیکن وہ ضد پر قائم رہی۔ کہ وہ شادی کرے گی تو صرف حسنین سے کرے گی۔ اس پر اسے نشاط آباد بھیج دیا گیا اور وہیں اس کی شادی کر دی گئی۔ لیکن شادی کے بعد بھی شبانہ کا حسنین نے رابطہ قائم رہا۔ جب وہ کوٹ مومن آئی تو حسنین سے ضرور ملتی۔ اور اس پر گھر سے بھاگ چلنے کا دباؤ ڈالتی تھی۔ وہ ارسلان کے ساتھ ہرگز نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک دن حسنین کو فون کر کے کہا۔

”حسینی! اب میرا اس گھر میں دم گھٹنے لگا ہے۔ میں آج ہی کوٹ مومن آرہی ہوں۔ اب میں ارسلان کے خلاف فیملی کورٹ میں طلاق کا دعویٰ دائر کر کے طلاق حاصل کر لوں گی۔ وہاں ہم شادی کر کے کہیں اور چلے جائیں گے۔“

حسنین نے اسے شادی کی یقین دہانی کرائی تو وہ نشاط آباد سے ٹرین پکڑ کر کوٹ مومن آ گئی۔ حسنین اسے کوٹ مومن سے غازی آباد میں مقیم اپنی بہن شازیہ کے گھر لے آیا۔ شبانہ بن سنور کرائی تھی اور اپنے ساتھ کچھ اچھے کپڑے بھی لے آئی تھی۔ شازیہ نے انھیں رہنے کے لیے ایک الگ کمرہ دے دیا۔ غازی آباد میں شازیہ کے گھر رہتے ہوئے انھیں کئی دن ہو گئے تھے۔ اوپر سے شبانہ حسنین پر شادی کے لیے دباؤ ڈال رہی تھی۔ شازیہ بھی اب بھائی کے سامنے شبانہ کے حق میں دلائل دے رہی تھی۔ جب اس محبت کا علم شازیہ کے خاوند کو ہوا۔ تو وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ پولیس کے کسی لفٹوے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اس لیے اس نے حسنین اور شبانہ سے کہہ دیا کہ وہ اپنے لیے کہیں اور ٹھکانہ ڈھونڈ لیں۔ غازی آباد سے وہ دونوں چلے آئے۔ شبانہ اپنی ایک سہیلی کے گھر اور حسنین اپنے گھر، حسنین چند دنوں بعد دوبارہ اپنی بہن شازیہ کے گھر چلا گیا۔ شبانہ کی شادی کرنے کے دباؤ سے حسنین پریشان تھا۔ وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور تعلقات عیش و عشرت تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ دل کی بات شازیہ کو بتادی تھی۔ اب وہ اس سے نجات پانے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

ایک دن شبانہ نے حسنین کو پھر فون کیا تو حسنین نے اسے دین پور کے ایک مقام پر اپنے ساتھ لائے ہوئے سامان کے ساتھ بلایا۔ شبانہ بہت خوش ہوئی کہ وہ اب حسنین سے شادی کرے گی۔ حسنین جب دین پور پہنچا تو شبانہ اپنے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک بیگ لیے وہاں پہلے سے موجود تھی۔ حسنین اسے وہاں سے سرائے کالے خاں کے پاس لے گیا۔ اور وہیں سے دونوں شمر پارک چلے گئے۔ اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ شبانہ اس دن بہت خوش تھی۔ لیکن حسنین رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ رات ہوتے ہی پارک کے گارڈ سبھی کو باہر نکال دیتے ہیں۔ رات نو بجے ان دونوں کو بھی باہر نکال دیا گیا۔ لیکن ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد وہ دونوں پارک کی ریلنگ پھاند کر پارک میں داخل ہو گئے۔ شبانہ اپنے ساتھ بیگ میں کپڑے لائی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کی قیمتی ساڑھی نکالی اور پہن کر نئی چوڑیاں بھی پہن لیں۔ اور وہی کا جل جو کبھی حسنین نے اسے دیا تھا۔ اپنی آنکھوں میں لگایا۔ حسنین نے کسی سہاگ رات کی طرح وہ رات بھی وہیں منائی۔ تھک کر جب شبانہ اس کی بانہوں پر لیٹی تو حسنین نے

اپنے ساتھ پہلے سے لایا ہوا پیپر کٹر نکالا اور نہایت بے رحمی سے اس کی گردن کاٹ دی۔ اس نے ایک گھراکٹ گردن کے پیچھے سے لگایا۔ اور شبانہ کچھ دیر تڑپنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئی۔

کئی پتنگ اور گھر سے بھاگی لڑکی کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ سبھی اسے لوٹنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ حسنین وہاں پر کوئی بھی ثبوت چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے شبانہ کے تینوں موبائل فون کے سوئچ آف کر کے اپنے پاس رکھ لیے اور بیگ کا دیگر سامان وہیں گرا کر اس کی پرسنل ڈائری، فوٹو گراف، برتھ ڈے کارڈ اپنے ساتھ لے کر رات ایک بجے کے قریب اپنی بہن شازیہ کے گھر چلا گیا۔ گردن کاٹنے وقت حسنین کی پینٹ پر خون لگ گیا تھا۔ موبائل فون اس نے شازیہ کو دے دیے اور خون آلودہ پینٹ کو چھپا کر رکھ دیا۔ پولیس نے حسنین اور شازیہ کے اقبال جرم کرنے کے بعد انھیں کورٹ میں پیش کر کے چند روزہ جسمانی ریمانڈ لے لیا۔ اور شازیہ کی نشاندہی پر اس کے گھر سے شبانہ کے تینوں موبائل فون، پرسنل ڈائری، خون آلودہ پینٹ وغیرہ برآمد کر لیے۔ جنھیں بعد میں عدالت نے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔ شبانہ اپنے کیے پر بہت پچھتاتی تھی اور بہت روتی تھی۔

وقت برا نہیں نکلتا تھا۔ اخبار بھی ملتا تھا وہاں کی لائبریری سے تاریخی کتابیں بھی پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔ گزشتہ ہزاروں برس میں کیا کیا کچھ نہیں لکھا گیا۔ انسان کے اندر چھپے ہوئے حیوان کو سنوارنے کے لیے کس کس نے کیا کچھ نہیں لکھا؟ انسان کے انسان ہونے کا امکان ہوتا تو الہامی کتابوں کے بعد بھلا کس تحریر کی ضرورت تھی؟ لیکن یہاں تو اقبال تک کو اعتراف کرنا پڑا کہ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

ایسے میں انسانی تحریریں اس عجلت اور علت سے کہاں تک برسرِ پیکار رہ سکتی ہیں۔ شہر تو شہر ہے یہاں تو نیویارک میں بجلی چلی جائے یا لندن میں انسانی فیوز اڑ جائے۔ تو اچھے بھلے انسانوں کے اندر سے حیوانوں کے غول درغول برآمد ہوتے ہیں۔ ہزاروں سال کی مسلسل مشقت کے بعد بھی انسان پر انسان کا صرف میک اپ ہی کیا جاسکتا ہے۔ غیض و غضب کی ایک بارش یہ میک اپ اتار دیتی ہے۔ تو انسانی چہروں کے اندر سے بھڑیے نکلتے ہیں اور بوری بند لاشوں کے بازار سج جاتے ہیں۔

کوٹ لکھپت جیل میں بہت سے سماجی کارکن رہ چکے ہیں۔ جن کا تعلق تحریک انسانی سے تھا۔ ادھر پس منظر میں ایک کچھڑی پک رہی تھی۔ جس کا احساس نہ ہونے پر بھی ایک حکم نامے سے آسمان کا بادل چھٹ گیا۔ جس میں لکھا تھا۔ یہاں سے ٹرانسفر ہو چکی ہے۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر تیار ہو جانا تھا۔ ویسے بھی تیار ہونے کے لیے رکھا ہی کیا تھا۔ لیکن ٹرانسفر کہاں کے لیے؟ ممکن میرے ہی شہر میں تو نہیں؟

میں چار ماہ بعد پھر اسی گیٹ سے نکلی۔ ہپانائٹس بی میں جتلا عظمیٰ کو پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ وہ گاتی تھی تو نور جہاں ہی لگتی تھی۔ گاؤں سے آئی ہوئی گورے چنے بدن کی مدیحہ اور اس کی دو سال کی بچی رمشا کو بھی خیر باد کہہ آئی تھی۔ جس نے مجھے گھر آنے کے لیے مدعو بھی کیا تھا۔ پھر کبھی دن کی کوئی خبر نہ ہوئی۔

چھوٹی چھوٹی بستیاں، میدان پھر سے دکھائی پڑنے لگے۔ یہ راستہ میرا جانا پہنچانا تھا۔ گاڑی فیروز پور روڈ سے گزر رہی تھی۔ گھر سے کالج

کے لیے یہی راستے سے جاتی تھی۔ ایک جانی پہچانی بس دکھائی دی میں بلند آواز سے گانے لگی۔ وہ گیت اب مجھے یاد نہیں، میرے جانے پہنچانے راستے کو چھوڑ کر گاڑی کسی انجانے راستے میں گھس گئی۔ کسی چیک پوسٹ پر گاڑی چند لمحوں کے لیے رکی تھی۔ پتہ نہیں گاڑی کہاں جا رہی تھی؟ ڈرائیور کی بغل میں بیٹھے پولیس افسر نے کہا تھا۔

”آپ بلا وجہ ہم پر ناراض ہو رہی ہیں۔ ہمیں ڈیس ٹینشن (منزل مقصود) بتانے کا حکم نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے چلتے جائیں اپنی مرضی سے۔ جہاں بھی جائیں گے وہاں انسان ہی تو رہتے ہوں گے۔ دکھ جھیلنے کے عادی لوگ۔“

ڈوبتے سورج کی روشنی میں ایک دریا کا ہیڈ برج کر اس کرتے ہوئے دیکھا کہ ایک آدمی جال کھینچ رہا تھا۔ بغل میں اس کی عورت ہاتھ میں ٹوکری لیے کھڑی تھی۔ سرمنداکا لاکھونا ایک بچہ کچھڑے سے کھیل رہا تھا۔ یہ تصویر اب تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ دوپہر سے شام تک گاڑی چلتی رہی۔ سردی لگ رہی تھی۔ میں آتے وقت اپنی چادر ثنا کو دے آئی تھی۔ شام کے اندھیرے میں گاڑی ایک گیٹ کے سامنے رکی۔ چاروں طرف پیڑوں کی وجہ سے گھٹا اندھیرا تھا۔ ڈھیری میں ڈیوٹی کرنے والے ہیڈ وارڈن نے ایک گندی گالی کے ساتھ تالا کھولا۔ میں آفس میں کافی دیر تک بیٹھی رہی۔ سامنے دیوار پر ایک بورڈ چسپاں تھا۔ جس پر سنٹر جیل ملتان لکھا تھا۔ صبح ہونے پر ایک لیڈی اہلکار آئی اور میری تلاشی لی۔ پھر اندر سے ایک اور لڑکی وارڈن کا ڈریس پہن کر نکلی۔ باہر کے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے اچانک ہی اُس کی جیب سے دو انڈے نیچے گر کر ٹوٹ گئے۔ گیٹ وارڈن پر بر محل رائے زنی کر کے ہستے ہستے لیڈی اہلکار مجھے ساتھ لے کر فیملی وارڈ کی طرف چل پڑی۔

سنٹرل جیل ملتان کے فیملی وارڈ میں آمدورفت کے لیے عام طور پر جس راستے کا استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ ایک بڑی کھڑکی تھی۔ سر جھکائے بناس کے اندر داخل نہیں ہوا جاسکتا تھا۔ جیل کے افسران کے آنے جانے کے لیے ایک الگ دروازے کا انتظام ضرور تھا۔ اس کھڑکی کے پار جا کر باغیچے کی ادھ بھگی گھاس اور سردی میں پیٹھ کے درد سے لاچار ہو کر بیٹھی رہی۔ میٹرن آفس سے معلوم کرنے گئی کہ مجھے کہاں رکھا جائے گا۔ میرے سامنے ایک بہت بڑا باغیچہ تھا۔ جس میں بڑے بڑے کھل کے پیڑ تھے۔ اور قریب ہی برآمدے میں سرخ رنگ کا ایک کمرہ تھا۔ باغیچے میں چند لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ جو دو دھیا سفید رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ فضا کھرے میں ڈوبی ہونے کی وجہ سے وہ سب دھندلی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں حیران ہو کر سوچتی رہی کہ ان میں سے کوئی بھی میرے پاس نہیں آ رہی۔ کچھ بھی تو نہیں پوچھ رہی۔ آخر کیوں؟ ایسا تو نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تو ایک طرح کی بداخلاقی ہے۔ کہ اچانک ایک ادھیڑ عمر کی اونچے دانٹوں والی دہلی پتلی عورت غصے میں بڑبڑاتی ہوئی میرے پاس آدھمکی۔

”خاموش کیوں بیٹھی ہو؟ یہ لو چائے۔“ اس نے مجھے چمکتے ہوئے گلاس میں گرم گرم چائے دی۔ پھر پھسپھسا کر کہا۔ ”تمہارے پاس آنے سے ہمیں منع کیا گیا تھا۔ اسی لیے نہیں بلایا تمہیں۔“

تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ عورت جیل منتظم کے ہاتھ کی جادوئی چھڑی ہے۔ اسی کے اشارے پر سزا یافتہ قیدی عورتیں اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ کورٹ کے ذریعے کسی قیدی کو جو سزا سنائی جاتی تھی۔ جیل حکام کو یہ حق ہوتا تھا۔ اسے کسی حد تک گڈ کنڈکٹ کی بنیاد پر کم کر سکتے ہیں۔ تقریباً نو سے دس بجے کے دوران ایک ڈپٹی جیلر آئے پاگلوں کو رکھنے والے سیل کو میرے لیے خالی کیا گیا تھا۔ شاید ڈپٹی جیلر صاحب خفیہ

کاغذات کی تفصیل کے ساتھ میری ٹھیک سے پہچان نہیں کر پار ہے تھے۔ نتیجے کے طور پر تھوڑا سا ہچکچائے ہوئے لگ رہے تھے۔ میرے پاس آ کر انھوں مجھے یہ تجویز دی کہ سلاخوں پر پردہ لگا دینے سے سردی کی شدت کم ہو سکتی ہے۔ اب سچ مچ مجھے غصہ آ گیا تھا۔ وارڈ کی دیوار میں دو دو ہاتھ کی دوری پر ایک ایک کھڑکی تھی۔ جو زمین سے کم از کم آٹھ فٹ اونچی ہوگی اور ان میں سے کسی میں بھی پردہ نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے سرد ہوا تیزی سے اس پار سے اس پار آ جا رہی تھی۔ وہاں قیدی لڑکیاں کھدر کے بنے ہوئے کپڑے پہنتی تھیں۔ کئی لڑکیوں کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ جو جاڑے کے مارے کھانس رہے تھے۔ آخر کار کافی تعداد میں پردے مگلوئے گئے اور سبھی کھڑکیوں پر پردہ ٹانگا گیا۔ چھ بائی آٹھ فٹ لمبی سیل کے سامنے برآمدے کا حصہ خالی تھا، اس کے سامنے بے حد اونچی سرخ رنگ کی دیوار تھی۔ سیل کے دروازے سے لگ کر بیٹھے اور سر جھکانے پر ایک کلزانیلا آسمان نظر آتا تھا۔ ہڈی اور پیٹھ کے درد نے بھی بغاوت شروع کر دی تھی۔

ایک دن ڈاکٹر نے چیک کر کے دوائی لکھ دی تھی۔ جس کا استعمال میں نے صبح شام کر دیا تھا۔ قدرے افاقہ ہو گیا تھا۔ دوائی اور کھانے پینے کی چیزیں مثلاً بسکٹ انڈہ اور بستر کی چادریں میٹرن سپلائی کیا کرتی تھی۔ میں بیماری کے دوران میں سوچ رہی تھی کہ وہ معاشرہ دوزخ سے زیادہ اذیت ناک، قیامت سے زیادہ بھیاںک اور اندھیرے سے زیادہ تاریک ہوتا ہے۔ جہاں عورت کی بے بسی اسے ایسی زندگی گزارنے پر مجبور کر دے۔ پہلے دن صبح کے وقت جس لڑکی نے مجھے چائے دی تھی اس کا نام آسیہ تھا۔ آسیہ اپنے خاوند عمر بیگ اور اپنے داماد مدثر علی کے ساتھ جیل میں تھی۔

آسیہ ایک نابالغ کا جبرایاہ کرانے کے الزام میں سزا یافتہ تھی۔ آسیہ کے خاوند کا نام عرفان اور اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ عرفان بسم اللہ انڈسٹری ایریا میں واقع ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ اسے شراب پینے کی عادت تھی۔ اس لیے اس کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ شراب میں بنے لگا۔ گھر میں بھلے ہی بیوی بچوں کی روٹی نہ ملے، مگر عرفان کو شراب ضرور چاہیے تھی۔ گھر کا ٹھنڈا چولہا اور بچوں کی بھوک آسیہ سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ جس کا کردار اجلا نہ ہو وہ خوبصورت لباس میں بھی نکسا لگتا ہے۔ شوہر کی طرف سے وہ مایوس ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے خود ہی کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شہر کی متعدد عورتیں فیکٹریوں میں کام کرنے جاتی تھیں۔ ان کے تعاون سے آسیہ کو بھی فیکٹری میں کام مل گیا۔ فیکٹری میں آسیہ کی عمر بیگ نامی کارگر کی ہیلپر مقرر کیا گیا تھا۔ غیر شادی شدہ عمر بیگ کی عمر ان دنوں 32 سال تھی۔ جبکہ آسیہ 35 سال کی رہی ہوگی۔ چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود آسیہ کا بدن شباب سے پُر تھا۔ چہرہ دلکش، جنسی کشش والا بدن اور چال متوالی۔ پہلے دن ہی سے عمر بیگ کا دھیان کام پر کم آسیہ کے شباب پر زیادہ رہنے لگا۔ اس نے اب تک اس لیے شادی نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کا شوقین تھا۔ پہلے ہی دن اس نے سوچ لیا تھا کہ آسیہ کو وہ اپنا بنا کے چھوڑے گا۔ دھیرے دھیرے عمر بیگ نے آسیہ سے ہنسی مذاق کرنا شروع کر دیا۔ ہنسی مذاق میں وہ ایسی باتیں کہہ دیتا کہ آسیہ بے چین ہو جاتی۔ بے چین ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا شوہر عرفان عمر میں اس سے بارہ برس بڑا تھا۔ اور شراب نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ پی کر آتا اور گھوڑے بیچ کر سو جاتا۔ جس طرف آغاز بہار میں چند دن آک کے پھولوں کا رس چرانے والا انڈا باقی سارا سال بھی آک کا انڈا ہی کہلاتا ہے۔ اسی طرح کسی ایک کردار سے ملنے والی بری شہرت بھی عمر بھر کی رسوائی کے لیے کافی ہوتی ہے۔ رات کے سناٹے میں آسیہ کو ٹیٹیں بدلتی رہ جاتی۔ لیکن اب عمر بیگ نے اس کے جذبات کو بھڑکانا شروع کیا تو وہ اس کی طرف کھینچتی چلی گئی۔ ایسی دوران عمر بیگ نے آسیہ کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ عرفان کو

اپنا بڑا بھائی مان کر اس نے دوستی بھی گانٹھ لی۔ اب وہ جب بھی آسیہ کے گھر آتا اس کے تھیلے میں ایسی مرغی اور ایسی شراب کی بوتل ضرور ہوتی۔ وہ عرفان کی کمزوری سے واقف ہو گیا تھا۔

ایک دن عرفان کے آتے ہی آسیہ مرغی پکانے بیٹھ گئی۔ عمر بیگ اور عرفان بوتل کھول کر پینے بیٹھ گئے۔ اس دن عمر بیگ اپنی دلی مراد پوری کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے چالاکی سے کام لیا۔ خود تو کم پی عرفان کو بھر بھر جام دیئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بوتل ختم ہوتے ہوتے عرفان مست ہو گیا۔ بہت مشکل سے اس نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور وہیں بیٹھے بیٹھے ڈھیر ہو گیا۔ عمر بیگ کی مدد سے آسیہ نے بستر پر لٹایا تو عمر بیگ نے اس سے کہا۔ ”میری حالت بھی گھر جانے والی نہیں ہے۔ اس لیے میرا بستر بھی کہیں لگا دو۔“ آسیہ نے کمرہ میں عمر بیگ کے لیے بھی چار پائی بچھا دی۔ اور خود چاروں بچوں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ کھانے کے بعد اس نے چاروں بچوں کو کمرے میں سونے بھیج دیا۔ اور جی بچھا کر خود سونے کے لیے تخت پر لیٹ گئی۔ کمرے میں عرفان کے خزانے گونج رہے تھے۔ اندھیرا ہوتے ہی عمر بیگ کچھ دیر دم سادھے لیٹا رہا جب اسے یقین ہو گیا کہ چاروں بچے سو گئے ہیں تب وہ دبے پاؤں چار پائی سے اتر اور آسیہ کے تخت پر پہنچ گیا۔ ساری رات وہ آسیہ کے بھرے بھرے جسم سے کھلتا رہا۔ صبح ہونے کو آئی تو عمر بیگ آسیہ کے پہلو سے اٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس رات کے بعد اکثر دونوں کا ملن ہونے لگا۔ عمر بیگ عرفان کو شراب پلا کر مدہوش کر دیتا۔ اس طرح آسیہ کے جسم سے اپنی تسکین حاصل کرتا رہتا۔ آسیہ بھی اس کی مردانگی پر فدا ہو گئی تھی۔ لیکن بہت جلد شہر میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اور ہوتے ہوتے یہ بات عرفان کے کانوں تک پہنچ گئی۔ وہ شرابی سہی لیکن تھا تو مرد اور کوئی مرد یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ اس کی بیوی کسی دوسرے مرد کی آگ سے اپنا بدن سینکے۔

ایک شام عمر بیگ مرغ شراب لے کر آیا۔ تو عرفان چوکنہ ہو گیا۔ اس نے پی تو خوب مگر اپنا دماغ کھلا رکھا۔ اور بے سدھ ہونے کی اداکاری کر کے جہاں کا یہاں ڈھیر ہو گیا۔ عمر بیگ اور آسیہ نے معمول کے مطابق اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ اور خود اپنی رنگینیوں میں کھو گئے۔ عرفان کچھ دیر تک پڑا رہا پھر ایک دم اٹھ کر اس نے جی جلا دی۔ دونوں بڑا کرکڑے پہننے لگے۔ عرفان دونوں کو زور زور سے گالیاں دینے لگا تو آسیہ بولی۔

”خاموش ہو جاؤ، پڑوسی سن لیں گے۔“

”اچھا ہے پڑوسیوں کو بھی تو معلوم ہو کہ تو نے یار رکھا ہوا ہے۔ ناک کس کی کئے گی تمہاری ہی نا۔“

”کوئی عورت یار باز بھی بنتی ہے جب اس کا شوہر کسی کام کا نہیں رہتا۔ لوگ تمہیں ہی نامزد کہیں گے۔ چھپکلی کا وجود کراہت اور نفرت کا مظہر ہوتا ہے مگر تم جیسے انسانوں کا وجود اس سے بھی کہیں زیادہ مکروہ اور نفرت انگیز ہوتا ہے کہ جس سے معاشرہ میں تعفن اور تکدر پھیلتا ہے اگر تم اپنی عزت بچائے رکھنا چاہتے ہو تو خاموش رہو اور جیسا چل رہا ہے چلنے دو۔“ آسیہ نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

عرفان نے گالی دیتے ہوئے آسیہ کو مارنے کیلئے ہاتھ اٹھایا تو عمر بیگ نے ہوا میں ہی اس کا ہاتھ روک لیا۔

”خبردار آسیہ پر ہاتھ اٹھایا تو ہاتھ توڑ دوں گا۔“

عرفان سنائے میں رہ گیا بولا۔

”آسیہ سے ایسا ہی لگاؤ ہے تو لے جاؤ اپنے ساتھ رکھ لو، میں طلاق دیتا ہوں اس کمینہ کو۔“

”میں خود عمر بیگ کے گھر بسنے کا سوچ رہی تھی۔ اچھا ہوا جو تم نے طلاق کا کہہ دیا۔“

”ہاں ہاں چلی جا اپنا یہ منحوس منہ لے کر اور کبھی مجھے چہرہ مت دکھانا میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔“ عرفان دھاڑا تھا۔

آسیہ نے اپنے یار عمر بیگ کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے نکل گئی۔ جھگڑے کی آواز سے چاروں بچے جاگ گئے تھے اور ماں باپ کو ٹکڑ ٹکڑ دیکھ رہے

تھے۔ آسیہ نے انکی بھی پرواہ نہیں کی اور اپنے نئے راستے پر چلی گئی۔ عمر بیگ بسم اللہ علاقے کے محلہ اسلام پورہ میں ہی رہتا تھا۔ وہ آسیہ کو اپنے گھر لے

گیا اور دونوں میاں بیوی کی طرح رہنے لگے۔ عرفان نے بھی یار بازیوی کو طلاق دے دی۔

آسیہ کی چھوٹی بیٹی فائزہ ان دنوں آٹھ سال کی تھی۔ فرصت کے اوقات میں آسیہ کو فائزہ کی بہت یاد آتی تھی۔ اسلئے ایک دن وہ چپکے سے

اپنے سابقہ گھر گئی اور فائزہ کو ساتھ لے آئی۔ عرفان نے اس معاملے کو بھی نظر انداز کر دیا۔ وہ نہ تو فائزہ کو آسیہ سے واپس لینے آیا اور نہ کوئی بات کی۔

وقت گزرتا گیا دھیرے دھیرے آٹھ سال گزر گئے۔ فائزہ سولہواں سال پورا کر کے سترھویں سال میں پہنچ گئی تھی۔ ہر جوان بیٹی اپنی ماں سے زیادہ

حسین ہوتی ہے۔ فائزہ عمر بیگ کو پاپا کہتی تھی اور عمر بیگ کی زبان بھی اسے بیٹی بیٹی کہتے نہیں سوتھتی تھی لیکن؟

اب انہیں باپ بیٹی کو آسیہ سخت فحاشی کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ آسیہ سے جتنی گالیاں دی گئیں اس نے دونوں کو دیں۔ کچھ دیر تک وہ

آسیہ کی زہر بھی باتیں سنتے رہے۔ اسکے بعد عمر بیگ بے حیائی سے بولا۔

”فائزہ میری سگی بیٹی تھوڑی ہے۔ باہر جا کر کسی اور سے منہ کالا کراتی اس سے اچھا ہے کہ میں نے گھر میں ہی اسکی ضرورت پوری کر دی۔“

”واہ رے کل یگی باپ بہت اچھی دلیل دی تو نے، اگر دنیا کے سارے باپ یہی سوچنے لگیں تو وقت سے پہلے ہی دنیا زمین میں سا

جائے۔“ آسیہ نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ ”تم سے تو میں بعد میں پنپوں گی پہلے اس کلمونہی کو دیکھ لوں جسے باپ سے چار پائی ملاتے ہوئے شرم نہیں

آتی۔“ یہ کہتے ہوئے فائزہ کے بال پکڑے اور اسے پیٹتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہاں پہلے اسے مارا پیٹا، اسکے بعد سوال کیا ”ہاں منہ چلی یہ

سب کیسے ہوا اور کب سے چل رہا ہے یہ چکر؟“

فائزہ کے پاس جھوٹ بولنے کو کچھ تھا ہی نہیں اسلئے اس نے سچ بول کر پورا واقعہ بیان کر دیا۔ گھر کا جیسا ماحول ہوتا ہے ویسا ہی اثر بچوں پر

پڑتا ہے۔ بچپن سے فائزہ دیکھ رہی تھی کہ ماں بن بیا ہے عمر بیگ کیساتھ رہ رہی ہے اور اپنی رنگینیوں کی وجہ سے اپنا گھر چھوڑا ہے۔ بس فائزہ کے دل

میں یہ جاننے کا تجسس پیدا ہو گیا کہ عورت کے جسم میں ایسی کونسی لذت چھپی ہے جسے پانے کیلئے وہ اپنے شوہر اور بچوں تک کو چھوڑ سکتی ہے۔ فائزہ

جب جوان ہوئی تو آسیہ کو کچھ دنوں کیلئے میکے جانا پڑا۔ عمر بیگ کو کھانے کی کوئی تکلیف نہ ہوا اسلئے وہ فائزہ کو اسکے پاس چھوڑ گئی۔ بس اسی رات باپ

شیطان بن گیا اور فائزہ نے بھی جان لیا کہ وہ کونسی لذت ہے جو مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا ہوتی ہے۔ ادھر چار بچوں کی ماں سے عمر بیگ آٹھ

سال میں بور ہو چکا تھا اور جوانی سے لدی پھدی فائزہ اسے لبھانے لگی تھی۔ فائزہ کے حسن و جمال کا اس پر ایسا نشہ سوار ہوا کہ وہ یہ بھول گیا کہ اسنے

اسے بیٹی کی مانند پالا ہے اور وہ اسے پاپا کہتی ہے۔ بس اس دن کے بعد عمر بیگ اور فائزہ کی یہ پاپا لیا شروع ہو گئی۔ تقریباً چھ ماہ سے یہ سلسلہ جاری رہا راز تب کھلا جب چار پائی کی آواز سے آسیہ کی آنکھ کھلی تھی۔ آسیہ اس گھر میں ہو رہے اس کھیل کو روکنا چاہتی تھی لیکن عمر بیگ موقع ملتے ہی اپنی من مانی کر ہی لیتا تھا۔ آسیہ مخالفت کرتی رہی تو عمر بیگ اسے مارتا پھینتا اور گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دینے لگتا۔ اس عمر میں آسیہ کہاں جاتی اسلئے اس نے خاموش سمجھوتہ کر لیا اور عمر بیگ نے اسکی بیٹی پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس مسئلے کے حل کیلئے آسیہ کو ایک ہی راستہ دکھائی دے رہا تھا کہ جو اور جیسا درملے اس سے فائزہ کی شادی کر دی جائے لیکن عمر بیگ نہیں چاہتا تھا کہ فائزہ کی شادی ہو مگر آسیہ کی ضد کے آگے اسکی ایک نہ چلی۔ لیکن ایک مورچہ پر مات کھانے والا عمر بیگ کم استاد نہیں تھا۔ اس نے فائزہ کیلئے دلہا تلاش بھی کیا تو پینتالیس سال کا ادھیڑ عمر۔۔۔

دراصل اس کا خیال تھا کہ ادھیڑ عمر شوہر سے ناخوش ہو کر کچھ دنوں میں ہی فائزہ گھر لوٹ آئے گی اور اسکی بانہوں میں پھر سما جائے گی۔ کچھ دنوں بعد فائزہ کی شادی مدثر سے ہو گئی۔ رخصتی کے بعد وہ فائزہ کو بلہور میں واقع اپنے گھر لے گیا۔ دونوں نے سہاگ رات منائی تو فائزہ کو مدثر علی پسند نہیں آیا۔ عمر بیگ کی بات الگ تھی۔ وہ موج مستی کا معاملہ تھا۔ یہ زندگی بھر کا سوال تھا۔ فائزہ شوہر سے فاصلہ بنا کر رکھنا چاہتی تھی۔ اپنی اس منشا میں وہ کامیاب نہیں ہو سکی۔ مدثر علی نے فائزہ کا جسم تو جیت لیا مگر دل نہیں جیت سکا۔

فائزہ دوسرے ہی دن سے میکے جانے کی ضد کرنے لگی۔ اسلئے مدثر علی نے اسے کمرے میں بند کر دیا۔ تین ماہ تک فائزہ قید میں رہی اور مدثر علی اس کے ساتھ روز بدتمیزی سے پیش آتا رہا۔ ایک صبح فائزہ کو موقع ملا تو وہ مدثر علی کی قید توڑ کر بھاگ نکلی۔ اب تک فائزہ کی سمجھ میں ساری سازش آچکی تھی کہ کیوں اسکے سوتیلے باپ نے اسکی شادی ایک ادھیڑ عمر شخص سے کی تھی اور کیوں ماں اسے اپنے گھر سے نکالنا چاہتی تھی۔ فائزہ تین عیاشیوں کے جال میں پھنس گئی تھی۔ اسلئے اس نے سوچ لیا کہ نہ اسکی ماں اسکی ہمدرد ہے اور نہ سوتیلے باپ عمر بیگ اسلئے فائزہ بلہور سے خان پور تو آئی مگر ماں کے پاس نہ جا کر اپنے اصلی باپ عرفان کے پاس جا پہنچی اور رو کر اپنی بربادی کی پوری داستان بیان کر دی۔ یہ سن کر عرفان کا خون کھول اٹھا۔ اسی وقت وہ فائزہ کو لے کر تھانہ گیا اور تھانہ انچارج علی حیدر کو پوری کہانی سنادی۔ انہوں نے فائزہ کے بیان کی بنیاد پر عمر بیگ، آسیہ اور مدثر علی کے خلاف ابتدائی رپورٹ نوٹ کر لی۔ آسیہ کے خلاف صرف نابالغ کا جبر ایہاہ کرانے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ عمر بیگ، آسیہ اور مدثر کو اسی دن گرفتار کر لیا گیا۔ بعد از چالان یہ تینوں ملزمان سزائے قید میں ہیں۔ جیل میں آسیہ کیساتھ اسکی چار سال کی گول مٹول سدرہ بھی آئی تھی۔ جس دن سے ہائی کورٹ سے آسیہ کی اپیل نامنظور کئے جانے کی خبر آئی تھی اس دن سے اسے پاگل پن کا دورہ بھی پڑنے لگا تھا۔ کئی دنوں سے آسیہ نے نہ تو کسی سے بات کی اور نہ نہائی اور نہ ہی کچھ کھایا۔ تیسرے روز رات کو پھر دیوانگی طاری ہو گئی۔

گیٹ سے سیل کی چابی لا کر کھولنے میں چالیس منٹ کا وقت لگا، اسی دوران آسیہ نے ننھی سدرہ کو اٹھا کر زمین پر چک دیا تھا، آخر کار دروازہ کھلا تو صائمہ بھابھی اور تین لوگوں کیساتھ میں بھی دوڑ کر وہاں پہنچی۔ آسیہ دورے میں چلا رہی تھی آؤ میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گی اسکے کھلے بال اور بے لباس بدن دیکھ کر ہراس پیدا ہوا جا رہا تھا۔ اسلئے سبھی لڑکیاں سیل کے ایک کونے میں شپٹا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اب وہ بھی دھیرے دھیرے آگے آگئی تھیں۔ ان سب نے کسی طرح پیچھے سے دوپٹہ ڈال کر آسیہ کو پکڑ لیا۔ سدرہ زمین پر لکڑی کی طرح زمین پر پڑی تھی لیکن تب بھی اسکے

گلے سے رہ رہ کر ایک گڑگڑاہٹ کی آواز آرہی تھی۔ اتنی دیر میں جیلر اپنا ایونگ سوٹ بدلے بنا ہی چلے آئے۔ آتے ہی انہوں نے یہ جاننا چاہا کہ کسی کو چوٹ دوٹ تو نہیں لگی۔ سدرہ کے سر ٹانگ میں شدید چوٹ آئی تھی۔ وہ زندگی اور موت سے کھیل رہی تھی انہوں نے یہ بھی بتایا کہ سدرہ کی لاش لیجانے کیلئے ایسولنس کو خبر کر دی گئی ہے۔

جیل کے اندر کسی غیر فطری موت ہونے کی صورت میں پولیس کیس ہوتا ہے اور میں پولیس کے سامنے پیش ہو کر گواہی دوں گی یا کہ نہیں۔ دونوں صورتوں میں انہوں نے مجھ سے رائے لی تھی۔ اس رات کی بھی صبح ہوئی وہ ایک رُمس بھری صبح تھی۔ کھٹل کے پتے چپ سادھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے آکر آسیہ کیلئے لارا کا کٹل انجیکشن لکھ دیا۔ اسکی بھیا نک چلا ہٹ اب تک سنائی پڑ رہی تھی۔ میٹرن سرخ لیکریل کے برآمدے تک گئی۔ پھر تیزی سے واپس بھاگ آئی۔ آسیہ نے کہا کہ اسے بھی جان سے مار دے گی۔ بشری کمر میں کپڑا کس کر میٹرن کو دلا سہ دیتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اسکے ہاتھ میں ایک موٹی لاٹھی تھی۔ اب آسیہ کے ہاتھ پاؤں سوکھی لکڑی کی طرح دبے پتلے تھے۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”کیا آپ مجھے انجیکشن دینے کی اجازت دیں گے؟“

تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔

”کوشش کیجئے۔“

دوسرے لوگوں کو ساتھ لیجانے سے روکتے ہوئے میں اکیلی ہی سیل میں گھس گئی۔ بشری تالا کھول کر درہٹ گئی۔ گھٹنوں تک قمیض پہنے ہوئے آسیہ دونوں ہاتھوں سے سلاخوں کو پکڑ کے گیٹ پر چڑھ کر کھڑی تھی۔ وہ ایک بچی کی طرح لگ رہی تھی اور اب چپ ہو گئی تھی۔ اسکا بدن آگ کی طرح تپ رہا تھا میں اسکے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے بولی۔

”آسیہ میں تمہیں دوائی دوں گی۔ تجھے سیل سے نکال دیا باہر؟ یہاں آنے کیلئے نکالا ہے تم لیٹ جاؤ تمہیں انجیکشن لگانا ہے۔ میں وہ وقت بھی نہیں بھول پاؤں گی، جس عجیب کام کو دیکھنے سے ہی شرم آتی تھی۔“

انجیکشن لگنے کے بعد آسیہ پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی آج بھی میں ٹھیک سے یاد نہیں کر پا رہی کہ میرے ہاتھ میں کیا تیز رفتاری تھی۔ بھاری دروازے کا پٹ تیزی سے بند ہونے سے سلاخوں سے جا ٹکرایا۔ آدھ گھنٹہ پہلے آسیہ کی خوفناک حالت تھی۔ ایک عجیب ہنسی ہنستی ہوئی مجھ سے بولی۔

”تم نے میرا سر ٹھونک دیا ماریہ۔“ اسکی دکھ بھری ہنسی آج بھی مجھے قصور وار ٹھہرا رہی ہے اس دن سدرہ مرتے مرتے فوج گئی۔ چھ مہینے کے بعد چلنے پھرنے کی قوت کھو کر وہ ہسپتال سے واپس لوٹی تھی کیونکہ کوئی بھی پاگل پن کا شکار پاگل پن کی حالت میں ہمیشہ نہیں رہتا۔ تقریباً دس دن بعد جب اس نے سنا کہ اسکی بیٹی زندہ ہے تو یقین اور گمان کی تیز دھوپ اسکے چہرے پر کھل اٹھی تھی کیونکہ اور خطرہ نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔ اسلئے اب آسیہ کو دن بھر چین کے سہارے امرود کے پیڑ کے نیچے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ سدرہ کے لوٹ آنے کے دو دن بعد میں اسے گود میں لئے ایسی جگہ جا کھڑی ہوئی جہاں سے آسیہ اسے دیکھ سکے۔ ماں کو دیکھتے ہی سدرہ ڈر گئی اور ڈر کر مجھ سے لپٹ گئی۔ آسیہ کے چہرے پر پھر وہی عجیب سی ہنسی ابھرائی تھی۔

”میں تمہاری ماں ہوں سدرہ، آؤ میرے پاس آؤ۔“

سر کے پچھلے حصہ میں چوٹ لگنے سے سدرہ دھیرے دھیرے مرگی کے مرض میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اچانک بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو جاتی تھی۔ میڈیکل چیک اپ ہونے کے بعد سپریم کورٹ میں اپیل پر پاگل ثابت ہونے پر آسیہ کی سزا معاف ہو گئی تھی۔ اب کوئی بھی شخص ضمانت پر رہا کر کے اسے لیجا سکتا تھا۔ جھنگ ڈسٹرکٹ جیل میں جس طرح ایک ہسپتال اور بڑے بڑے سیل ہیں، سینٹرل جیل ملتان میں ویسا نہیں تھا۔ وارڈ ایک لمبے بیرک کی طرح تھا۔ وہاں دو بڑے ہال جنہیں وہاں نمبر کہا جاتا تھا۔ اسکے بیچ کی دیوار کے سامنے کے برآمدے کو بھی بانٹ دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ دیوار نیچے تک آتی ہوئی باغیچے کو بھی دو حصوں میں بانٹ گئی تھی۔ باغیچے کے درمیان سے اس دیوار میں ایک دروازہ تھا جو سبز رنگ سے رنگا تھا۔ اسکی چابی وارڈن کی کمر میں رہتی تھی۔ اسکے علاوہ وارڈ کی ایک طرف سے دوسری طرف جانے کا کوئی الگ راستہ بھی نہیں تھا۔ حالانکہ دونوں وارڈن کا نام حاجتی نمبر اور میعاد ہی نمبر تھا لیکن دونوں میں ہی سزا یافتہ لڑکیاں رہتی تھیں۔ حاجتی تو صرف تھوڑی سی تھیں جو ملتان کے گرد و نواح سے آئی ہوئی تھیں جنکی تعداد کبھی بھی آٹھ سے زیادہ نہیں ہوئی تھی جس سیل کیساتھ ہسپتال تھا اسکا نام میعاد ہی نمبر تھا۔ میعاد ہی نمبر کی طرح باغیچے کے بیچوں بیچ ایک سرخ رنگ کی جھونپڑی تھی۔ اسکے نیچے گہرے کالے رنگ کے تین چولہے تھے۔ صبح ایک بوری چٹا لڑکیوں کے سیل میں آتا تھا بڑی بڑی کڑا ہی میں ان چٹوں کو بھون کر اور انہیں چکی میں پیس کر اس کا ستونکا لایا جاتا تھا۔ شام کا کھانا بھیجنے سے پہلے ہی وارڈن آ کر اس ستونکا وزن کر کے لے جاتے تھے۔ اس بھونا کھنٹی کو لڑکیاں بہت پسند کرتی تھیں۔ اس مشقت پر سزائیں رعایت کی جاتی تھی اگر دن بھر آگ میں تپ کر کچھ دنوں کی سزائیں کرا کے جلدی گھر جایا جاسکے تو پھر اس تپش سے کوئی عورت پیچھے ہٹ سکتی تھی۔ وہاں اس سے بھی بڑی سہولت یہ تھی کہ بچوں کے ہاتھ ایک دو مٹھی بھنے چنے دے سکتی تھیں۔ چنے کے وزن کیساتھ ستونکا وزن کرتے وقت کوئی بھی سختی نہیں برتا تھا۔

اقراء اخترا نام کی ایک بیس سالہ لڑکی صاحب کی انسپیکشن فائل میں شکایت درج کرانے لگی تھی کہ کھانا پیٹ بھر کے نہیں ملتا، کھانا چوری ہو جاتا ہے۔ پہلے سے موجود قیدی لڑکیوں نے بتایا تھا کہ شکایت تو معمولی ہی تھی لیکن سرغنہ بن کر بات کرنے کے جرم میں اقراء کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے دن بھر باغیچے کی کڑی دھوپ میں چھوڑ دیا گیا تھا، سینٹرل جیل ملتان کی لڑکیوں کے سیل میں پاگل پن کا دورہ پڑنے والی قیدی لڑکیوں کی تعداد پانچ تھی۔ سرائیکی علاقے سے آئی ہوئی بشری انکی دیکھ بھال کرتی تھی۔ بشری اپنے خاوند ہارون، بیٹے واحد اور اپنی بہو فاطمہ کیساتھ اپنی بیٹی پروین کے قتل کے جرم میں قید میں تھی۔ سفید رنگ، گھٹیلاتھل تھل بدن، فیشن ایبل کپڑے، سر کے بیچوں بیچ ایک جوڑا، کسے ہوئے جڑے، تقریباً ساٹھ برس کی بشری کا چہرہ مہرہ کافی حد تک دیکھنے کے لائق تھا۔ بشری کی بیٹی پروین نے گھر سے بھاگ کر طاہر نامی شخص سے محبت کی شادی کر لی تھی۔ ایک دن یادوں کا سلسلہ شروع ہوا تو بشری کو ایک ایک چیز ایک ایک بات یاد آنے لگی اور ساتھ ہی اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب پھوٹ پڑا۔ اسکے آنسوؤں نے طاہر کا سینہ بھگو دیا۔ طاہر نے پیار سے اس کا سینہ سہلایا۔

”رورہی ہو پگی۔ اب ساری دشواریوں کے باوجود ہمارے پیار نے منزل تو پالی نا۔ میں جانتا ہوں تمہیں اپنوں کی یاد آ رہی ہوگی انکی مار یاد آ رہی ہوگی تو ان کا پیار بھی یاد آ رہا ہوگا۔ مجھے بھی چچی بہت یاد آ رہی ہے انہوں نے مجھے ماں سے زیادہ پیار دیا ہے مگر میں ایسا بد نصیب ہوں کہ انہیں دیکھنے بھی نہیں جاسکتا۔“ طاہر نے ایک گہری سانس لی پھر بولا ”چلو پروین وہ نیم کا پیڑ وہ گلیاں اور چوبارے پھر سے دیکھ آئیں۔ اسی بہانے چچی کو

بھی دیکھ لیں گے ہمیں آپس میں ملانے میں انکا بھی بہت تعاون رہا تھا۔“

”سو کھے پھولوں کی طرح دھندلی دھندلی خوشبو کی طرح کچھ چہرے سالہا سال تک آنکھوں میں بے رہتے ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے طاہر یہ راستہ کس قدر پیچیدہ ہے جس کے ایک موڑ پر بے یقینی کی دیز دھند میں ہم دونوں ایک ساتھ کھڑے ہیں۔ جب ہم گھر سے بھاگے تھے تو میرے گھر والوں نے کتنا ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ وہ مجھے معاف نہیں کر پائیں گے۔ ہمیں وہاں دیکھیں گے تو نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔ میرے ابو کے سر پر کہیں خون ہی سوار نہ ہو جائے۔“

”وقت بہت بڑا کارساز ہے۔ پروین اس کا گھاؤ بھی وقت نے بھر دیا ہوگا۔ لوگ بھول گئے ہونگے کہ کوئی طاہر اور پروین ان گلیوں کے لیلیٰ مجنوں تھے۔ اب تو ہمارا ایک بیٹا بھی ہو گیا ہے۔ تمہاری گود میں وہ نواسے کو دیکھیں گے تو انکے دل میں بھی پیارا اٹھ آئے گا ہمارے لئے۔“

نہیں طاہر نہیں“ پروین نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیا۔ ”میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ تم میرے ابو اور بھائی کو نہیں جانتے۔ میری بے بسی قابلِ رحم ہے۔ جو کچھ محسوس کرتی ہوں الفاظ کی شکل میں آکر اسکی حقیقت اور خوبصورتی ناتمام رہ جاتی ہے۔“ طاہر خاموشی سے پروین کی باتیں سنتا رہا۔

پروین غازیہ آباد کے کالونی علاقے ربال پارک میں رہنے والے ہارون کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پروین کے علاوہ اس کا ایک بیٹا بھی تھا جسکا نام واحد تھا۔ واحد کی شادی فاطمہ نامی لڑکی سے ہوئی تھی۔ ہارون لکڑی کا کاروبار کرتا تھا جسے ہارون اور واحد ملکر دیکھتے تھے۔ ہارون کی بیوی کا نام بشری تھا۔ ہارون کے مکان کے سامنے ہی شوکت علی کی بیوی فاطمہ رہتی تھی۔ جب شوکت علی زندہ تھے تب وہ اپنے بڑے بھائی زاہد علی کیساتھ مصطفیٰ آباد میں رہا کرتے تھے۔ انکی موت ہوئی تو فاطمہ مصطفیٰ آباد چھوڑ کر رائے ونڈ آ گئے۔ یہاں وہ ربال پارک آ کر رہنے لگی۔ وہیں انہوں نے اپنی گذر بسر کیلئے ذریعہ بھی بنالیا تھا۔ کاریںٹر کا کام کرنے والا طاہر فاطمہ کا بھتیجا تھا۔ وہ چچی سے ملنے اکثر کالونی آتا رہتا تھا۔ یہیں پروین اور طاہر کا عشق پروان چڑھا۔

اس روز جب آدمی رات کے وقت پروین اور طاہر بستر پر پڑے پڑے اپنے پیار کی پرانی یادوں میں کھوئے ہوئے تھے تو پروین کو اپنے ماں باپ اور بھائی بھابی کی یاد آ رہی تھی اس نے اپنی ماں بشری کی سخت مزاحی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

”کہنے کو تو وہ میری ماں ہے لیکن جب وہ غصے میں ہوتی تھیں تو کسی کی بھی نہیں سنتی تھیں۔ ایک بار جب تم نے مجھے چپکے سے خط دیا تھا تو انہوں نے مجھے خط لیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں وہ خط لیکر چھت پر چلی گئی تھی اور کونے میں بیٹھ کر پڑھنے لگی تھی۔ اسی دوران وہ دبے پاؤں اوپر آ گئیں انہیں دیکھتے ہی میری روح کانپ گئی۔ میں نے وہ خط موڑ مار کر جھٹ سے اپنے منہ میں رکھ لیا اور اسے نگل گئی۔ امی کو شک ہو گیا تھا۔ وہ میرے گالوں پر گھونٹے مارنے لگیں اور پیچھے پڑ گئیں کہ نکال وہ کاغذ جو ابھی پڑھ رہی تھی۔ انہوں نے اس روز مجھے بہت مارا تھا۔“ پروین نے جھرجھری لی۔ ”اسی لئے تو مجھے یقین نہیں ہوتا کہ ان کا دل بدل گیا ہوگا۔“

”ماں کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو لیکن بیٹی بیٹے کیلئے جب اس کا دل پیچتا ہے تو وہ پانی پانی ہو جاتی ہے اور پھر اگر مانگنے والے کو ڈھنگ سے

مانگنا آجائے تو دینے والا اسے مانگنے سے پہلے ہی دینے کیلئے بے چین ہوتا ہے۔“ طاہر نے اپنی دلیل دی۔
 ”وہ مانیں دوسری ہوتی ہوگی طاہر۔ تم انہیں نہیں جانتے۔“
 طاہر نے گہری سانس لی اور بولا۔

”ابھی پچھلے دنوں اصغر ماموں چچی کے گھر گئے تھے بتا رہے تھے کہ وہ مجھے یاد کر کے زار و قطار رو رہی تھی۔ پوچھ رہیں تھیں طاہر کیسا ہے کہاں تو وہ ہماری خبر لینے ہر ہفتے آیا کرتا تھا مجھے کوئی دکھ تکلیف ہوتی تو وہ اپنا سارا کام چھوڑ کر رانیونڈ میں ہی پڑا رہتا تھا اور اب دو سال میں اتنی دور ہو گیا ہے کہ اس کو دیکھنے کو ہی آنکھیں ترس گئی ہیں۔ وہ میری زندگی پر رحم نہیں کھا سکتے تو میری موت پر کیا افسوس کریں گے۔ کہہ رہی تھیں کہ کبھی ابھی اس سے میری فون پر باتیں ہو جاتی ہیں تو میرا گلہ بھر جاتا ہے منہ سے الفاظ نہیں نکلتے اسے دیکھنے کو بڑا دل چاہتا ہے۔“
 چچی کی بات چلی تو طاہر بھی رو ہانسا ہو گیا۔ پروین نے اسے سمجھایا۔

”طاہر ہمیں اپنی محبت زندہ رکھنے کیلئے اپنوں کو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ چچی کو دیکھنے کیلئے میرا بھی بہت دل کرتا ہے وہ مجھے اپنی بیٹی کی طرح مانتی تھیں مگر کیا کروں ہمارے رشتوں پر نفرت کا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔“

”تم یونہی گھبرا رہی ہو پروین، میرا دل کہتا ہے کہ کچھ نہیں ہوگا۔ دو سال میں دنیا بہت بدل گئی ہے دیکھنا تمہارے گھر والوں کا دل بھی بدل گیا ہوا۔ اگر انہوں نے ہمیں قبول کر لیا تو ہماری محبت کی یہ بہت بڑی جیت ہوگی نہ قبول تو کوئی بات نہیں۔ ہمیں وہ کھا تو نہیں جائیں گے۔ کوئے بھی ڈپ اکبر بناتے ہوئے جارہے ہوتے ہیں۔ ایک جو سب سے پیچھے ہوتا ہے قطب ستارہ ہوتا ہے کہ بازی ہار گیا ہوتا ہے۔ ہمت تو نہیں ہارا ہوتا۔“
 ”دیکھ لو طاہر، جب تمہارے خلاف میرے اغوا کا مقدمہ درج ہو گیا تھا اور میں نے ابو کے لاکھ سمجھانے پر بھی کورٹ میں سرعام یہ کہا میں طاہر سے پیار کرتی ہوں اور اس سے میں نے شادی کر لی ہے تو ابو کے چہرے پر جو نفرت تھی وہ روح فنا کر دینے والی تھی۔“ پروین نے اندیشہ طاہر کیا تو طاہر نے کہا۔

چھوڑو یہ باتیں۔ ماں باپ کی نفرت پلک جھپکتے ہی محبت میں بدل جاتی ہے۔ رات کے دو بجے ہیں اب سو جاؤ۔ صبح ہم دونوں کو رانیونڈ چلنا ہوگا۔“ پروین کے دماغ میں اندیشوں اور شبہات کے بادل منڈلانے لگے اس نے پوچھا
 ”اکیلے صرف ہم دونوں۔ میرا چھوٹا بھائی اور ماموں اصغر بھی ساتھ چلیں گے۔“
 ”میں نے ان دونوں کو بھی وہاں چلنے کیلئے کہہ دیا ہے۔ سب ساتھ ہو گئے تو پھر کس بات کا خوف؟“ طاہر بولا۔

پھر طاہر تو کچھ دیر بعد سو گیا لیکن پروین کے دل میں اندیشوں کے طوفان چلتے رہے۔ اسی طرح وہ رات کئی صبح ہوئی تو طاہر کا بھائی اور ماموں طاہر کے گھر آ گئے۔ اگلی صبح وہ چاروں الہ آباد سے رانیونڈ کیلئے روانہ ہوئے۔ رانیونڈ بس اڈے سے وہ رکشہ لیکر فاطمہ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد آٹو سے اتر کر وہ لوگ پیدل ہی چلنے لگے۔ طاہر، فاطمہ کے گھر کے قریب ایک ریڑھی والے سے پھل خریدنے لگا تب تک وہ پروین اصغر اور طاہر کے بھائی کیساتھ اپنی گلی میں آ گئی۔ جہاں اسکا گھر تھا۔ میسے کی گلی آئی تو پروین نے بھیگی آنکھوں سے اپنے گھر کو

دیکھا۔ اتفاق سے اسی وقت ہارون نے بھی اپنی بیٹی پروین کو دیکھ لیا اور گھر کے اندر چلا گیا اور بیٹے واحد کو انتقام کیلئے اکسانے لگا۔ پھر ہارون نے لوہے کا ایک راڈ اٹھایا تو واحد نے بھی چاقو اٹھالیا۔ وہ دونوں آگے بڑھے تو گھر کی دو عورتیں ہاتھ میں ڈنڈے لئے انکے پیچھے روانہ ہو گئیں۔

اس دوران پروین، فاطمہ کے گھر پہنچ گئی تھی۔ طاہر کا بھائی اور ماموں بھی ساتھ تھے۔ وہ فاطمہ سے رسی باتیں کر رہی تھے کہ تبھی آندھی کی طرح اندر آ کر ہارون اور واحد پروین پر ٹوٹ پڑے۔ ہارون اس پر لوہے کے راڈ سے وار کرنے لگا تو واحد چاقو سے۔ انکے ساتھ آئی خواتین بھی پیچھے نہیں رہیں۔ وہ اسے ڈنڈے سے مارنے لگیں۔ فاطمہ اصغر اور طاہر کا بھائی ششدر تھے وہ پروین کو بچا نہیں سکے۔ وہ صرف چیخ چلا رہے تھے۔ طاہر ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا۔ شور و غل سن کر جب تک وہ چچی کے گھر پہنچا پروین کے گھر والے اسے موت کی گھاٹ اتار چکے تھے۔ طاہر کئے درخت کی مانند پروین کی لاش پر گر کر رونے لگا۔ پولیس کو اطلاع دی گئی تھانہ انچارج ناصر رانا فوراً فورس سمیت موقع پر پہنچ گیا۔

ہارون کا گھر فاطمہ کے گھر کے سامنے ہی تھا۔ رانا نے پروین کو قتل کرنے والے اسکے باپ ہارون، اسکی ماں بشری، بھابی فاطمہ اور واحد کو گرفتار کر لیا۔ پولیس نے لاش کا شیخ نامہ بھرا اور اسے پوسٹ مارٹم کیلئے بھجوا دیا۔ گرفتار شدہ ملزمان سے پوچھ تاچھ کی گئی تو انہوں نے پروین کے قتل کا جرم قبول کر لیا۔ بعد از ریماڈ پولیس نے ملزمان کو عدالت میں پیش کیا جہاں سے انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ اب بشری اور ہارون کے دلوں سے نفرت کا زہر ضرور نکل گیا ہوگا لیکن یہ کتنے بد نصیب ماں باپ تھے۔ بیٹی کا گھر بسا کر اسے خوشیاں دینے کی بجائے انہوں نے بیٹی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اپنے لئے جیل کی چار دیواری چن لی۔ بشری اور اس کے کنبہ کو بیٹی کے قتل کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔ اب جیلر نے اس کی ڈیوٹی قیدی لڑکیوں پر لگائی ہوئی تھی۔ ان میں بہت سی ہوشمند ہونے کے باوجود نیم پاگل سی تھیں۔ اسلئے ان قیدی لڑکیوں کو صاف ستھرا کرنے کیلئے اسے ایک موٹا سا ڈنڈا ملا ہوا تھا۔ کبھی قیدی لڑکیاں بشری سے بہت خوفزدہ تھیں۔ اس کام میں وہ بہت تیز ہو گئی تھی کہ نیم پاگل ہی نہیں بلکہ وہ کبھی کو بخوبی مرمت کر سکتی تھی جو نیم پاگل نہیں تھیں اکثر اسے غرور کیساتھ بڑبڑاتے جاتے ہوئے دیکھتی تھی۔

”میرا نام بشری ہے۔ میں ہڈی پرایسا ماروں گی کہ باپ کا نام تک بھول جائے گی۔“

چہرہ اور مزاج دونوں سے بشری کا خوفناک دبدبہ ہے۔ ایک وجہ اور بھی تھی کہ جیل حکام اسے مٹھی میں رکھنا چاہتے تھے کیونکہ قید کے دوران کوئی اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے تو اسے میڈیکل چیک اپ کے بعد اسے پاگل قرار دے دیا جاتا تھا اور یوں عدالت میں اپیل کے بعد اسکی رہائی عمل میں آ جاتی تھی۔ جیل قانون کے تحت انکی دیکھ بھال کیلئے کچھ مزید سامان سیل میں آتا تھا جیسے چاول، دودھ، چینی وغیرہ۔ کسی پاگل کی بات کا کیا بھروسہ ابھی کہیں گے کھا لیا فوراً کہیں گے نہیں کھایا۔

باہر کا سیاسی ماحول گرم ہونے کے ساتھ ساتھ میرے سیل کا دروازہ بھی چوبیس گھنٹوں کیلئے بند ہو گیا۔ نہانے وغیرہ کیلئے پندرہ منٹ باہر رہنے کی اجازت ہوتی تھی جسے میں نے اپنی ہی وجہ سے کھو دیا۔ بشری کی کڑی نگرانی میں ایک لڑکی میرے نہانے کیلئے ایک بالٹی پانی لا کر میری سلاخوں کے سامنے چھوڑ جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صرف ایک نظر ایک دوسرے کو دیکھنے کے سوائے اور کوئی بات کرنے کا سوال ہی نہ اٹھتا۔ سلاخوں کے اس پار سے گلاس سے پانی لیکر نہایا جاسکتا تھا۔ پانی نکالنے کی نالی سیل کے اس سرے پر تھی اس لئے فرش پر رکھا ہوا کبل کپڑے اور کتاب وغیرہ

بالکل بھیگ جاتے تھے۔ اسے اٹھا کر سکھانے میں ہی کافی وقت درکار ہوتا تھا۔ سلاخوں کی اڑھائی انچ کی چوڑائی سے باہر رکھی تھالی میں سے بھات، اندر رکھی ہوئی تھالی میں سبزی ڈالنے کیلئے انگلیوں میں جس مہارت کی ضرورت ہوتی تھی وہ نہ ہونے کی وجہ سے انعم کے ہاتھ سے پانی کا گلاس زمین پر گر گیا اور وہ نا سمجھ لڑکی وارڈن کے سامنے ہی یہ کہتے ہوئے زار و قطار رونے لگی کہ تم ماریہ کو اس طرح کھانا کیوں دیتے ہیں۔ گائے نیل کو بھی تو لوگ چارہ ڈالتے وقت کھول دیتے ہیں۔ میں اسے کیسے سمجھا سکتی تھی کہ میں حقوق انسانی کی پاسداری کیلئے قید میں ہوں۔ میرا جرم یہ تھا کہ میں نے حقوق انسانی کی آواز بلند کی تھی اور آج ہم آزادی اظہار کے شعبے میں دنیا کے خطرناک ترین ملکوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ آزادی اظہار کیلئے ہمارے سینکڑوں کارکنوں کو قتل کیا گیا۔ قتل، اغوا برائے تاوان کے علاوہ اظہار کی آزادی کے خلاف کچھ اور بھی کارروائیاں ہیں۔ اس نتیجے میں شام کو انعم کا آنا بند ہو گیا تھا کھانا اب وارڈن کے ذریعے آنا شروع ہو گیا تھا تو میں نے اس کے ہاتھ سے کھانا لینے سے انکار کر دیا۔ تھوڑی زبردستی کرنے پر بشریٰ کو برآمدے میں بکھرے ہوئے دال چاول صاف کرنے پڑے تھے۔ دو دن تک کھانا واپس لوٹا دینے پر سیل کی سلاخیں آٹھ انچ چوڑا کر دی گئیں اور کھانے کی تھالی اندر دینے کا انتظام کیا گیا۔ تقریباً دس دن بعد انعم پھر آنے لگی تھی۔ انار جیسی انعم کا قد درمیانہ اور عمر تقریباً پانچس سال تھی۔

انعم جلال پور کے ایک بڑے زمیندار چوہدری ابوبکر کی بیٹی تھی۔ اس کے پاس کئی مربع زر خیز زمین تھی۔ کنبے میں بیوی مریم کے علاوہ اکلوتا بیٹا عمر علی اور چار بیٹیاں تنزیلہ، رباب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ وہیں پاکیزہ اعلیٰ تعلیم کیلئے انگلینڈ چلی گئی تھی۔ انعم جو چھوٹی ہونے کی وجہ سے گھر بھر کی لاڈلی تھی اس وجہ سے وہ کچھ ضدی بھی ہو گئی تھی۔ بیٹا عمر علی بھی تعلیم کیلئے آسٹریلیا جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ لاڈلی بیٹی انعم کو فلمیں دیکھنے کا شوق لگ گیا تھا اور وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ رومانی فلمیں اسے کافی پسند تھیں اور وہ خود کو بھی فلمی ہیروئن سمجھنے لگی تھی۔ وہ گھر سے باہر نکلتی تو ایسی بن سنور کر کہ دیکھنے والوں کے دلوں پر چھریاں چل جائیں۔ بناؤ سنگھار کرنا، ناچنا گانا اور گنگنا تے رہنا جیسے اس کی عادت بن گئی تھی۔ انعم کو اپنی آنکھوں کے سچ ہونے کا انتظار تھا اور اسے انتظار تھا اپنے سپنوں کے شہزادہ کا۔ انتظار ہی نہیں انعم کو یقین تھا کہ اس کی زندگی میں رانجھا جیسا دکھائی دینے والا کوئی شہزادہ ضرور آئے گا۔ وہ گنگنا تے سردیوں کے دن تھے اور صبح کا وقت۔ کالج کو دیر ہو جانے کی وجہ سے انعم سائیکل تیزی سے چلا رہی تھی، کھرے کے سبب انعم کو سامنے سے آرہی موٹر سائیکل دکھائی نہیں دی۔ موٹر سائیکل ایک دم تیزی سے نزدیک آئی تو گھبرا کر انعم تو ازن کھو بیٹھی اور اسکی سائیکل موٹر سائیکل سے ٹکرائی۔ انعم کیساتھ سائیکل پر اسکی سہیلی شبینہ خان بھی بیٹھی تھی۔ انعم کیساتھ شبینہ خان دونوں نیچے گر پڑیں۔ موٹر سائیکل سوار نوجوان نے اگر بر وقت بریک نہ لگائے ہوتے تو انعم اور شبینہ خان کو گہری چوٹیں آسکتی تھیں۔ نوجوان نے موٹر سائیکل روک کر دونوں لڑکیوں کو اٹھایا اور انعم سے پوچھا ”آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟“ انعم کی آنکھیں نوجوان کی آنکھوں سے چار ہوئیں تو اسے دیکھتی رہ گئی اور وہ چہرہ جسکا انعم کو انتظار تھا، یوں اچانک سامنے آ جائے گا۔ اسے اس کی خبر نہ تھی۔ انعم کا سائیکل سے گرنا اور کپڑے گندے ہونا اور سکول کیلئے دیر ہونا، سب کچھ بھول گئی اور بت بنی نوجوان کو دیکھتی گئی۔ انعم کی مسکراتی اور بھاری آنکھوں اور گورے مکھڑے سے نوجوان کی نظریں بھی جیسے چپک کر رہ گئی تھیں۔ اتنا حسین چہرہ نوجوان نے بھی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہار ہو یا برسات یہ موسم کی اپنی روئیدگی ہے۔ نمو کیلئے نمی کافی نہیں ارادہ بھی ضروری ہوتا ہے جو محبت کی گود میں جنم لیتا ہے سکون کی گود میں پرورش پاتا ہے۔ شبینہ خان ان دونوں کو نہ ٹوکتی تو گھنٹوں یونہی ایک دوجے کا دیدار کرتے رہتے۔ انعم اپنے کپڑے جھاڑتی ہوئی

سکول تو چلی گئی لیکن اس کے دل کی دنیا اس حادثہ کے بعد رنگین لمحات کیلئے بالکل بدل گئی تھی۔ سکول ٹیچر ہو یا کتابیں انعم کو ہر جگہ اسی نوجوان کا چہرہ دکھائی دیتا۔ جب بے قراری زیادہ بڑھنے لگی تو وہ شبینہ خان کو الزام دینے لگی کہ اس کی وجہ سے وہ نہ تو نوجوان کا نام جان سکی اور نہ اس کا اتا پتہ۔ لیکن انعم کو یہ علم نہیں تھا کہ اس نوجوان کو بھی اسی طرح کی بے قراری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں پچھلے روز حادثہ ہوا تھا، انعم کو اسی جگہ کھڑا ہوا وہ نوجوان مل گیا۔ اس کی موٹر سائیکل پاس ہی کھڑی تھی اور وہ جائے حادثہ کو حسرت بھری نظروں سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ انعم کی آنکھیں اس نوجوان کو دیکھ کر مسکرا دیں اور وہ اس کے نزدیک سے گزر گئی۔ دونوں کے درمیان جھجک کے سبب کئی بات چیت نہیں ہوئی لیکن دونوں ہی ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ گئے تھے۔ دواجنبی نظریں ایک دوسرے کو بوسہ دیتے ہوئے گزر گئی تھیں۔ کچھ دن آنکھوں آنکھوں میں یہ محبت پروان چڑھتی رہی لیکن پیار کی اس کہانی کو آگے بڑھانے کو دونوں ہی بے قرار تھے۔ لہذا ایک دن نوجوان نے انعم کو روک کر خود ہی اپنا تعارف کروا دیا۔

”مجھے علی رحمن کہتے ہیں۔ گاؤں جیو والا میں رہتا ہوں۔“

”پھر؟“ انعم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور بولی ”مجھے انعم کہتے ہیں اور میں گاؤں پونیا میں رہتی ہوں۔ مطلب بیان کرو اپنا۔“

علیٰ رحمٰن مسکرایا اور پھر حوصلے کیساتھ کہا

”مطلب کہ بات یہ ہے کہ جی۔۔۔ میں تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔ جس دن سے تمہیں دیکھا ہے دل و دماغ پر جانے کونسا نشہ چھا گیا ہے کہ ہر طرف مجھے تم ہی تم دکھائی دیتی ہو کیا تمہیں میرا پیار قبول ہے؟“

”تم تو مجھ سے یوں پوچھ رہے ہو جیسے مجھ سے نکاح قبول کروا رہے ہو۔ سمجھدار لوگوں کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دی۔ جاتے جاتے اس نے پلٹ کر یہ ضرور کہا کل پھر مجھے اس وقت یہیں ملنا۔ علی رحمٰن خوشی سے جھوم اٹھا۔ انعم کا اشارہ وہ سمجھ گیا تھا۔ اس روز کے بعد علی رحمٰن اور انعم کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

محبت میں دیوانی ہوئی انعم اکثر سکول جانے کے بہانے محبوب کیساتھ گھومنے پھرنے نکل جاتی لیکن انکے پیار میں چاہت کم اور حوس کا جذبہ زیادہ تھا۔ یہ عمر کا اثر تھا۔ وہ جب بھی ایک دوسرے کے قریب آتے اپنا صبر و قرار کھو بیٹھتے تھے۔ دھیرے دھیرے انکا یہ تعلق جسمانی زیادہ اور روحانی کم ہو گیا۔ دونوں ہی جنسی ہوس کی آگ میں سر سے پاؤں تک جل رہے تھے اور جب یہ آگ ناقابل برداشت ہو گئی تو انعم نے حوصلہ دکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ رعنائی اس کی ذات کی اوٹ میں چھپ چکی تھی پھر بھی دور ایک چمکیلی دھند آہستہ آہستہ برستی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ نظر جھکاتی تو دل کے کنارے ایک بستی آباد پاتی۔۔۔۔۔ مہنا طیبی بام و در شوق کے رنگ، آرزوؤں کا ہجوم، بے خودی اور وہ۔ انعم نے ملنے کیلئے علی رحمن کو ایک انوکھا راستہ سمجھایا۔

دراصل انعم کا مکان پونیا گاؤں کے آخری سرے پر تھا۔ مکان خاصہ بڑا تھا سب کے اپنے اپنے کمرے تھے۔ مریم اور ابو بکر مکان کے ایک کمرے میں سوتے تھے جبکہ عمر علی الگ کمرے میں۔ گرمیوں کے دنوں میں عمر علی اکثر چھت پر سویا کرتا تھا۔ علی رحمٰن سے یاری ہو جانے کے بعد انعم نے جان بوجھ کر مکان کے باہر والے کمرے میں سونا شروع کر دیا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ انعم نے علی رحمٰن سے کہا کہ علی رات کو جب سارا گاؤں سو جائے تو وہ چپکے سے اس کے گھر آجائے۔ علی رحمٰن نے ایسا ہی کیا۔ گاؤں کے لوگ جب گہری نیند سو جاتے تو علی رحمٰن انعم سے

ملنے اس کے گاؤں پہنچ جاتا۔ پھر دونوں عاشق ساری تہذیب کو طاق میں رکھ کر ایک دوسرے میں کھو جاتے۔ دونوں کی پیاس بجھ جاتی تو رات کے اندھیرے میں ہی علی رحمٰن واپس اپنے گاؤں چلا جاتا اور انعم دروازہ بند کر کے سو جاتی۔ حالانکہ علی رحمٰن اور انعم ملنے میں بے پناہ محتاط تھے مگر اس کے باوجود عمر علی کو بہن پر شبہ ہو گیا۔ شبہ کی وجہ انعم کے بدلے بدلے تھے ہی علی رحمٰن کی بے صبری بھی تھی۔ دراصل انعم کے دیدار کی تڑپ علی رحمٰن کو زیادہ پریشان کرتی تو وہ اپنی موٹر سائیکل اٹھا کر انعم کے گھر کا چکر لگانے پہنچ جاتا۔ عمر نے پہلے اکثر علی رحمٰن کو اپنے گھر کی طرف تاکتے ہوئے دیکھا تھا پھر ایک روز عمر علی نے ان دونوں کو باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ عمر علی نے اس وقت تو انعم سے کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں اسے سمجھایا۔

”دیکھ انعم تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔ یہ عمر بڑھنے لکھنے کی ہے۔ یہ سب کرنے کی نہیں۔“ انعم پر بھائی کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اللہ وہ بولی۔

”ویرجی علی رحمٰن بڑا اچھا لڑکا ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتا ہے۔ ہے بھی وہ ہماری ذات کا۔“

”ان باتوں کی سمجھ ابھی تجھ میں نہیں ہے انعم۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ تو آئندہ علی رحمٰن سے نہیں ملے گی۔“

انعم بھلا کب ماننے والی تھی۔ بھائی کے فرمان سے انکار کرتے بولی۔

”بھیا میں علی رحمٰن کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ مجھے پیار کرنے سے نہیں روک سکتے۔“ انعم کی بے شرمی دیکھ کر عمر علی اپنا آپ کھو بیٹھا۔ اس نے انعم کو زوردار طمانچہ جڑ دیا۔ انعم روتے ہوئے وہاں سے چلی گئی لیکن اس نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ ادھر اس دن کے بعد عمر علی انعم پر نظر رکھنے لگا۔ یہی نہیں وہ سکول بھی خود ہی چھوڑنے جاتا اور سکول سے لانے بھی۔ عمر علی کے ذریعے انعم کی بے حیائی کی بات ابو بکر کو پتہ چلی تو انہوں نے بھی انعم کو سمجھایا لیکن انعم تو عشق کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس نے کسی کی نہیں سنی۔ گھر والوں کی نظروں کے پھرے کے سبب انعم اب علی رحمٰن سے مل نہیں پار رہی تھی اس سے علی رحمٰن بے چین ہو گیا۔ اس مسئلے کا حل نکالتے ہوئے علی رحمٰن نے انعم کو ایک موبائیل فون خرید کر دے دیا۔ انعم اس فون کو بے حد احتیاط سے اپنے پاس رکھتی تھی۔ جب اسے علی رحمٰن سے بات کرنی ہوتی تو تنہائی میں جا کر بات کر لیتی لیکن باتوں سے دل نہیں بھرتا تو ملنے کیلئے وہ دونوں بے چین رہنے لگے۔ دونوں کو اب انتظار تھا کسی مناسب موقع کا جب وہ اپنے ملنے کی راہ نکال سکیں۔

یہ موقع انہیں آخر ایک دن مل گیا۔ اس رات عمر علی کسی جگہ راتے میں گیا تھا۔ انعم کو پتہ تھا کہ عمر علی کی واپسی صبح سے پہلے نہیں ہونے والی۔ انعم نے اس کی اطلاع علی رحمٰن کو دیتے ہوئے اسے رات کو اپنے گھر بلا لیا پہلے کی طرح انعم رات کو مکان کے باہر والے کمرے میں سو گئی تھی۔ رات ہوتے ہی علی رحمٰن ملنے آ پہنچا۔ انعم محبوب سے ملنے کیلئے اتنی بے تاب تھی کہ اس نے علی رحمٰن کو اندر کھینچ کر دروازے کی کنڈی بھی نہیں لگائی۔ دونوں اختلاط کیلئے دیوانے ہوئے جا رہے تھے اس لئے انہیں کسی بات کا خیال نہیں رہا۔ دونوں ایک دوسرے میں سما جانے کی کوشش کرنے میں دنیا مافیا سے بے خبر ہو گئے۔ عین اسی وقت عمر علی لوٹ آیا اسے مکان کے باہر والے کمرے میں کچھ بالچل سی محسوس ہوئی تو وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ دونوں مستانوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ کوئی اندر آیا ہے۔ جیسے ہی عمر علی نے کمرے کی لائیٹ آن کی وہاں کا بے شرم نظارہ دیکھ کر وہ سناٹے میں رہ گیا۔ دونوں کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اپنے اپنے کپڑے پہنتے ہوئے دونوں بغلیں جھانکنے لگے۔ علی رحمٰن نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی عمر علی نے اسے پکڑ کر پیٹنا شروع کر دیا۔ انعم نے عاشق کو بچانے کی کوشش کی تو عمر علی نے اسے بھی پیٹ دیا۔ مارکھا کر علی رحمٰن وہاں سے چلا تو گیا لیکن عمر علی

سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

عمر علی اپنی بہن کے کردار پر بہت دکھی تھا۔ اس نے آدھی رات کو بہن کو جس روپ میں دیکھا تھا وہ منظر اس کے دماغ سے ہٹ نہیں رہا تھا۔ اس رات تو اس نے انعم کو مار مار کر نیم مروہ کر دیا لیکن جب بھی وہ اسکی نظروں کے سامنے آ جاتی عمر علی کو وہی سین یاد آ جاتا اور اسکا خون کھول اٹھتا۔ بہن کی بے شرمی سے وہ عجیب سی دماغی ٹینشن میں رہنے لگا۔ ایک روز اس نے اپنی اس پریشانی کا ذکر اپنے دوست آصف علی سے کیا۔ آصف علی نے اسے یقین دلایا کہ وہ دونوں مل کر اسکا کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ لوگ کوئی حل تلاش کرتے علی رحمٰن نے اپنے دوست اظہر علی و انعم سے مل کر عمر علی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ دراصل علی رحمٰن اور انعم کو اب لگنے لگا تھا کہ عمر علی کے زندہ رہنے میں انکا ملن ممکن نہیں تھا اگر انہیں ایک ہونا ہے تو عمر علی کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔ جیسی تسکین کی ماری بہن کو اپنا بھائی کانٹنے کی مانند کھٹکنے لگا تھا۔ اسلئے وہ بھائی کے قتل کیلئے عاشق کے ہاتھوں خود ہتھیار تھمانے کو تیار ہو گئی۔ انعم قتل کے منصوبے میں شامل ہونے کیلئے تیار ہو گئی تو علی رحمٰن نے اپنے دوست اظہر علی کو بھی مدد کے لئے تیار کر لیا۔ اظہر علی دو شرائط پر انکی مدد کرنے پر متفق ہوا تھا۔ پہلی شرط تھی انعم کی سہیلی کیسا تھا انعم اظہر علی کی دوستی کرائے گی اور دوئم یہ کہ علی رحمٰن اپنے بھائی عاصم کیسا تھا اظہر علی کو آسٹریلیا لیجانے میں مدد کرے گا۔ منصوبے کے تحت انعم نے عمر علی کے سامنے ایسا ناک شروع کر دیا کہ اسے اپنے کئے کا بے حد افسوس ہے اور وہ سدھر گئی ہے۔ یہی نہیں انعم نے عمر علی سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔

”بھائی جان میں شرمندہ ہوں مجھے اونچ نیچ کی سمجھ آ گئی ہے۔ آئندہ میں کبھی علی رحمٰن کا نام بھی نہیں لوں گی بس آپ مجھے معاف کر دیں۔“

بہن کی باتوں پر عمر علی نے یقین کر لیا۔ ایک دن علی رحمٰن نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دینی تھی۔ اسی کے تحت انعم نے عمر علی کے کھانے میں نیند کی گولیاں ملا دی تھیں۔ عمر علی کھانا کھا کر چھت پر سونے گیا تو اسے لیتے ہی گہری نیند آ گئی۔ ادھر انعم، علی رحمٰن اور اظہر علی کا انتظار کرنے لگی۔ رات تقریباً ایک بجے وہ دونوں ابو بکر کے گھر پہنچ گئے۔ علی رحمٰن نے جیسے ہی دروازہ پر دستک دی، انعم نے فوراً دروازہ کھول دیا اسکے بعد وہ تینوں چھت پر جا پہنچے جہاں عمر علی سو رہا تھا دو پگڑیوں کو آپس میں باندھ کر علی رحمٰن اور اظہر علی نے اسے رسی کی شکل دے دی۔ پھر علی رحمٰن کے اشارے پر انعم نے عمر علی کے پیروں کو مضبوطی سے پکڑ لیا جبکہ اظہر علی کی مدد سے علی رحمٰن نے پگڑی کا پھندا عمر علی کی گردن میں کس دیا۔ کچھ دیر ہاتھ پیر ٹپکنے کے بعد عمر علی کا جسم ساکت ہو گیا۔ عمر کا قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کیلئے تینوں نے اسے رسی کی مدد سے نیچے اتارنے کی کوشش کی لیکن رسی ٹوٹ گئی اور لاش نیچے گلی میں جا گری۔ تینوں مارے ڈر کے چھت پر دبک گئے۔ اتفاق سے لاش گرنے کی آواز کسی نے نہیں سنی۔ نہ کسی نے باہر آ کر دیکھا تھا۔ لہذا وہ تینوں تیزی سے گلی میں آئے اور موٹر سائیکل پر لا کر لاش کو گاؤں میں واقع ایک خشک کنویں میں ڈالنے کے بعد اپنے اپنے گھر واپس لوٹ آئے۔ صبح جب عمر علی کا کوئی پتہ نہیں چلا تو انعم ماں باپ کو درغلا نے لگی کہ بھائی ضرور کسی لڑکی کو بھگا کر لے گیا ہوگا۔ دراصل انعم نہیں چاہتی تھی کہ وہ لوگ اس معاملے کو پولیس میں لیکر جائیں لیکن معاملہ پولیس میں چلا گیا۔

سی آئی اے انچارج عبدالناصر کے ہاتھ تفتیش آنے کے بعد مخبر کی معرفت عمر علی کے دوستوں سے بات کی تو انہیں پتہ چلا کہ عمر علی انعم کے کردار سے پریشان تھا۔ انہیں انعم اور علی رحمٰن کے تعلق کا بھی علم ہو گیا تب انہوں نے انعم کے موبائل کی ڈیٹیل نکلوائی تو انکا شک یقین میں بدل گیا۔

دونوں میں روزانہ لمبی لمبی بات ہوتی تھی۔ پختہ ثبوت ملنے پر انہوں نے ایک دن علی رحمٰن، اظہر علی اور انعم کو گرفتار کر لیا۔ پولیس کیلئے ملزمان تک پہنچنا اسلئے بھی آسان ہو گیا تھا کیونکہ اظہر علی اور علی رحمٰن جن موبائیل فونز کا استعمال کرتے تھے وہ فون انعم کے تھے۔ یہ فون انعم نے انعام کے طور پر انہیں دیئے تھے۔ پوچھتاچھ میں علی رحمٰن اور اظہر علی جب نہیں بتا سکے کہ یہ فون ان کے پاس کہاں سے آئے تھے تو پولیس کیلئے ان پر نفسیاتی دباؤ بنانا آسان ہو گیا تھا۔ پھر پولیس نے ان تینوں کو عدالت میں پیش کر کے جسمانی ریمانڈ پر لے لیا۔ ریمانڈ مدت میں تینوں سے مفصل تفتیش کی گئی تو انہوں نے راز اگل دیا۔ بہر حال ان کی نشان دہی پر پولیس نے کنویں سے عمر علی کی ہڈیاں برآمد کر لیں۔ عمر علی کے کپڑوں اور چپلوں سے اسکی شناخت بھی ہو گئی۔ پولیس نے ملزمان کے پاس عمر علی کے موبائیل سمیت پانچ ہزار اور سونے کے زیورات بھی برآمد کئے۔ ملزمان کے بیانات کے بعد پولیس نے انہیں دوبارہ عدالت میں پیش کیا، جہاں سے انہیں عدالتی حراست میں جیل بھیج دیا۔ ابوبکر اور مریم کا اکلوتا بیٹا جان سے گیا۔ گھر کا چراغ بجھانے والی خود انکی ہی بیٹی انعم تھی۔ انکے لئے تذبذب ہے کہ جس نے گھر کا دیپ بجھایا۔ انعم کو اب جیل ہی میں سڑنے دیں یا اس کیلئے اپنا فرض نبھائیں۔ منہ لگی بیٹیاں گمراہ ہو کر ماں باپ کیلئے ایسی ہی مصیبتیں پیدا کرتی ہیں جیسا کہ عالم بہن انعم کر کے جیل میں بیٹھی تھی۔ واپس لوٹنے کے بعد وہ لوگ اب اسے گھر نہیں رکھیں گے یہ سوچ کر وہ خوش تھی۔ اسکا چاہنے والا علی رحمٰن بھی ساتھ قید میں تھا۔ کون جانتا ہے کہ عمر کے کس حصے تک انہیں جیل میں رہنا ہوگا۔ بڑی بڑی آنکھوں والی دہلی پتلی انعم بڑی خوش دلی سے کہتی تھی۔

”دنیا میں کوئی اور نہ سہی علی رحمٰن تو ہے ماریہ۔ اسکے ساتھ ہی زندگی کاٹ دوں گی۔“ ہنستے ہنستے اسکا چہرہ کھل اٹھتا تھا۔

رومانہ کو سبھی وہاں سسر کہتے تھے۔ اسکا تعلق جنوبی پنجاب کے ایک زرخیز علاقے سے تھا۔ اسکا باپ ایک غریب کسان تھا اور ماں پیدا ہوتے ہی چل بسی تھی۔ وہ چار بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی اور اسے ابتدا ہی سے پتہ تھا کہ اسکے والد اسکا جہیز جٹانے کے متحمل نہیں ہو سکیں گے مگر اسکا بچپنا خوشگوار تھا۔ وہ کھیتوں میں کھیلا کرتی اور دیہاتی میلوں میں گھوما کرتی تھی۔ اس نے درجہ سوم تک تعلیم حاصل کی تھی اور اردو میں اپنا نام اور اخبار پڑھ سکتی تھی۔ رومانہ زیادہ تر ہلکے مٹی رنگ کی اسکرٹ اور بلاؤز پہنتی تھی جن پر پھول کاڑھے گئے تھے۔ اسکی کالی آنکھوں میں چمکتی دمکتی لکیریں تھیں اسنے چاندی کی چوڑیاں اور چاندی کا بند اور کانوں میں سستی امیٹیشن بالیاں پہن رکھی تھیں۔ ایک تعویذ اسکے داہنے بازو پر اور ایک تعویذ کمر میں بندھا ہوا تھا وہ کہتی تھی۔ یہ قسمت چکانے کیلئے ہیں اسکے ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں میں لگا سرخ نیل پالش اب چھوٹ رہا تھا۔ پچیس سال کی عمر میں وہ اپنے پیشے کیلئے عمر دراز تھی لیکن اب بھی وہ وہی اجرت لیتی تھی جو سولہ سال کی عمر میں لیا کرتی تھی۔ اسکی کمر پتلی اور کولھے کافی بڑے بڑے تھے۔ اتنے بڑے کہ وہ ہزاروں بچے جن سکتی تھی۔ اسکی بائیں چھاتی اور جاتھوں کے درمیان جلنے کے نشانات تھے۔ جو اسکی تربیت کے دنوں کی یادگار تھے۔ یہ نشانات اس کے جسم کی قسمت تو نہیں گھٹاتے لیکن روز جب وہ نہاتے ہوئے انہیں دیکھتی تھی تو اسے اپنی ناقابل توضیح قسمت اور اس زندگی کی یاد آتی تھی جو بچپن ہی میں اس سے چھین لی گئی تھی۔

جب وہ بارہ برس کی تھی تو اسکے ابا کے ایک دوست پر اسے کافی بھروسہ تھا۔ اسے باہر کھیتوں میں لے گئے۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کو بلایا اور اسکی عصمت دری کر دی گئی اسے وہاں خون میں لت پت چھوڑ دیا گیا۔ اسکے بعد اسکی زندگی بے مول ہو گئی۔ اسکے والد گذر گئے اور اسکی

سوتیلی ماں نے ایک دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ ہر روز اسے مارا پیٹا جاتا۔ وہ خود کو ہلاک کر دینا چاہتی تھی لیکن رومانہ یہ کر نہیں پائی پھر اسکی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس نے اس سے کہا کہ وہ رومانہ کو کسی بڑے شہر میں نوکری دلادے گا۔ وہ اسے شہر لے آیا اور لا کر ایک قحبہ خانہ میں بھیج دیا۔ شائد اسے پچیس ہزار روپے ملے تھے۔ اس وقت وہ پندرہ سال کی تھی۔ چند ہی گھنٹوں بعد اس کے گاہک کمرے میں آنے لگے۔ تاجر، چھوٹے چھوٹے سرکاری افسران، پرانے عاشق وہ جو رومانہ کے متحمل ہو سکتے تھے اب یہی اسکی قسمت تھی۔ اب اس سے بچنے کی کوئی راہ نہیں تھی۔ بہت سے اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ بہتوں کے بیوی اور بچے تھے لیکن وہ کہتے تھے کہ رومانہ کے ہاں کرنے پر وہ سب کچھ چھوڑ دیں گے۔ وہ اسے خوش فلمیں دکھانے لے جاتے تھے۔ اچھے سے اچھا کھانا کھلاتے تھے اور بیمار پڑنے پر اسے ڈاکٹر کے پاس بھی لے جاتے تھے۔ نیچے گلی میں اپنے اپنے پنجرہوں کے دروازوں پر کھڑی ہوئی وہ عورتیں ہوتی تھیں جو انکی خدمت کرتی تھیں جو رومانہ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ انکے چہروں پر سفید میک اپ کی موٹی موٹی پر نہیں ہوتی تھیں، انکی آنکھوں کی پلکیں بڑے ہی بے ڈھنگے پن سے کی ہوئی ہوتی تھیں اور وہ سستے اور بھڑکیلے کپڑے پہنتی تھیں۔ زیادہ تر لمبی بانہوں کے تاکہ انکے جسم کے نشانات چھپے رہیں۔ گاہک زیادہ تر نشے میں دھت ہوتے تھے اور مسائل کھڑے کر دیتے تھے۔ اور ان لڑکیوں کو روپے کی ہر حال میں ضرورت رہتی تھی۔ کوٹ مراد خاں ہزاروں لڑکیوں کا مسکن تھا۔ حالات کے ہاتھوں مجبور زیادہ تر لڑکیاں روائتی پنجرہوں میں آپ بھنستی تھیں یا پھر خوشحال ویکم قحبہ خانوں میں رومانہ کی طرح ان میں بہت سی تو ابھی بچیاں تھیں۔ اب تک یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ وہ تنہا کیسے ہو گئیں۔ شروع کے چند یوم عذاب کے تھے زیادہ تر لڑکیاں دوستوں اور خاندانوں کے ہاتھوں یہ دھوکہ دے کر لائی گئیں تھیں کہ انہیں خوب روپے اور اچھی زندگی ملے گی۔ اس پیشے میں انہیں اس زندگی سے توڑا جاتا تھا جو عموماً جنگلی جانوروں کیلئے مختص تھی۔ ضدی اور فرار کی متلاشی اور بھی زیادہ بے رحمی کا نشانہ بنتی تھیں۔ ابتدا میں جب رومانہ کے پاس آتے تو مزاحمت کرتی پھر ایک مقامی غنڈے نے اسے تربیت دی اس نے رومانہ کی چھاتیوں اور جاتکھوں کو جلایا اور بار بار اس کی عصمت دری کی۔ وہ بہت چیختی چلائی۔ رومانہ کی مادام اس سے بہت شفقت کا برتاؤ کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ وہ بھی اسی تجربہ سے گذری تھی۔ وہ کہتی تھی کہ بہتر ہوگا کہ مزاحمت چھوڑ کر قسمت کے لکھے کا مزہ لیا جائے اور چند ہفتے بعد ہی وہ اپنے ماضی کو بھلانا شروع کر دیتی تھی۔ بچنے کا یہی واحد راستہ تھا۔ مادام ایک اچھی خاتون تھی۔ رومانہ کیساتھ وہ اچھا برتاؤ کرتی۔ اسے کپڑے اچھا کھانا، خوشبو، تیل اور ڈھیر سارا پیار دیتی۔ اس سے قبل اسے زندگی میں ایسا پیار نہیں ملا تھا۔ وہ انکی گود میں بیٹھ کر ان سے کھیلا کرتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ رومانہ کے پاس کوئی تھا جس سے وہ بات کر سکتی تھی۔ وقت گزرنے کیساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ جب مہینے سال بن جاتے ہیں اور لڑکیاں عورتیں بن جاتی ہیں تو وہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔ ہر کوئی رومانہ کی طرح خوش قسمت نہیں تھی۔ بہت سی منشیات کی عادی ہونے لگتی ہیں، تاکہ اپنے درد و غم کو بھلا سکیں۔ اب تو بہت ساری HIV/AIDS کی وجہ سے اپنی موت کی منتظر تھیں جیسا کہ دنیا بھر میں دوسرے قائدے ناکام تھے۔ حکومتیں بھی جسم فروشی کو محدود کرنے میں ناکام رہیں بلکہ قانون نے جسم فروشی کو مجرمانہ فعل بنا دیا۔ سیکس ورکروں پر روک ٹوک لگا کر انہیں دلالوں، غنڈوں اور پولیس والوں کے ہاتھوں کھلونا بنا دیا۔ مگر اس بازار نے قانونی پابندیوں سے بچتے ہوئے خود کو بڑی ہی روانی سے حجم میں بھی اور اہمیت میں بڑھا لیا ہے۔ غربت بے روزگاری کی وجہ سے ہی جسم فروشی مجرمانہ زندگی اختیار کر گئی اور ایک طاقت ور ذیلی تہذیب ابھر آئی۔ دلال قحبہ خانہ کے مالک، پیشہ ور مجرم، سیاست

وان جسکے مورث اعلیٰ ہیں اور جو جنسی صنعت کی دولت آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ آج کورٹ مراد خاں کا ڈھانچہ بہت ہی واضح ہے اور اس سے سب ہی نفع حاصل کرتے ہیں سوائے خود جسم فروشوں کے۔ کوٹ مراد خاں کوڑا کرکٹ سے بھری چھوٹی چھوٹی گلیوں کا جال تھا ہزاروں کی تعداد میں جسم فروش جن میں عورتیں بھی تھیں مرد بھی اور بچے بھی۔ گلی نمبر ۱ میں اور گلی نمبر ۲ سے لیکر گلی نمبر ۱۴ تک پیشہ کرتے تھے۔ گلی نمبر ۲ سے لیکر گلی نمبر ۶ تک کے درمیان نے نچلے اوسط درجہ کے خاندان مخدوش عمارتوں میں رہتے اور اس باعزت دنیا میں اپنی لمبی زندگی گزارتے تھے۔ اس سفید اور سیاہ دنیا کے ملاپ کے باوجود کوٹ مراد خاں کی خصوصیت وہاں کی مستحکم ہم آہنگی تھی۔ رومانہ کیساتھ پندرہ لڑکیاں تھیں۔ وہ ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اگر کوئی لڑکی بیمار پڑتی تھی یا اسے کوئی مدد درکار ہوتی تھی تب ہر کوئی اس میں حصہ لیتا تھا۔ وہ سب ایک ہی کشتی میں سوار تھیں۔ نان کی مائیں تھیں نہ باپ اور نہ کوئی خاندان۔ وہ ہی صرف ایک دوسرے کی تھیں۔ کوٹ مراد خاں میں اکثریت ایسی لڑکیوں کی تھی جنہیں باہر سے بھگا کر لایا گیا تھا۔ بلکہ وہ غربت، استحصال اور سماجی اخراج کا شکار ہوئی تھیں۔ دس فیصد ایسی تھیں جنہوں کے شوہروں نے انہیں چھوڑ دیا۔ آٹھ فی صد ایسی تھیں جن کی بچپن ہی میں عصمت دری ہوئی تھی۔ چھ فی صد ایسی جن کے ساتھ انکے اپنوں نے ہی گھر میں بد فعلی کی تھی اور آٹھ فی صد کی تعداد میں وہ بیچاری لڑکیاں تھیں جو طوائفوں کے ہی پیٹ سے پیدا ہوئی تھیں۔ کوٹ مراد خاں جنسی سرگرمیوں کیلئے بڑے پیمانے کا اڈہ تھا۔ ویکم فہرہ خانہ جیسے کہ رومانہ کا۔ جن کی نشست گاہیں آرام دہ ہوتی تھیں اور منتظر گاہک وہاں بیٹھ کر محفوظ ہوتے تھے۔ انکی کھڑکیوں پر پردے اور پلنگ پر صاف ستھری چادریں ہوتی تھیں نشے کی بد بو سے بھرے منہ اور پسینے کی گندی بو سے تر۔ لیکن رومانہ ایک جسم فروش تھی یہ اسکا پیشہ تھا وہ نہیں بول سکتی تھی۔ سستے داموں والے پنجرے چھوٹے چھوٹے خستہ حال کمرے ہوتے تھے جنہیں عورتیں اتنا سجاتی تھیں جتنی وہ متحمل ہو سکتی تھیں۔ وہاں پرسکون نہیں دیا جاتا۔ گاہک سیکس ورکر کیساتھ پانچ یا دس منٹ ہی گزار سکتا تھا۔ شاید دنیا میں یہیں سے قلیل وقفے کی لذت ملتی تھی اگر پنجرے والی عورتوں کی زندگی سخت ہوتی ہے تو انکی تو انتہائی سخت تھی جو کوٹ مراد خاں کے علاقے میں دھندا کرتی تھیں۔ یہ عورتیں بس اسٹاپوں، پارکوں، ہسپتالوں، سنان گلیوں، ریلوے اسٹیشنوں یا جہاں بھی مردوں کو ہجوم ہوتا ہے وہاں کے چکر لگا کر گاہکوں کو گھیرنے میں لگ جاتی تھیں۔ جنسی عمل کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ سستے ہوٹلوں کے کمروں میں، راستے پر یا پھر مخدوش عمارتوں کے نیچے۔ جنسی عمل چوری چھپے ہوتا ہے۔ اس لئے خوش دلی میں وقت ضائع نہیں کیا جاتا۔ بہت سے لوگ لڑکیوں کو اغوا کر کے فہرہ خانوں میں بیچ جاتے تھے۔

ایک دن شوکت علی نامی سیکس ورکر راحیلہ نام کی لڑکی کو کسی گاؤں سے اغوا کر کے رومانہ کے پاس چھوڑ گیا۔ راحیلہ پڑھ لکھے خاندان سے تھی۔ اسکا ذہن اس دھندے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس نے چیخ و پکار شروع کر دی اور یہی آواز تھا نہ تک پہنچ گئی اور پھر اسی رات پولیس نے رومانہ کے گھر سے راحیلہ کو برآمد کر کے رومانہ کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کر کے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔ رومانہ بارہ سال سے اس بازار میں تھی اس نے بہت پیسے بچائے تھے شاید جیل سے رہا ہو کر یہ گلی چھوڑ دے گی اور اپنے کسی عاشق سے شادی کر کے گھر بار سنبھال لے گی۔ کہاں؟۔۔۔ اس کا رومانہ کو پتہ نہیں مگر کسی ایسی جگہ جہاں اسے کوئی نہ جانتا ہو۔

بشری کا کہنا تھا کہ مجھے رومانہ کی مادری زبان میں بولنا آتا ہے اسی لئے شاید وہ میری موافقت کرے گی۔ رومانہ کے پاس ایک نیل کڑ تھا۔

ایک وارڈن اسے لینا چاہتی تھی۔ رومانہ نے اسے نہیں دیا۔ چھوٹے سے اس چمکتے ہتھیار سے وہ اپنے ناخن کاٹ لیتی تھی۔ وارڈن نے کہا کہ جس چیز سے ناخن کاٹا جاسکتا ہے۔ اس سے گلا بھی تو کاٹا جاسکتا ہے۔ میٹرن چپ رہی۔۔۔ وارڈن کو چڑانے سے اس کا بس نہیں چلتا تھا۔ رومانہ کے کپڑے، کمبل سب کچھ تلاشی کرنے پر گلا کاٹنے کے لائق انہیں کوئی ہتھیار نہ مل سکا۔ رومانہ نے نیل کٹر اس دن کہیں چھپا کر رکھ دی تھا۔ رومانہ کو پیٹنے کی کوشش کرنے پر بیرک کے اندر بدلے کی ایک دبی ہوئی آگ کا احساس پانے سے موٹے بدن کی سبزی خورشائستہ وارڈن چپ رہ گئی۔ دوسرے دن صبح بھی بیرک کے کھلنے سے پہلے نیل کٹر نہیں نکال دینے کے جرم میں رومانہ کو برہنہ کر کے ہاتھ میں چھین ڈال کر بیرک میں لٹکا دیا گیا۔ تب سے ناخن کاٹنے والے اس نیل کٹر سے مجھے نفرت ہو گئی۔

مجرموں کو سزا دینے اور سزا کا عرصہ گزارنے کیلئے جیلیں بنائی جاتی ہیں۔ جیلوں میں سزایافتہ قیدیوں اور زیر سماعت مقدمات کے ملزموں کو الگ الگ رکھا جاتا ہے۔ جیل کو دیکھا جائے تو وہاں ایک الگ تھلگ دنیا ہستی نظر آتی ہے۔ کوئی عمر قید کاٹ رہا ہے تو کوئی پھانسی کی سزا ملنے کے بعد آخری گھڑیاں گن رہا ہوتا ہے۔ خواتین کی بارکیں الگ ہیں اور اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں کو جو ناکل سیل میں رکھا جاتا ہے۔ ان ملزموں اور مجرموں کو جیل قوانین کے مطابق قید رکھنے کیلئے انگریز دور سے ایک فورس موجود ہے۔ جیل خانہ جات پولیس۔ پنجاب پولیس، ریلوے پولیس، موٹر وے پولیس، پیٹرولنگ پولیس، سٹی ٹریفک پولیس کی وردیوں میں تو پولیس لکھا ہوتا ہے لیکن جیلوں میں ڈیوٹی دینے والی پولیس کے شوٹڈر پر پولیس کی بجائے PRISONS لکھا ہوتا ہے جس کا مطلب جیل کی کوٹھڑیاں۔ قید خانے یا بیرکیں بنتا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جیلوں میں ڈیوٹی دینے والے کانسٹیبل سے لیکر آئی جی جیل خانہ جات تک ہر اہلکار کی وردی پر PRISONS ہی لکھا ہوتا ہے جبکہ ان کی بیلٹ پر پنجاب پرینز لکھا ہوتا ہے۔ جیل میں قیدیوں کی حفاظت کرنے والے اہلکاروں کو وارڈن کہتے ہیں۔ یہ پولیس نہیں ہے کیونکہ پولیس کا کام گرفتار کرنا اور پراسیکیوشن کرنا ہوتا ہے۔ یہ حفاظتی فورس یا گارڈ ہوتے ہیں۔

بیرک میں دروازہ بند تھا لیکن ایک دم کسا ہوا نہیں تھا۔ بیرک میں دولڈ و بورڈ ملنے کی خبر زاہدہ نے ہم تک پہنچائی تھی۔ اسے میرے ساتھ بہن کا رشتہ جوڑ رکھا تھا ورنہ اسے آپ نہ کہہ کر تم کہنے میں شرم آتی تھی۔ اسکا چہرہ بہت سندر تھا۔ کوئل گول مثول، بھاری نچلا ہونٹ، پلکیں بھاری بھاری، گاؤں کے ایک غریب کسان کی بیٹی تھی۔ علی سفیان شوہر میکے میں چھوڑ گیا تھا پھر دوبارہ شادی کر لی۔ اب وہ بیوی بچوں کیساتھ آرام کی زندگی گزار رہا تھا۔ زاہدہ چچا کے گھر محنت کر کے اپنے کھانے کی قیمت ادا کر رہی تھی لیکن وہیں چچی کے بھائی ساجد کے بستر پر رہنے کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ساجد، زاہدہ کی چچی کا بھائی تھا اور وہ اکثر گھراتا جاتا تھا۔ وہ کالج پاس کر کے آیا تو اس نے یقین دلایا کہ وہ اسے لیکر چپ چاپ شہر چلا جائے گا۔ وہیں جا کر اس سے شادی کر لے گا۔ شہر میں ایسا خوب ہوتا ہے۔ شہر میں ایک مکان ٹھیک کرتے ہی اسے لے جائے گا۔ وہ شہر گیا بھی لیکن شادی کسی اور سے کر لی۔ زاہدہ کے سامنے سے ہی نئی بہو دیر تک سو کر کمرے سے نکلتی تھی۔ اسے دیکھ کر تھوکتی تھی۔ اپنی چچی کی جلی جلی باتیں سنتی۔ گو بر صاف کرتی، نئی بیگم کے بستر کی چادر چھانٹتی پھر ایک دن خون میں زہر کا کوئی بیج اثر کر گیا اور اس نے چھت سے نئی بہو کو نیچے دھکیل دیا۔ اس نے واردات کو جھٹلایا نہیں تھا پھر بھی تھانے میں پولیس نے اسکی خوب پٹائی کی۔ ٹھنڈے دماغ سے خون کرنے کے جرم میں بیس سالہ زاہدہ اسی جیل میں سزا کاٹ

رہی تھی۔ چھ سال جیل کاٹنے کے بعد اب اسکی عمر ستائیس سال ہے۔ دو پہر کو اچانک بشری جنگی جہاز کی چال سے آکر ہمیں ایک بورڈ اور اپنا رد عمل ظاہر کرتے ہوئے دے گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا یہ سب میری وجہ سے ہی ہوا تھا۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے آٹھ برس بیت گئے تھے آج تک ایک دو فنی کا سامان بھی یہاں آتے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ہنسی آگئی یہی بشری کچھ دن پہلے وارڈن سے جھگڑا کر کے مجھے دھمکی دے گئی تھی لیکن میں نے اس سے بورڈ لے لیا تھا۔ شدید فرقہ دارانہ ذہنیت کی کتاب کے بارے میں بارہ سے تیس نمبر صفحات پھاڑ دینے کے بعد لاہوری کی کتابیں اخبار کچھ بھی پڑھنے کو نہیں مل رہا تھا۔ دن بھر دونوں ہاتھوں سے لڈو کھیلتی تھی۔ داہنے ہاتھ سے پیلا نقطہ لال بائیں ہاتھ سے نیلا ہرا۔ قریب دو مہینے تک لگا تار کھیلتی رہی۔ یہاں اتنا لڈو کھیل لیا کہ زندگی میں پھر لڈو کھیلنے کی خواہش نہیں ہوگی۔

وہ عید کا دن تھا بھابی سب کو زور زور سے پکار رہی تھی

”ارے آؤ بچوں کی ماں آؤ چائے پیو۔“

چسکی لیتے ہوئے سبھی نے تھوٹھو کر کے اگل دیا تھا۔

”ارے کیسی چائے بنی ہے لگتا ہے یہ جل گئی ہے۔ جلی ہوئی چائے بھلا کون پی سکتا تھا۔“

کسی نے اسے نہیں پیا تھا۔ سب نے خوب مذاق اڑایا مگر میں اکیلے ہی پاؤں پیارے دو پیالی کافی پی گئی۔ سبھی قیدیوں نے اپنے اپنے انداز میں عید کی خوشیاں منا کیں میں نے زیادہ تر وقت تحریک حقوق انسانی کے لیڈر وقار حسن شہید کی یاد میں گزارا تھا کیونکہ میری عید اس دن ہوگی، جس دن میں حقوق انسانی کے ہزاروں کارکنوں کے درمیان جاؤں گی۔

شام کے بعد یوگ آسن کرنے کی کوشش کرتی ہوں گانا بھی گاتی ہوں۔ ان دنوں اکثر لایٹ آف رہتی تھی۔ ہم اندھیرے میں مچھر مارتی رہتی تھیں۔ اندھیرے میں ہوں بھی مار لیتی تھی۔ سر میں بہت جوئیں ہو گئی تھیں۔ کنگھی بھی نہیں تھی وہاں دو طرح کی کرنسیاں چلتی تھیں جنکے ہاتھ میں تھوڑا سا اختیار تھا جو وارڈنوں کو کچھ زیادہ ہی عزت دیتے تھے انکے ہاتھ میں سگرٹ رہتی تھی آنگن میں ہفتہ بھر جھاڑو دینے کے بدلے میں دس بیڑیاں ملتی تھیں اور بدن میں سات گرام تیل لگانے کے بدلے میں دو بیڑیاں ملتی تھیں۔ شہر میں عورتوں کو کبھی کبھی بیڑی پیتے دیکھا تھا لیکن یہاں کی کم عمر لڑکیوں کو بیڑی کیلئے جھگڑتے اور مار پیٹ کرتے دیکھ کر کافی حیران ہوتی تھی۔ اب تو زیادہ حیران ہوتی تھی جب دیکھتی تھی آگ تو ملتی ہی نہیں۔ ایک دو بوڑھی عورتوں کو چھوڑ کر کوئی بیڑی نہیں پیتی جو نہیں پیتی تھیں وہ بیڑی کو توڑ کر اس کے مسالے کو تباہ کو کی طرح لیتی تھیں۔ ان سبھی کو جیل میں ہی اس کی لت لگی تھی۔ یہاں کی گھٹن نے انہیں الگ طرح سے سوچنا سکھا دیا تھا۔ نشے کی لت کیسا تھ ہی جیل میں عجیب طرح کے برے دوسوے بھی انکے من میں گھر کر گئے تھے۔ کمرہ پوچھتے وقت اگر کوئی فرش پر بیٹھا ہوا اسے پونچھا مار جاتا تو اتنا جھگڑے کا امکان رہتا کہ خون خرابے کی نوبت آسکتی تھی۔ جیل کے باہر دن بھر کی جی توڑ محنت کے بعد جنہیں کھانے پینے کی فرصت نہیں ملتی تھی، اب روٹین کا کام کر کے شام کے پانچ بجے تک رات کا کھانا کھا کر سلاخوں کے پیچھے چلے جانے کے بعد نیند کی قربت کیلئے انہیں ایک بیڑی توڑ کر اسکے تباہ کو میں چونا ملا کر کھانا پڑتا تھا۔ چونا باہر سے آتا تھا مگر کس کے بدلے؟ یہ خاص تبادلو ہی ٹچلی سطح کی کرنسی ہے۔ ہفتہ میں ایک دن ناشتہ میں جو چور ملتا تھا اسے جمع کر کے ایک ڈبہ دینے پر دو روپے کے برابر چونا

ملتا تھا۔ اسلئے عام قیدیوں میں سب کچھ کا بزار ہوتا تھا۔ پریشانی اس بات کی تھی کہ وہ بازار چھایا کی طرح تھا میرے سامنے کوئی بھی وارڈن کچھ قبولے گی نہیں کیونکہ مجھ سے تو کوئی قیمت مانگ نہیں سکتی تھیں اس لئے کنگھی کور بنے دیا۔

میں حیران ہوتی تھی کہ مختلف شکلوں، قسموں، نسلوں اور سائز کے خالموں نے عوام کو کن مسلوں چالوں اور نان اشوز میں الجھایا ہوا ہے۔ عوام کو اندازہ ہی نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ بدکرداروں نے قوم کی کریکٹر بلڈنگ تو کیا کرنی تھی الٹا انہیں اس طرح رگیدا، نوچا اور مسخ کیا کہ پوری قوم احتجاجی سی بن کر رہ گئی ہے۔ نہ کام نہ کاج، نہ آگاہ نہ پیچھا، نہ ہمت نہ سفر، نہ کوئی منزل نہ مقصد۔۔۔۔۔ محض لفظوں کی قے اور بے مغز جملوں کی جگالی۔ شاعر مشرق کا خواب، قائد کا خواب، اقبال کے شاہین زندہ قوم سیسہ پلائی دیوار برابری کی سطح کچھول توڑ دیں گے، نچھاور کر دیں گے، انقلاب لائیں گے، کرپشن ختم کر دیں گے جیسے بدبودار جملے۔ شرم نہیں آتی ٹھکوں کے سر غنے اتنی بے حیائی سے مسلسل جھوٹ بول رہے ہیں جبکہ سچی وی کی سکرین پر رنگا ناچ رہا ہے۔ اجڑے بجزے بد حال عوام فاقہ یا نیم فاقہ زد چہرے میلے کپلے کپڑے پلاسٹک کے ٹوٹے پھوٹے چھتر ٹائروں کو آگ لگاتے، گاڑیوں، عمارتوں، موٹر سائیکلوں کو نذر آتش کرتے، پتھر برساتے، لاثعیاں چلاتے، چیختے دھاڑتے عوام۔۔۔ انہیں شرم نہیں آتی شہر شہر یہ مناظر دیکھتے جدھر دیکھو جھوٹ اور فراڈ کے اڈے اور چھاپے، سیون اشار ٹھگ، چوبیس کیرٹ کے بہرہ وچے، عریان ترین تفادات کے شرمناک شہکار، زنگ آلود ذہن اور ذہیک زدہ دماغ جو عوام کے جوتے ان کے سر مار کر عوام کی ذاتی کمائی میں سے ہی یہ معمولی سی خیرات، مختلف شکلوں میں ان کے درمیان تقسیم کر کے کریڈٹ مانگے ہیں جیسے باپ کی جاگیر یا ماں کے جہیز میں سے دان کر رہے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں اس جمہوری دور میں جمہور کہاں ہے۔؟ عوامی دور میں عوام کہاں ہیں ایک اور واردات یہ ہوئی کہ جاگیرداروں نے صنعتیں لگالیں اور بزنس مین بن گئے سرمایہ داروں، صنعتکاروں، سوداگروں نے زمینیں ہتھیا لیں اور جاگیردار بن بیٹھے عوام ہوش کریں دیگی جاگیرداروں اور شہری سرمایہ داروں سے جو نجات پانے کا نادر موقع ہے یہ موقع کھودیا، تم نے تو سمجھنا کہ اپنی آئندہ نسلوں کا سودا کر لیا۔

حنا کی طرح اب میں دوپہر کو راستہ نکالتی تھی پھر سلاخوں کے چھپے ہوئے چھتی تھی۔ ایک ایک بون نکال کر ناخنوں کے سچ دبا کر اسے مارتے ہوئے "ایس" کی آواز نکالتی تھی۔ حنا بہت خوبصورت تھی نچلا ہونٹ بھاری، پلکیں بھاری اور جسمانی طور پر دہلی پتی تھی۔ حنا نے نئے دوست عمیر اور ساتھیوں سے مل کر اپنے سابق محبوب اسامہ علی کو اغوا برائے تاوان کیلئے قتل کروا دیا تھا۔ اسامہ علی عیدوگر کی مشہور شخصیت علی جاوید کا بیٹا تھا۔ انکا پر اپنی ڈیٹنگ کا بھی بزنس تھا۔ علی جاوید کے کنبے میں بیوی کے علاوہ ایک لڑکی اور ایک لڑکا اسامہ علی تھا۔ لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔ بیس سالہ اسامہ علی کنوارا تھا۔ وہ اپنے باپ کے کاروبار میں انکا ہاتھ بٹاتا تھا۔ ایک شام وہ اپنے باپ کیساتھ آفس میں ہی تھا جب اسکی پراسرار محبوبہ نے اسے فون کیا۔ وہ باپ سے یہ بول کر یہ میں بازار جا رہا ہوں کچھ ہی دیر میں آ جاؤں گا، آفس سے نکل گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر ساڑھے چھ بجے کا گیا اسامہ علی آٹھ بجے تک بھی جب نہیں لوٹا تو علی جاوید نے اسے فون کیا۔ انہیں دفتر بند کر کے گھر جانا تھا۔ اسامہ علی کے فون کا سوچ آف آ رہا تھا۔ علی جاوید نے بیٹے کا تھوڑا اور انتظار کیا جب وہ نہیں آیا تو پھر وہ آفس بند کر کے گھر چلے گئے۔ اس دوران اسامہ علی کا فون بار بار ملاتے رہے جو ابھی بھی بند ہی آ رہا تھا اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رات کے دس بج گئے نہ تو اسامہ علی نے گھر فون کیا نہ ہی اس کا فون آن ہوا اسکی

ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی پھر اسے اپنی ماں سے لگاؤ بھی بہت تھا اسلئے اسامہ علی کی یہ لاپرواہی اسکے باپ کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اب بات فکر والی ہوگئی تھی۔ علی جاوید نے اسامہ علی کے کئی دوستوں کے ہاں فون کیا کہ وہ اسکے ساتھ تو نہیں تھا لیکن وہاں سے اس کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ علی جاوید اپنے طریقے سے رات بھر اسامہ علی کو تلاش کرتا رہے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پوری رات آنکھوں آنکھوں میں نکل گئی اگلے روز علی جاوید کے موبائل پر کسی انجان نمبر سے فون آیا۔ تیرے بیٹے اسامہ علی کو ہم نے اغوا کر لیا ہے اپنے لڑکے کی سلامتی چاہتا ہے تو بطور تادان ہمیں دینے کیلئے ایک کروڑ روپیہ تیار رکھو۔ اگر تو نے یہ پیسہ نہیں دیا تو تیرے بیٹے کو جان سے مار کر اسکی لاش تمہیں پارسل کر دیں گے۔ ہمارا گروہ کس قدر خطرناک ہے اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہوگا۔ اسلئے پولیس کے پاس جانے کی بھول قطعی مت کرنا ورنہ اکلوتے بیٹے کی لاش پر سر ٹیک ٹیک کر روئے گا۔ ہماری نصیحت ہے کہ ابھی سے پیسے کے انتظام میں لگ جا۔ کہاں اور کیسے پہنچانا ہے اس بارے میں ہم تجھے بعد میں بتائیں گے۔ وہ بڑا دریا دل تھا لیکن اب اس کے ماخذوں کے آگے ضرورتوں کے ڈیم بن گئے تھے۔ بیٹے کے اغوا اور تادان کی بات سن کر علی جاوید کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ پاس پڑی کرسی پر وہ دھم سے بیٹھ گئے۔ ان کے سامنے اسکے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ فوراً اسکی اطلاع پولیس کو دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اسی دن اغوا برائے تادان کا یہ معاملہ تھانہ سٹی میں نامعلوم مضمون کے خلاف درج کرادیا۔ پولیس نے گپ چپ طریقے سے نہ صرف اسامہ علی کو چھڑانے کا منصوبہ بنا لیا بلکہ اغوا کاروں کو قابو میں کرنے کیلئے ایک ٹیم بھی بنالی۔ منصوبہ کے مطابق پولیس نے علی جاوید کو فون پر اغوا کاروں سے سودے بازی کرنے کیلئے کہا۔ علی جاوید نے ایسا ہی کیا اور بات چیت کے بعد تادان کی رقم ایک کروڑ سے گھٹ کر ساٹھ لاکھ پر پہنچ گئی تھی۔ اب اس کے آگے ایک پیسہ بھی نہیں ہوگا۔ لڑکا چاہئے تو ساٹھ لاکھ لے کر اس جگہ آ جاؤ جو ہم بتائیں گے۔ اغوا کار نے فیصلہ سنا دیا۔ جگہ بتائی گئی۔ گلستان کالونی کے ایک ویران علاقے میں پلان یہ بنا کہ نوٹوں کے سائز کی گڈیاں بنا کر ان پر آگے پیچھے کچھ نوٹ چپکا کر دئے جائیں گے ایسا ہی ہوا بھی۔ علی جاوید کی ڈرائیونگ سیٹ پر سادہ لباس میں ایک تیز طرار پولیس والے کو روکا اور دے کر بٹھا دیا گیا تھا۔ اتنا ہی نہیں ایس ایچ او حلیم خان خود اپنے اسلحہ کیساتھ گاڑی کی ڈیگی میں چھپ گئے تھے۔ ڈیگی کو تھوڑا کھلا چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ ان کے سانس لینے کیلئے ہوا اندر جاتی رہے۔ اغوا کاروں کو پولیس کے اس منصوبے کی نہ تو بھنک تھی اور نہ ہی انہیں امید تھی کہ علی جاوید ایسی چالاکی دکھائیں گے۔ لیکن موقع پر پہنچ کر علی جاوید اس بات پر اڑ گئے تھے کہ اسامہ علی کو ان کے حوالے کیا جائے تبھی پیسہ دیا جائے گا۔ دوسری طرف اغوا کار بھی اس بات پر اڑ گئے کہ پیسہ لے کر گنا جائے گا چیک کیا جائے گا کہ اس کے بعد لڑکے کو چھوڑا جائیگا لیکن علی جاوید چیخنے چلانے لگے۔ تم لوگ مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ میرا بیٹا سلامت ہے اسکی کیا گارنٹی ہے؟ اس پر مشتعل ہو کر ایک اغوا کار نے انہیں ڈرانے کیلئے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ موقع پر افراتفری مچ گئی۔ ایسا ہوا تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا پولیس والا اور ڈیگی میں چھپے ہوئے ایس ایچ او حلیم خان نے بھی گاڑی سے نکل کر گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ دونوں طرف سے کئی راؤنڈ گولیاں چلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اغوا کار خود پھنسا دیکر گولیاں چلاتے ہوئے گلستان کالونی کی طرف بھاگ نکلے۔ وہ سمجھ گئے کہ پولیس ان کے پیچھے ہے۔ اس لئے انہوں نے جاتے جاتے اسامہ علی کو گاڑی سے نیچے دھکیل دیا۔ اسامہ علی کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور وہ زخمی حالت میں تھا۔ پیسہ بے شک زندگی کی اہم ضرورت ہوتا ہے مگر اس کی خاطر ضمیر بیچنے والے بہت ہی بڑے بد قسمت ہوتے ہیں۔ علی جاوید نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اسامہ علی صحیح

سلامت مل گیا تھا۔ اب اسکے اغوا کاروں کو پکڑا جانا ضروری تھی۔ پولیس انکے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی۔ آخر کار پولیس کو اپنی کوشش میں کامیابی مل گئی۔ چند ہفتوں بعد اس کیس سے منسلک چار ملزم پٹھانہ والا علاقہ سے پولیس کے ہتھے چڑھ گئے۔ ان میں ایک لڑکی بھی تھی ان لوگوں سے پولیس کو دو کاریں بارہ سکوڑ ایک موٹر سائیکل بتی بور کی ایک پستول اور چار زندہ کار توں برآمد ہوئے۔ ان سے پوچھنا چھ میں جو کہانی سامنے آئی، وہ حسن کو مہرہ بنا کر جرم کرنے کی ایک دلچسپ داستان ہے۔

اکیس سالہ حنا کے باپ وسیم حسین اور ماں۔۔۔ وسیم۔ یہ لوگ عید و نگر میں رہتے تھے۔ حنا کا ایک بھائی اور ایک چھوٹی بہن تھی۔ وسیم حسین کی اپنی بیوی سے نہیں بنتی تھی اسلئے وہ اپنی ماں یعنی حنا کی دادی کے پاس سمانہ قصبہ میں رہنے لگے تھے۔ حنا کے دادا کی موت ہو چکی تھی۔ وسیم حسین شراب پینے کا عادی تھا۔ اسی وجہ سے گھر میں فساد کا ماحول رہتا تھا۔ ایک سال قبل وہ پھر سے بیوی بچوں کے پاس لوٹ آیا تھا۔ حنا پڑھائی میں تیز تھی۔ پھر اسے پڑھائی کا شوق بھی تھا مگر اسے مستقل پڑھانے کی حیثیت اس کے کنبے میں نہیں تھی لہذا اس نے پرائیویٹ امتحان دے کر انٹر پاس کر لیا اور ان دونوں وہ بی اے فائنل ایئر میں تھی۔ حنا کے بیان کے مطابق آج سے تقریباً دو سال پہلے اس کے موبائیل پر ایک لڑکے کا فون آیا وہ اس سے فرینڈ شپ کرنے کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ تب حنا نے اس کی کال ڈس کوئیک کر دی تھی۔ لیکن اس لڑکے نے فون کرنا چھوڑا نہیں۔ وہ اسے اکثر فون کر کے پیار محبت کی باتیں کرنے لگا۔ نو جوان حنا بھی اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔ وہ حنا سے اکثر یہ کہتا کہ اس کا پیار بالکل سچا ہے اور وہ اسی سے شادی کرے گا۔ اس لڑکے کا نام آفلن شیر تھا۔ آفلن شیر کی تاریخ کچھ اس طرح ہے۔ اسکے باپ کا نام شیر دل تھا اور یہ لوگ تھانہ صدر عید و نگر کے تحت آنے والے گاؤں خیر پور کے باشندے تھے۔ آفلن شیر سے بڑا ایک بھائی تھا۔ دونوں کنوارے تھے۔ آفلن شیر نے الیکٹریکل میں ڈپلومہ کیا تھا۔ وہ کھانا بنانے کا کام کرتا تھا۔ اس کا دوست سہیل احمد تھا جو یوں تو آفلن شیر کے بڑے بھائی کیساتھ نوکری کرتا تھا مگر ان کے اکثر آتے جاتے رہنے سے اسکی آفلن شیر سے کچھ زیادہ ہی چھٹنے لگی۔ سہیل احمد عید و نگر کے اسلام پورہ کا رہنے والا تھا۔ اسکے باپ کا نام فاروق احمد تھا۔ سہیل احمد کی ایک بڑی بہن تھی اور ایک چھوٹی۔ سہیل احمد اور آفلن شیر کی جب گہری دوستی ہو گئی تو یہ لوگ اکثر ساتھ ساتھ بیٹھ کر ڈھیر سارا پیسہ کمانے والا کوئی کاروبار شروع کرنے پر غور کرنے لگی۔ صلاح مشورہ کے بعد دونوں نے طے کیا کہ خالی پلاٹ خرید کر اس پر فلیٹ بنائے جائیں تو اچھا منافع ہو سکتا ہے۔ اسلئے اب یہ لوگ پلاٹ خرید کر اس پر کوٹھی بنا کر فروخت کرنے لگے۔ آفلن شیر کے رشتے میں چچا لگنے والے فاروق کا ایک بیٹا عمیر تھا۔ آفلن شیر کی وجہ سے وہ بھی سہیل احمد کے قریب ہو گیا تھا۔ وہ بھی گاؤں خیر پور کا رہنے والا تھا اور بی اے کا طالب علم تھا۔ عمیر، آفلن شیر اور سہیل احمد جب بھی جمع ہوتے انکی ایک ہی مسئلے پر بحث ہوا کرتی کہ زندگی میں ایسا کچھ کیا جائے جس سے ایک ہی جھٹکے میں اتنا پیسہ آجائے کہ آگے کی زندگی خوب مزے سے کئے۔

”یار سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔ ایک ساتھ لاکھوں کمانے ہیں تو کسی امیر کے بیٹے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ ایک ہی داؤ میں ایک کروڑ چپت۔“

آفلن شیر نے مشورہ دیا بس منصوبہ بن گیا۔ عمیر کو بھی پیسوں کا لالچ دے کر اس منصوبے میں شامل کر لیا گیا۔ منصوبہ تیار ہوا کہ عید و نگر کے امیر شخص علی جاوید کے لڑکے اسامہ علی کو اغوا کر کے کروڑوں کا تاوان طلب کرنے کا۔ انہیں معلوم تھا کہ اسامہ علی اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے جسے چھڑانے کیلئے علی جاوید بڑی سے بڑی رقم دینے کو تیار ہو جائے گا۔ انہوں نے اسامہ علی کا اغوا کرنے کی چار پانچ بار کوشش کی مگر کامیابی نہیں ملی۔ تب

انہوں نے حسن کا جال پھینکنے کا پلان بنالیا یعنی اس کیلئے اس نے اپنی گرل فرینڈ حنا کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ موٹے پیسوں کے لالچ میں حنا بھی اس سنسنی خیز منصوبے میں شامل ہو گئی۔ حنا نے واقعی اسامہ علی کے ارد گرد جال پھیلا نا شروع کر دیا اسے اسامہ علی کو بھی قابو میں کرنے میں وقت ضرور لگا مگر وہ اس سے ملنے کو تیار ہو ہی گیا۔ ایک دن آکلن شیر نے حنا کو فون کر کے مارڈن پارک کے پاس بلایا اور اپنے اسکوٹر سے وہاں پہنچ گئی۔ اس وقت آکلن شیر کیساتھ دو لڑکے اور بھی تھے جن کا تعارف آکلن شیر نے حنا سے سہیل احمد اور عمیر کے طور پر بتایا۔ انکے بارے میں وہ حنا کو پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ دونوں بھی اسامہ علی کے اغواء کے منصوبے میں شامل تھے۔ اس وقت دن کے تین بج رہے تھے۔ آکلن شیر نے حنا کو سارا منصوبہ سمجھایا کہ وہ شام کے وقت کار خراب ہونے کا بہانہ کر کے اسامہ علی کو ایگل ہوٹل کے پاس بلا لے۔ اس کے بعد حنا کو واپس بھیج دیا گیا۔ شام کے ساڑھے چھ بجے وہ پھر سے اسکوٹر پر سوار ہو کر ایگل ہوٹل کے پاس آ پہنچی۔ یہاں آکلن شیر عمیر اور سہیل احمد ایک کار کے پاس کھڑے تھے اور حنا نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسامہ علی کو فون کرنے کو کہا۔ حنا نے فون کرنے کے بعد ان لوگوں کو بتا دیا کہ اسامہ علی آ رہا ہے تب آکلن شیر کار کی پچھلی سیٹ پر لیٹ گیا اور گہرے رنگ کی چادر سے اس نے اپنے آپ کو چھپا لیا۔ اسامہ علی تھوڑی دیر میں ہی وہاں آ پہنچا۔ آتے ہی اس نے حنا کو کال بیک کی اس وقت وہ کار کے نزدیک ہی تھا۔ حنا نے کار سے باہر دیکھتے ہوئے خوشی سے چمکتے ہوئے کہا۔

”اسامہ علی؟“ اسامہ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی، ”میں نے ہی تمہیں فون کیا تھا۔ میں ہی ہوں تمہاری پرانی گرل فرینڈ۔ پہچان لیا نا؟“

اسامہ علی نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”گاڑی میں کیا پرابلم آگئی۔“

”پتہ نہیں چلتے چلتے رک گئی۔ ادھر سے اندر آ کر دیکھو ذرا۔“ حنا نے اسے مدہوش کن نگاہوں سے دیکھا۔ اسامہ علی ایک دم کار کے اندر چلا گیا ابھی اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار کا دروازہ بند ہی کیا تھا کہ پچھلی سیٹ پر لیٹے ہوئے آکلن شیر نے تیزی سے اٹھ کر چادر اس کے منہ پر ڈال دی اور اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیا ساتھ ہی ریوالور اس کی کنپٹی پر نکاتے ہوئے غزایا۔
 ”ذرا بھی آواز نکالی تو بھیجا اڑا دوں گا۔“

اس کے بعد پاس ہی موجود سہیل احمد اور عمیر بھی کار میں چڑھ آئے۔ آکلن شیر نے اس درمیان حنا کو کار سے اتار دیا تھا۔ اب سہیل احمد اور عمیر نے اسامہ علی کو پیچھے کھینچتے ہوئے دبوچ لیا اور آکلن شیر نے آگے جا کر اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ پستول سہیل احمد نے لے لی۔ اسامہ علی کو لے کر یہ لوگ گاؤں خیر پور چلے گئے۔ گاؤں میں آکلن شیر کا فارم ہاؤس تھا وہیں لے جا کر انہوں نے اسامہ علی کو رسیوں سے باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ فرید آباد گاؤں میں سہیل احمد اور آکلن شیر نے ایک مشترکہ کوٹھی بنائی تھی۔ اگلے روز صبح چار بجے یہ لوگ اسامہ کو اسی کوٹھی میں لے گئے۔ علی جاوید سے تاوان کی رقم کے بارے میں فون پر ان لوگوں کی بات چیت ہوتی رہی۔ آخر بات ساٹھ لاکھ پر آ کر ختم ہو گئی۔ پیسہ لیکر شام کو چھ بجے گلستان کالونی گوگیر نہر کے علاقے میں انہیں بلایا گیا تھا مگر موقع پر پہنچ کر علی جاوید نے پیسے بعد میں اور لڑکا پہلے دینے کی بات کہتے ہوئے ان سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ غصے

میں آکر یہ لوگ ان پر گولیاں چلانے لگے تو ادھر سے بھی گولیاں برس پڑیں، آخر وہ لوگ اسامہ علی کو گاڑی سے باہر دھکیل کر گلستان کو لوٹی کی طرف روانہ ہو گئے مگر بعد میں آفلن شیر، سہیل احمد، عمیر اور حنا یہ سارے لوگ پکڑے گئے تھے۔ اب یہ چاروں مجرم جیل کے اندر سزائے قید میں تھے۔

ڈاکٹر حسب معمول اپنا دورہ ختم کر کے چلے گئے تھے۔ میں سیل کے دروازے سے پیٹھ لگائے دیوار پار کر چکے پیٹل کے پیڑ کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھی تھی۔ جون کی تیز دھوپ اس کے ایک ایک پتے میں نظر آرہی تھی۔ وارڈ کی طرف سے شور و غل سنائی پڑا۔ کئی لوگوں کی چلاہٹ پیروں کی چاپ سن کر میں گھبرا گئی اور میرے کھڑے ہونے سے پہلے ہی سیل کے دروازے کے سامنے ایک بھیڑا کٹھی ہو گئی۔ ابھی ایک ساتھ کیا کچھ کہہ رہے تھے۔ صغرا ماں خون اور مار یہ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ تھا غضبناک بشری کیساتھ حدیقہ بھابی بھی وارڈن پر برستی ہوئی آرہی تھی۔ وارڈن نے چابی کی جھنجھناہٹ کیساتھ دروازہ کھول دیا۔ بشری وارڈن کو ڈانٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”کیا ڈاکٹر کو بلوایا ہے تم نے؟ تم جانتی نہیں ہو کہ انکے آنے میں دو گھنٹے لگتے ہیں۔“

”تب تک کیا انسان ایسے ہی پڑا رہے گا؟“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اس لڑکی کی ضمانت میں لیتی ہوں۔ اپنے جیلر سے کہہ دینا کہ بیمار انسان کی دیکھ بھال کرنے کیلئے اگر یہ کچھ پھیلا کر اڑ جائے گی تو ہم کو کوٹھڑی میں بند کر دینا۔“

بڑے لمبے برآمدے کو پار کر کے میں سمجھی کیساتھ جارہی تھی۔ بہت دنوں تک سیل میں بند رہنے کی وجہ سے چلنے میں دشواری آرہی تھی۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ برآمدے کے دوسرے سرے پر ایک بوڑھی کا بھاری جسم فرش پر پڑا ہوا تھا۔ ناک سے خون کی موٹی دھار نکل کر صاف دھلی نالی سے بہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی اسے چیت لٹا دیا اسکے سر اور چہرے پر پانی کی چھینٹے مارے لیکن خون بہتا ہی جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں اندر ہی اندر میں خود کو لاچار محسوس کر رہی تھی۔ نہیں صغرا ماں کہیں نہیں گری۔ صبح سے تو وہ بیٹھی ہی نہیں صبح سے تو کچھڑی تک نہیں کھائی۔ سر دکھ رہا تھا اسلئے آج اس کے حصے کی جھاڑو باغبانی طیبہ نے کر دی کب سے اس کے سر میں تکلیف تھی یہ تو کسی کو معلوم ہی نہیں تھا۔ وہ یوں بھی خاموش طبع تھی۔ صغرا اب بھی ہوش میں تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کروٹ بدل دینے کیلئے کہا تھا پھر تھوک دیا۔ اس میں جما ہوا خون تھا۔ میرے کپڑے میری گود خون سے لت پت ہو رہی تھی۔ پانچ سال تک قید و بند کی صعوبت برداشت کرنے کے بعد بھی اس بوڑھے جسم میں اتنا خون تھا۔ اتنے سارے لوگ مجھ پر آس لگائے ہوئے تھے۔ میں کیا کرتی حالانکہ صغراں میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ اسکے چہرے پہ کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ ڈاکٹر کے آنے کے بعد بھی صغراں میرا ہاتھ پکڑے رہی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہائی بلڈ پریشر مریض کا خون کبھی کبھی اسکی ناک منہ سے نکل کر اسے زندہ رہنے میں مدد کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی یہی کہا تھا۔ پھر میرے چہرے کی طرف دیکھ کر نہ جانے کیا سوچ کر کہا۔

”اگر آپ کو کوئی دشواری نہ ہو تو آج دوپہر ہسپتال وارڈ میں ہی رہ جائیں۔ صغراں کو قریبی غذا پلائیے گا اور دھیان رکھے گا کہ یہ اٹھنے نہ پائے۔ میں آپ کی ریٹ جیلر کو لکھ دیتا ہوں۔ گلے کا دھیان رکھنا بہت ضروری تھا۔“

وہ صحت یاب ہونے لگی تو دل خوشی جھوم اٹھا۔ وہ دوپہر یادگار تھی۔ ہسپتال میں صغراں کے پاس حدیقہ کے علاوہ اور بھی چار لڑکیاں تھیں۔

رومانہ بہت دنوں سے جمع کر کے رکھا ہوا سرسوں کا تیل لے آئی۔ امرت سے بھی زیادہ ذائقہ دار اس سے بھات کو سان کر جیل کوٹھڑی میں ایک مزے دار پکنک منائی گئی تھی۔ وہ سب مجھ سے بہت پہلے جیل میں آئی تھیں۔ صرف ڈھائی گھنٹے کی دوپہر میں ہم لوگوں نے بھرپور ذائقہ لیا۔ صغراں نے تین بجے آنکھیں کھولیں تھوڑا ہنس کر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اتنی ساری باتیں، اتنا ہنسی مذاق کر کے اپنے سیل میں واپس آنے کے بعد صرف ایک ہی بات دماغ میں گھوم رہی تھی صغراں بوڑھی کے تو سارے بال سفید ہو گئے ہیں صرف پانچ سات دانت ہی منہ میں باقی تھے تو پھر اب بھی وہ یہاں کیوں تھی۔ کیا قیدیوں کی کوئی ریٹائرمنٹ نہیں ہوتی؟ کبھی وہ یہاں سے نکلے گی بھی یا نہیں؟

تھوڑے دن بعد کوئل بھی یہی بات کہہ رہی تھی کہ دنیا کے مفکرین اور دانشوروں نے ہمارے معاشرہ اور ہمارے نظام کے بارے میں ہی ماتم کیا اور نووے لکھے حالانکہ ان عالی دماغوں کی بھاری اکثریت نے اس خطے کا نام بھی نہ سنا ہوگا کیونکہ یہ قیام پاکستان سے پہلے کے لوگ تھے جنہوں نے غیر انسانی ظالمانہ اور غیر منصفانہ سماجوں کی تصویر کشی کی جو آج ہماری تصویر دکھائی دیتی ہے۔ دیکھتی جا شرماتی جا۔

کوئل دو چھوٹے چھوٹے اپنے بچوں کیساتھ اپنے محبوب اقبال اور اسکے تین دوستوں ارشد، کامران اور سلیم پر مشتمل کاڈکیتی کے ایک گینگ کی اہم رکن تھی جو ہر خوانی کر کے کاریں ڈکیتی کرتے تھے۔ علاقے بھر میں وہ نہ ہر خواں گروہ کہلاتا تھا۔ کوئل کا شوہر اقبال ایک دن علی نگر میں واقع مکان میں اپنے دوست ارشد کے سامنے منہ لٹکائے بیٹھا تھا وہ چاروں طرف سے مایوس ہو کر پہنچا تھا۔ ارشد بھائی اقبال کے منہ سے کراہی نکلی۔

”اتنی پریشانیوں سے گھرا ہوں کہ ہنسنے کو دل ہی نہیں کرتا۔ چڑھتی جوانی کے جوش میں جو خطائیں کی تھیں انہی کی سزا بھگت رہا ہوں۔ مزے سے اپنے گاؤں میں رہ رہا تھا کہ ماں باپ نے سائرہ سے شادی کر دی۔ بچے ہوئے تو ذمہ داری کا بوجھ کندھے پر آ پڑا تو مجھ سے بیروزگار کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ بہت غور کرنے کے بعد میں نے اپنے حصے کی روٹی لاہور میں تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں بچوں کو سائرہ کیساتھ گاؤں میں چھوڑا اور میں اکیلا یہاں آ گیا۔ مہینوں ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ڈھنگ کی کوئی نوکری نہیں ملی تو شالیمار گارڈن میں موبائل شاپ کھول لی۔ دکان تو کوئی خاص نہیں چلی لیکن پاس ہی رہنے والی نجمہ سے میرا رومانس زور و شور سے چل نکلا۔

”تم شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ ہو یہ جاننے کے باوجود نجمہ تم سے عشق کرنے لگی؟ ارشد نے پوچھا۔

”میں پاگل تھا جو اسے یہ بتاتا۔ نجمہ کنواری تھی اسلئے میں نے بھی اپنے آپ کو کنوارا بتایا تھا۔ میں نے اس سے نکاح کر لیا۔ سوچتا تھا کہ ایک گھر والی رہے گی اور ایک باہر والی۔ میں لاہور اور وہ پھول پورا اپنے گاؤں میں۔ میرے دونوں ہاتھوں میں لذت و ہونگے۔ خیر نجمہ سے بھی دو بچے ہو گئے۔ پہلی بیوی اور بچوں کا خرچ گاؤں بھیجو۔ دوسری بیوی کا خرچ لاہور میں اٹھاؤ۔ اسی چکر میں بربادی کے دھانے پر پہنچ گیا پھر غضب یہ ہوا کہ تیسری بھی میری زندگی میں آ گئی۔“

”تیسری؟ یہ تیسری کون ہے؟“ ارشد کو زوردار جھٹکا لگا۔

”کوئل سلیم کی بیوہ۔۔۔۔۔ وہ یارا اپنی بیٹی کی شادی کر چکی اور تم سے عشق لڑاتی ہے کیا کہنے!“ ارشد نے طنز یہ انداز میں گردن ہلائی۔

”دو بیویوں اور چار بچوں کا خرچ پہلے سے اٹھا رہا تھا۔ ایک محبوبہ اور اسکے بچوں کا خرچ بھی اٹھانا پڑا۔ اس سے میری دکان چوہٹ ہو کر بند ہو

گئی۔ تمام لوگوں سے قرض بھی لے لیا۔ لوگ اپنا پیسہ وصول کرنے کیلئے مجھے گھیرنے لگے تو میں اپنا گلابچا نے کیلئے لاہور چھوڑ کر پھول پور بھاگ گیا۔“

”پھر اتنے عرصے تک کہاں رہے؟“

”رازی کی بات ہے لیکن تم سے کیا چھپانا؟ جیل میں تھا مشکل سے ضمانت پر چھوٹ کر آیا ہوں۔ محنت مشقت کر کے کم وقت میں زیادہ پیسہ نہیں کمایا جاسکتا اسلئے سارہ نے جب مجھے دھککا راتو میں گھر چھوڑ کر دو نمبر کے کسی کام کی تلاش میں نکل پڑا تو اتفاق سے میری ملاقات ثار احمد سے ہو گئی۔ مرزا پور کا ثار احمد پیشے سے زہر خواں تھا۔ اسے ایک ساتھی کی تلاش تھی اور اسے کسی استاد کی اسلئے ان دونوں نے ہاتھ ملا لیا۔“

اسکے بعد وہ لاہور آئے اور ایک ڈرائیور کو دھوکے سے نشلی چائے پلا کر اس کی نئے ماڈل کی ٹیوٹا کرولا کر لے اڑے۔ ڈرائیور پوری طرح سے بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اسلئے اس نے پولیس کو خبر کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انوسٹی گیشن کی ٹیم ان کے پیچھے لگ گئی۔ آخر کار ٹیوٹا کار سمیت وہ دونوں کھتولی میں پکڑے گئے پولیس نے انکے ساتھ وہی سلوک کیا جیسا کسی مجرم کیساتھ کرتی ہے۔ زندگی میں ملے اعتقادات کے تنگ دائروں کو توڑے بغیر سراٹھا کر وہ کیسے دیکھتا کہ آگے کتنا فاصلہ ہے جہاں پناہ مل سکے اسکے بعد ان دونوں کو سینٹرل جیل لاہور بھیج دیا گیا ارشد نے مسکراتے ہوئے اقبال کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

”یار تو چھپا رستم نکلا۔ زہر خواں بن چکا ہے۔ ایک کارلوٹ کر جیل بھی ہو آیا۔ تجھے پیسے چاہئیں اور پیسہ کمانے کا راستہ میں جانتا ہوں مجھے بھی تم جیسے بھروسہ مند آدمی کی ضرورت ہے۔ اچھے دنوں کا انتظار چھوڑ دو۔ حالات سے نبرد آزما ہونا سیکھو موقع ملتا نہیں پیدا کیا جاتا ہے۔ تتلیاں ہر موسم میں پھول ڈھونڈ لیتی ہیں۔ اگر ہم دونوں کے ہاتھ مل جائیں تو لاہور میں ہی نہیں اسکے آس پاس کے اضلاع تک ہم بڑے بڑے گل کھلا سکتے ہیں اور دولت تو ہمارے قدم چومے گی۔“

”ملا لیا ہاتھ۔ لاؤ ملاؤ۔“ اقبال نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ارشد نے ہاتھ ملا لیا۔ اسے زہر خوانی کے ذریعے کار اڑانے کا زیادہ آسان اور سہولت والا کام لگ رہا تھا دھوکے سے نشلی چیز کھلا کر ڈرائیور یا مالک کو بے ہوش کر دیا اور کار لے اڑو۔ ہنگ لگے نہ پھٹک دی رنگ چوکھا آئے۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد زہر خوانی کر کے کار بھگانے کے منصوبہ پر اتفاق ہو گیا۔ زہر خوانی سے کارلوٹ کا یہ کام ارشد صرف اقبال کو ساتھ لے کر نہیں بلکہ بھلا پر اگر وہ بنا کر کرنا چاہتا تھا اسلئے گروہ میں اس نے سب سے پہلے اپنے چھوٹے بھائی بیس سالہ آصف کو شامل کر لیا۔ آصف کی صحبت مجرمانہ ذہنیت کے لوگوں سے تھی اور وہ پہلے سے ہی کار چوری کے دھندے سے وابستہ تھا۔ ایک دن ملتان پولیس نے آصف کو کچھ ساتھیوں سمیت چوری کیساتھ پکڑ لیا۔ چوری کی دفعات کے علاوہ نشے کے تحت بھی اسکا چالان ہو گیا تھا۔ ہفتوں تک لاہور جیل میں رہنے کے بعد وہ حال ہی میں ضمانت پر رہا ہوا تھا۔ ارشد نے بھائی کو ضمانت پر رہا کرایا تو اقبال نے اپنی محبوبہ کو لگروہ میں شامل کر لیا۔ دراصل زہر خوانی کی کامیاب واردات کی پہلی شرط سامنے والے کو متاثر کر کے اعتماد میں لینا ہوتی ہے۔ ایک بار آدمی اعتماد میں آجائے تو اسے آسانی سے دھوکا دیا جاسکتا ہے۔ اجنبی اگر بیوی بچوں والا ہو تو جلدی ہی اسکے اثر میں آکر اعتماد کرنے کی غلطی کر بیٹھتا ہے۔ ارشد اور اقبال کی بھی منشا عورتوں کو گروہ میں شامل کرنے کی تھی تاکہ کامیاب واردات بھی کر سکیں اور فراری کے وقت پولیس کو چکمہ دینے میں بھی کامیاب رہیں۔ تیز طرار کو مل کام کیلئے بالکل مناسب کردار تھی۔ اندر بیٹھے اس شریف انسان کی

کر ہناک جیج کو دھوکا دینے والے ہاتھ نہیں روک سکتے جو اس کے ضمیر کی ہلاکت کا سبب بن رہے ہوں۔

پچیس سالہ کوئل آبائی طور پر سے بھاگت بنگلہ کی رہنے والی تھی۔ لاہور میں اس کے باپ سبزی فروخت کیا کرتے تھے اسلئے وہ اپنے کنبے کو بھی یہیں لے آئے تھے۔ صرف تیرہ سال کی عمر میں کوئل کو سلیم نامی جیب تراش سے پیار ہو گیا تو سلیم سے اس نے نکاح کر لیا۔ سلیم کا ایک پاؤں باہر اور دوسرا جیل میں رہتا تھا۔ سات آٹھ سال قبل بھی وہ جیل میں تھا۔ جب کسی سبب سے اس کی موت ہو گئی شوہر کی موت کے بعد ہی کوئل اقبال کے سائے میں آئی تھی۔ سلیم سے کوئل کو پانچ بچے ہوئے تھے۔ ایک لڑکی شمع اور چار بیٹے شہزاد، آزاد، امیر اور ارمان۔ تقریباً ایک سال قبل کوئل نے اپنی سترہ سالہ بیٹی شمع کا نکاح غازیہ آباد کے باشندے ڈرائیور جابر سے کر دیا۔ بے ہلاک نیم والی مسجد نیو سلیم پور میں واقع کوئل کے گھر جا کر اقبال اس سے ملا اور اسے اپنا منصوبہ سمجھایا تو گردہ میں شامل ہونے کیلئے وہ فوراً تیار ہو گئی۔ طے ہوا کہ واردات کے وقت وہ اپنے دو چھوٹے بیٹوں امیر اور ارمان کو ساتھ رکھے گی تاکہ کسی کو ان لوگوں پر شک نہ ہو۔ کوئل پورے جوش سے اکیلی ہی گردہ میں شامل نہیں ہوئی بلکہ غازیہ آباد کے باشندے پچیس سالہ گڑیا، ستائیس سالہ سونو کو بھی گینگ میں شامل کر لیا۔ اسکے بعد چاند محمد ساکن کھدر والا اسکی بیوی پچیس سالہ فرحانہ غازیہ آباد کی پینتالیس سالہ نفیسہ اور پینتیس سالہ سعدیہ کو بھی شامل کر لیا۔ گردہ بنتے ہی ارشد نے وارداتوں کا تابڑ توڑ سلسلہ شروع کر لیا۔

ایک دن ارشد نے فرضی نام سے مع کنبے نجی سرور جانے کیلئے ملک ٹریول سے سوزو کی کار بک کرائی۔ اس کار کا ڈرائیور لاہور کا رہنے والا حمزہ تھا۔ عورتوں اور بچوں کیساتھ ہونے کے سبب کسی کو ان پر شک نہیں تھا۔ راستے میں وہ لوگ کلیئر ہوٹل میں ٹھہرے۔ اسی رات کو اقبال نے حمزہ کو دھوکا سے نشلی چیز کھلا کر بے ہوش کر دیا اور سوزو کی کار لے اڑے۔ دوسرے دن کیس کی رپورٹ ملک ٹریول ایجنسی کے منتظم چوہدری عزیز احمد نے تھانہ کوٹوالی میں درج کرائی۔ اسی طرح پھر ایک دن مطربہ ڈرائیور ایجنسی سے حضرت سلطان باہو جانے کیلئے ایک کار بک کرائی گئی۔ اسکی بھی سواریاں موٹروے کے ایک ہوٹل میں ٹھہریں اور ڈرائیور کو دھوکا سے بے ہوش کر کے کار سمیت غائب ہو گئے۔ کے ایس چوہدری نے اس واقعہ کی رپورٹ کوٹوالی میں درج کرائی۔ ایک دن منصور احمد نے گجر پور میں اپنی ہنڈائی کار لوٹنے جانے کی رپورٹ تھانہ میں درج کرائی۔ مذکورہ کار گجر پورہ سے الہ آباد جانے کیلئے کرائے پر لی گئی تھی۔ راستے میں اس کی سواریاں کینال ہوٹل میں رکیں اور ڈرائیور کو نشیلا مشروب پلا کر بے ہوش کر دیا۔ ڈرائیور کو جب ہوش آیا تو ہوٹل میں نہ سواریاں تھیں نہ کار۔ ایک دن تھانہ سول لائن میں طاہر اقبال نے رپورٹ درج کرائی کہ وہ شخص لاہور سے نسان کار بک کرا کر شرقی آبادی لے گئے تھے۔ شام کو شرقی آبادی پہنچنے پر وہ لوگ کٹادیہ گیٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ وہیں پران دونوں نے ڈرائیور کو زہر خوانی کا شکار بنایا اور کار لے کر بھاگ گئے۔

لاہور اور آس پاس کے علاقوں میں زہر خوانی کے بعد کار لوٹ کی مسلسل وارداتوں نے ڈی پی اور فیضی حسن کی پیشانی پر شکن ڈال دی۔ انہوں نے پرانے واقعات کا خلاصہ کرنے اور آگے ان وارداتوں پر روک لگانے کیلئے سی آئی اے انسپکٹر محمد زبیر کی قیادت میں ایک ٹیم بنا دی اس ٹیم نے مجرموں تک پہنچنے کیلئے مختلف پہلوؤں تفتیش شروع کر دی۔ معلوم ہوا کہ ہر ایک واردات میں مرد کیساتھ ایک دو عورتیں اور دو بچے بھی شامل تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپس کی بول چال سے وہ جنوبی پنجاب کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ زہر خوانی کی سراغ رسانی کیلئے تفتیشی ٹیم نے مجرموں کا

بھی جال بچھا دیا۔ اس امید کے مطابق نتیجہ بھی جلدی سامنے آ گیا۔ ایک دن منجر نے انسپکٹر محمد زبیر کو اطلاع دی کہ آج شام ساڑھے چھ بجے زہر خواں گروہ کے ممبر آب پارہ کالونی میں واقع پارکنگ میں جمع ہوں گے۔ بس پھر کیا تھا، شام ساڑھے پانچ بجے ہی سادے لباس میں تفتیشی ٹیم کے ممبر آب پارہ کالونی کی پارکنگ اور اسکے ارد گرد مستعدی سے جمع ہو گئے۔ زہر خواںوں کی نشاندہی کرنے کیلئے منجر ساتھ تھا۔ شام ساڑھے چھ بجے سرخ رنگ کی نسان کار اور ایک سفید سوزوکی کار آگے پیچھے پارکنگ میں رکیں۔ نسان کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے ایک نوجوان اور پچھلی سیٹ سے ایک عورت دو بچوں کیساتھ اتری۔ منجر نے انکی شناخت اقبال اور کوئل کے طور پر کر دی دونوں بچے امیر اور ارمان کوئل ہی کے تھے۔ شکار آسانی سے جال میں پھنس جائے اور پولیس کو بھی چمکا دینے میں کامیابی ملے اس لئے کوئل انہیں ساتھ رکھتی تھی۔ ٹیونا کرولا کار کی سیٹ سے اترنے والا نوجوان ارشد تھا۔ اسکے پانچ منٹ بعد ہی سلور کلر کی ہنڈائی کار پارکنگ میں آرکی اور اس میں سے کامران اور سلیم اتر کر ساتھیوں سے مل گئے۔ پولیس نے فوراً حصار بندی کر کے انکو اپنی حراست میں لے لیا۔ زہر خواںی کر کے لوٹی گئی مذکورہ تینوں قیمتی کاروں جن کی بازار میں قیمت ستر لاکھ روپے تھی کو بھی پولیس نے قبضہ میں لے لیا۔ گرفتار ملزمان کو سنٹرل سیٹ کالونی میں واقع انویسٹی گیشن برانچ کے آفس میں جا کر پوچھتا چھ کی گئی تو معلوم ہوا کہ لوٹ کی کاریں فروخت کرنے کیلئے آب پارہ کالونی کی پارکنگ میں وہ کسی پارٹی سے ملنے آئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ چوبیس سالہ کامران چوری کی کاروں کا سوداگر تھا۔ وہ پنجاب کے سرحدی علاقہ کاربنے والا تھا۔ اور متعدد شہروں میں گھوم کر چوری کی کاروں کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ کوئل اپنے کارڈ کیت گینگ کیساتھ اب جیل میں تھی۔

رمضان المبارک قریب تھا روزہ رکھنے والوں کیلئے الگ سے سامان آیا کرے گا اسلئے میٹرن لسٹ بننا ہی تھی کہ کتنے لوگ روزہ رکھیں گے۔ فار یہ بی بی آکر مجھ سے کہہ رہی تھی ماریہ اگر تم بھی روزے کی حامی بھر دو تو ہم لوگ کل ملا کر چھ ہو جائیں گے۔ چھ لوگوں کے روزہ رکھنے سے جیل کی طرف سے نماز اور عبادت کیلئے خاص انتظام ہوگا۔ سحری اور افطاری کیلئے الگ انتظام بھی۔ اس کے علاوہ دودھ، شربت، چینی، کھجور اور فروٹ ملنے کا بھی یقین دلایا گیا تھا۔ قید کے دوران تمام دنوں میں بھی قرآن پاک پڑھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مشتر وقت سوچوں کی سوئی ایک ہی جگہ انکی رہتی تھی کہ ہم اس بری طرح برباد نا کام کیسے ہوئے؟ جب ہم منٹھی بھر تھے تو دنیا ہماری منٹھی میں تھی آج ہم ڈیڑھ ارب ہیں اور اربوں سمیت دنیا کے قدموں میں ہیں تو ایسا کیسے ہو گیا؟ یہ ناممکن۔۔۔ ممکن کیسے ہوا؟ کیا ہم نے نمازیں چھوڑ دیں یا روزے رکھنا ترک کر دیے؟ ہم حج بھول گئے یا عمرے سے منہ موڑ لیا؟ ہر گز نہیں ہماری عبادتیں تو کہیں زیادہ پر جوش ہو گئیں۔ ہماری رقت آمیز دعائیں بھی بہت بڑھ گئیں۔ ہماری تو تمام تر طاقت اور توانائی ظواہر اور دکھاوے کیلئے وقف ہیں۔ کیا آج سے تین سو سال پہلے اتنے شہر اعتکاف سجتے ہوں گے؟ حج اور عمرے ادا کرنے والوں کی تعداد کتنی ہوگی؟ ایسے معطر مذہبی ماحول تو ماضی میں تصور بھی ممکن نہیں۔ تو پھر کیا ہوا کہ اس دنیا میں ہمارا رول، ہمارا کردار ہم سے چھین کر ہمارے حریفوں کے حوالے کر دیا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کردار سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ہم سے دنیا کی امامت و قیادت والا کردار واپس لے لیا گیا کہ بس اب تم اس قابل ہی نہیں رہ گئے کہ دنیا کو لیڈر سکواناؤں کی قیادت کر سکو۔ عبادت قائم رہی قیادت چھن گئی کہ قیادت کا تعلق محض عبادت سے نہیں اعمال اور کردار کیساتھ ہوتا ہے کیا کوئی ناصح کوئی مبلغ کوئی لیڈر کوئی شیخ الاسلام ہمیں اس طرف لے جاسکتا ہے جب غیر مسلم مسلمان تاجروں کی

اور پھل بھی ایسے جو دواؤں کی طرح بچوں کی ہی نہیں۔۔۔۔۔ بڑوں کی پہنچ سے بھی دور ہیں۔ عمر میں ہم سے چھوٹوں کیلئے باعث حیرت ہوگا کہ چند برس پہلے تک تربوز اور خر بوزے وغیرہ ڈنگروں کو ڈالے جاتے تھے یہ ٹھیک ہے کہ انسان بھی انہیں استعمال کرتے تھے لیکن انہیں باقاعدہ پھلوں کا سٹیشن حاصل نہیں تھا زیادہ سے زیادہ انہیں پھلوں کی پیروڈی سمجھا جاسکتا ہے۔ گریڈوں کی زبان میں بات کریں تو یہ سمجھیں کہ یہ گریڈ 8, 9, 10 وغیرہ کے پھل تھے جو آج گریڈ بائیس سے بھی آگے نکل چکے ہیں۔ کبھی چھولیا نام کی ایک چیز ہوتی تھی یہ بھی عموماً جانوروں کو کھلائی جاتی آجکل کوئی شریف آدمی چھولنے کو ہاتھ لگائے تو سنتے ہیں وہ کرنٹ مارتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ یہ لوگ سوچے سمجھے طریقے کے تحت عوام کو بد سے بدتر حالت میں رکھنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہی نہیں کہ اس ملک کے عوام کو آسودہ اور باعزت زندگی نصیب ہو۔

عام طور پر سینٹرل جیل ملتان میں انڈر ٹرائل لڑکیاں نہیں رہتی تھیں۔ ایسا ہو بھی تو انکی تعداد بہت کم تھی۔ پنجاب کی دوری جیلوں کی لائف یا سزایافتہ خواتین قیدیوں کے لیے ہی ملتان جیل کے فیملی وارڈ کی تعمیر کی گئی تھی۔ کافی بڑی جگہ بڑے بڑے پیر سخت بند و بست اور پوری طرح سے بے جان ماحول وہاں کی خاصیت تھی۔ چار دیواری کے اس پار وقت کی رفتار کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہاں وقت ساکن تھا۔ جب کوئی قیدی عورت وہاں سزا پا کر آتی تھی تو شروع شروع میں کچھ دنوں تک زندہ ذی روح ہونے فطری چھٹ پٹا ہٹ اور سانس کا ایک طرح سے مسدود ہو جانا اسے بے چین کر دیتا تھا۔ چودہ برس مہینوں، ہفتوں، دنوں کی بنیاد پر گن کر اسے کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ مردے کی طرح ٹھنڈی پڑ جاتی تھی۔ انسان کی دنیا میں دو چیزیں امید اور کوشش سب سے زیادہ فطری ہوتی ہیں لیکن وہاں ان دو چیزوں کے معاملے میں سب سے زیادہ بے ضابطگی اور عدم توازن جہی دکھائی دیتی تھی وہاں کی ہر گھڑی کی سوئی ملا کر دیکھو تو ہر دن ایک جیسا ہی تھا نہ کوئی مستقبل نہ حال۔ کوئی موسمی تغیر نہیں نہ کوئی سکھ دکھ یا اچھے برے کا احساس وہاں جو انسان جماعت ایک ساتھ کھاتی پیتی، سوتی کام کرتی تھی ان کے لئے یہ ساری چیزیں ماضی کی تھیں۔ اپنے اپنے ماضی میں سب اکیلے ہوتے تھے۔ پچیس برس کے سزایافتہ لوگ جال میں پھنسے جانور کی طرح ہائی کورٹ، سپریم کورٹ سے اپیل کی رائے آنے سے پہلے تک چھٹ پٹا تے تھے اس وقت بھی ناقابل برداشت تناؤ کے دن بتاتے تھے۔ جب ان کی رہائی کا وقت قریب آتا جاتا تھا رہائی ہونے کے ایک سال پہلے سے لائف کی نیند اڑ جاتی تھی۔ چہرے پر گھبراہٹ کی چھایا نظر آن لگتی تھی۔ کم سے کم عورتیں سرے سے زندہ ہو کر اپنے پیچھے چھوڑ آئے خاندان، بچے، رشتے ناٹے، رشتہ داروں کی ان باتوں کو یاد کرتی تھیں جنہیں ان کا من ابھی تک بھولا ہوا تھا۔ اب صبح شام دو گھنٹے کھلا رکھنے کا حکم ہوا تھا۔ لگاتار سر میں درد رہتا تھا۔ عاجز ہو کر ڈاکٹر کی بھونٹیں سکڑتی جا رہی تھیں۔ اس طرح لگاتار بند رہنے سے ایسا ہونا فطری تھا۔ میں نے قریب قریب بستر پکڑ لیا تھا کسی طرح کا کھانا گلے سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ کبیل سے سر نہیں اٹھا سکتی تھی ایک دن شام کو حدیقہ بھابی کافی فکر مند ہو کر بہت ڈانٹ پلا گئی تھی۔

”ڈاکٹر آپ کو الگ سے چار پائی اور بستر دلار ہے تھے آپ نے لیا کیوں نہیں؟“

”سوچا بھی تو زمین پر سوتی ہیں اسلئے مجھے بھی زمین پر سونا اچھا لگتا تھا۔“

”آپ کی پیٹھ میں درد ہے ڈاکٹر کہہ رہے تھے کوئی سہولت نہیں چاہئے تو نہ لیں لیکن ہفتہ کے دن جیلر صاحب نے پوچھا تھا کہ کوئی دشواری

ہے کہ نہیں تب کیوں نہیں کہا کہ آپ مجھے دو گھنٹے کی اور سیل سے باہر نکلنے کی چھوٹ دے دیں۔“

کیوں بھابی وہ پوچھتے کیوں ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ کسی بھی آدمی کو بند رکھنے سے اس کو تکلیف ہوتی ہے میں کیوں یہ سہولت مانگوں۔“

”لیکن لائبریری کی کتاب نہ ملنے پر تو آپ نے جیلر کو ڈانٹ پلائی تھی۔“ بھابی کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا کوئی نہیں تھا ہنسنے پر اور غصے میں آجاتی تھی۔ ڈاکٹر شائد سپرنٹنڈنٹ سے کچھ کہہ رہے تھے بے وقت سارے وارڈ میں دوڑ شروع ہوگئی کہ جیلر آئے۔

”آپ کو کسی قسم کی کوئی دشواری تو نہیں؟“

”آپ کو کیا محسوس ہوتا ہے کسی بھی آدمی کو اس کی آسانی کیلئے چوبیس گھنٹے کال کوٹھڑی میں بند رکھا جاتا ہے؟“

”اگر آپ کو کچھ وقت کیلئے روزانہ کھلا چھوڑ دیا جائے تو آپ بھاگنے کی کوشش تو نہیں کریں گی۔“

”ضرور کروں گی۔ حتی الامکان کوشش کروں گی آپ کے پاس تو جیل پولیس کی ایک فورس موجود ہے ہم پر چوبیس گھنٹے پہرہ رہتا ہے۔“

شروع شروع میں مجھ سے چلا نہیں جاتا تھا لیکن باغیچے میں جا کر گھاس پر بیٹھ سکتی تھی۔ زائدہ بغل میں آکر بیٹھ جاتی تھی۔

”ماریتم پر پہرہ دینے کی ڈیوٹی لگی ہے میری۔“

”کیوں بہن وارڈوں کی کمی آپڑ گئی؟“

”نہیں ماریہ۔“

”ان لوگوں کو تم ڈانٹ پلاتی ہو تم ان کو مارتی ہو لیکن ہمیں نقصان پہنچے تو ایسا کوئی کام نہیں کرو گی۔ اسی لئے مجھے آپ کی ڈیوٹی پر لگایا گیا ہے

خود سے نفرت ہوگئی ہے ماریہ۔“

”کیوں؟ اچھا ہی تو ہے تم لوگوں کیساتھ بیٹھ کر بات چیت تو کر پاؤں گی۔ شباحت کہاں ہے؟“

”وہ رورہی ہے۔“

میں نے شباحت کو بھلا بھیجا۔ تھوڑی دیر میں شباحت آگئی اس کا چہرہ بہت خوبصورت تھا۔ گول منہ لگائے کی آنکھوں جیسی کالی بھیجی پٹی

ہوئی آنکھیں تھیں۔ تقریباً تیس سالہ شباحت کشمور کے تھانہ احمد آباد کے تحت باراسروہی میں رہنے والے فہد علی کی بیوی تھی۔ لگ بھگ سات سال قبل

دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ شوہر کے علاوہ کنبے میں بوڑھا سر محمد امین بھی تھا، محمد امین ریٹائرڈ پولیس کانسٹیبل تھا وہ اکثر بیمار رہتا تھا۔ بیماری کے سبب

محمد امین کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہا تھا اور گھر کے باہر تخت پر بیٹھا رہتا تھا۔ فہد علی جوان تھا تو شباحت حسین تھی اسکے باوجود دونوں میں ایک

بہت بڑا فرق تھا۔ رنگیلی شباحت ہر رات کو رنگین بنانا چاہتی تھی مگر فہد علی کی اس میں دلچسپی نہیں تھی۔ بیوی کے پاس ایک باریٹ کرئی وہ دس پندرہ دن

کیلئے آسودہ ہو جاتا تھا لیکن شباحت کو تو جسمانی تسکین کا چسکا شادی سے پہلے لگ چکا تھا۔ شادی ہوگئی تو شوہر شوقین نہیں ملا۔ شباحت کے جذبات میں

دوسرا فلیٹ یہ لگا کہ چار سال بیت جانے کے باوجود اس کی کوکھ ہری نہیں ہوئی اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ شباحت نے فہد علی کو نامرد مان لیا۔ اس نے یہ بھی سوچ لیا

کہ جسمانی سکھ کیساتھ ساتھ کوکھ بھی ہری کرنا ہے تو فہد علی کے سہارے رہنا بے معنی ہے۔ ان دونوں خواہشات کی تکمیل کیلئے اسے دوسرے کا سہارا لینا ہی

پڑے گا۔ شباحت نے اپنے ارمانوں کے ساتھی کی تلاش شروع کر دی۔ اسے ضرورت تو ایک کی تھی لیکن اس کے طلبگار دس سامنے آ گئے۔

”شہو! ہم بھی تمہارے دیور ہیں خیال رکھنا۔“

محلے کے نوجوانوں نے شباحت کا طواف کرنا شروع کیا تو ڈورے ڈالنے کے بہانے سے اس کے گھر بھی آنے لگے۔ محبت کا سفر بھی عجیب ہے۔ یہ بسا اوقات لاکھوں نوری سالوں کے فاصلے سے آنے والی مردہ ستاروں کی روشنی۔۔۔ اور وسعت کی انتہائی حدود کو چھونے والی زوال پذیر سلطنت کی طرح ہم تک اس وقت پہنچتی ہے۔ جب اسکا جواز باقی نہیں رہتا۔ فہد علی صبح کام پر جاتا تھا تو شام سے پہلے اسکی واپسی نہیں ہوتی تھی۔ بوڑھا محمد امین روکنے ٹوکنے کی حالت میں نہیں رہ گیا تھا۔ محلے کے لڑکوں کو کھلی چھوٹ تھی۔

”جب دل ہوا آؤ جاؤ۔ گھر تمہارا ہے۔“

گھر میں بیٹھ کر فہمی مذاق شروع ہوا تو دیوروں میں سے اپنے مطلب کا ساتھی چننے میں شباحت کو آسانی ہو گئی۔ پہلے اس نے ایک دو کا انتخاب کیا اسکے بعد دوسرے دیوروں کو بھی موقع دینا مناسب سمجھا۔ دیور بھابی آخر ایک دوسرے کے ہی کام آتے ہیں۔ شباحت نے کسی ایک کو بستر کا ساتھی بنانا ہوتا تو شاید یہ بات اتنی نہیں پھیلتی یہاں تو سارے دیور ہی نہال تھے۔ لوگوں نے جب دیکھا کہ کھانا خزانہ لٹ رہا ہے تو جیٹھوں نے بھی اپنا نمبر لگانا شروع کر دیا۔ سال میں ایک مہینہ جیٹھ کا بھی ہوتا ہے۔ اسلئے ہمیں بھی موقع ملنا چاہئے۔ شباحت بڑے دل والی لڑکی تھی۔ جو جیٹھ من کو بھائے موقع ملنے پر انہیں بھی خوش کر دیا۔ شباحت جس طرح محلے میں عوامی باتھ روم تھی اس سے وہ بدبو مارنے لگی اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں رنگیلی شباحت کے رنگیلے کارنامے بحث کا موضوع بن گئے۔ فہد علی کے کانوں میں یہ افواہیں پہنچ رہی تھیں مگر اسے اعتبار نہیں ہو رہا تھا۔ تن کے سکھ کیلئے شباحت اس حد تک گذر سکتی ہے۔ فہد علی کے تصور سے بھی پرے تھا۔ بیوی کو سیدھے سوالوں کے نشانے پر کھڑا کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ فہد علی کا خیال تھا کہ اگر یہ ساری باتیں جھوٹی ہوئیں تو شباحت کے دل پر کیا گزرے گی۔ فہد علی کا خیال تھا کہ کوئی ثبوت باتھ میں ہو تب وہ شباحت کو کٹھنرے میں کھڑا کرے۔ اس رات شباحت نے خود ہی فہد علی کا اپنی رنگینیوں کو ثبوت دے دیا۔ ہوا یہ کہ اس رات شباحت اپنی کمر کی مالش کرانے کے موڈ میں تھی۔ اسی لئے جب سونے کیلئے بیڈ پر لیٹی تو شوہر کے قریب کھسک آئی۔ فہد علی آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔ شباحت نے اسکا ہاتھ ہٹا کر پوچھا۔

”اجی۔۔۔ کیا سو گئے۔۔۔“

”کیا بات ہے۔ کیا جا گئے کا ارادہ ہے؟“ فہد علی نے چونک کر پوچھا تو شباحت نے نشلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”تم جاگو گے تبھی تو میرے بیدار ہوتے ارمانوں کو کنارہ ملے گا۔ پانچ دن ہی تو ہوئے ہیں جب ہم ملے تھے۔ جوانی میں پانچ دن پانچ

مہینوں سے کم نہیں ہوتے۔“

شباحت نے اس سے لپٹتے ہوئے کہا لیکن فہد علی کا بالکل ہی موڈ نہیں تھا۔ شباحت کی بیتابی اور بے حیائی دیکھ کر وہ بھی اس سے لپٹ گیا مگر شباحت تو اسے غیر فطری فعل کیلئے اسے اکسانے لگی۔ اس بات پر دونوں میں تکرار شروع ہوئی اور اس رات فہد علی کو یقین ہو گیا کہ محلے میں شباحت کے بارے میں جو چرچا ہو رہا ہے وہ غلط نہیں تھا۔ اسلئے اس نے بیوی پر پابندی عائد کرنا بے حد ضروری سمجھا۔ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے تم گھر سے باہر نہیں نکلو گی اور گھر میں محلے کے لونڈوں کو جمع نہیں کرو گی۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں اسلئے نہ کوئی تمہارا دیور ہے نہ جیٹھ۔ باہر والوں سے ایسا

کوئی بھی رشتہ قائم نہیں کروگی اگر کسی کو جیٹھ یاد پور بنالیا تو اس سے رشتہ توڑ لو۔ شباحت نے شوہر کی ہدایات ایک کان سے سنیں دوسرے سے نکال دیں۔ کرنی تو اسے اپنے دل کی تھی۔ ایسے شوہروں کی باتوں پر کون عمل کرتی ہے جو اس کی خواہش نہ پوری کرے۔ سرخ گلابوں جیسی خواہش۔۔۔۔۔
- زرد رتوں کے رنگ میں بے رنگ ہوئی۔ چپا کلی کھلانے والی کرن میلے کچیلے بادلوں میں رستہ بھول گئی۔ ہری کچور دھرتی کا ست رنگا خواب۔۔۔۔۔
پرانے صندوق میں رکھا لیر ولیر ہوا۔ کوئی شاہ سے فقیر ہوا کسی کا جیون بے سود ہو گیا۔ کوئی کالی چٹان سے نیلے ساغر میں کود گیا۔ فہد علی بیوی کی سرگرمیوں پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ زبانی سمجھانے کا شباحت پر اثر نہیں ہو رہا ہے تو اس نے لات گھونسوں سے اسے سمجھانا شروع کر دیا اسکا اور بھی الٹا نتیجہ برآمد ہوا۔ شباحت کے دل میں شوہر کا جو تھوڑا بہت ڈرتھا وہ بھی جاتا رہا۔ وہ اپنے دل کی مالک ہو گئی۔ محلے کے یاروں سے اس نے پہلے کی طرح رشتہ استوار کر لیا۔ بے خواب راتوں میں پھولوں کی طرح چٹکتی آہوں کو زمین کی آلودگی سے بچانے کیلئے ستارے اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ کون جانے ان بے شمار چمکتے ستاروں میں کتنی آہوں کی حرارت شامل ہوتی ہے۔ شباحت کے کردار نے فہد علی کو اتنا پریشان کیا کہ اس نے اپنا گھر ہی چھوڑ دیا۔ ایک بارگی وہ گیا تو پھر پلٹ کر نہیں آیا۔

فہد علی کہاں گیا کسی کو معلوم نہیں تھا۔ فہد علی کے جانے سے شباحت کو دکھ ہونے کی بجائے خوشی ہوئی۔ اچھا ہوا کہ راہ کا کاٹنا خود ہی صاف ہو گیا۔ اب وہ اپنے طریقے سے زندگی جی سکتی تھی۔ بوڑھے سر کی اسے پرواہ نہ اسے پہلے تھی نہ اب رہی۔ دہلیز کے کتے کی طرح وہ اسے صبح شام روٹی ڈال دیتی تھی۔ محمد امین سب دیکھتا سمجھتا مگر بہو کے منہ پر لگام ڈالنے میں مجبور تھا۔ بار اسروہی میں شباحت موجود ہے یہ بات دور دور تک پھیل گئی تھی۔ اس لئے نئے نئے جسم استعمال کرنے کا شوق رکھنے والے جوان دور دور سے اس کے پاس آنے لگے پیسے بھینکنا متاثر نہ دیکھو۔ شباحت کے نئے نئے چاہنے والوں میں فتح پور کے کوٹوالی تھا نہ کے تحت یسرن بزرگ گاؤں کے باشندے محمد علی اور اس کا دوست عبداللہ بھی تھے۔ دونوں پیسے والے باپ کے بیٹے تھے اسلئے موج مستی کرنے کشمور تک چلے آتے تھے، چونکہ وہ شباحت کو اس کی امید سے زیادہ پیسے دیتے تھے اسلئے وہ بھی انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتی تھی۔ ان تینوں کا جسمانی تھکون خوب پھل پھول رہا تھا کہ جمشید اعظم ولین بن کر ان کے درمیان آ گیا۔ اکیس سالہ جمشید اعظم نشاط مگر تھا نہ کے تحت سیال پور میں رہنے والے عظیم علی کا بیٹا تھا۔ وہ ٹھینگ موڑ میں کا مائٹر کالج میں گیارہویں کا طالب علم تھا اور اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ والدین جو کافی زمین، جائیداد اور پیسے والے تھے جمشید چڑھتی عمر کا لڑکا تھا۔ کھلائی پلائی چہرے پر چمک رہی تھی۔ جمشید کو دیکھتے ہی شباحت کے تن من میں سنسنی سی ہونے لگتی تھی۔ ابتدا میں تو وہ شباحت کو روپے دیتا تھا بعد میں اس نے وہ بھی بند کر دئے۔ وہ آتا اور مفت میں شباحت کا بدن روند کر چلا جاتا۔ شباحت کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ نہیں تھا اس کا خرچ ہی یاروں کے دئے پیسوں سے چلتا تھا۔ اسلئے اسے یہ بات بہت بری لگتی تھی کہ جمشید بغیر پیسے دئے ہی عیش کر کے چلا جاتا ہے۔ اس بارے میں شباحت کچھ کہتی تو جمشید اسے ہی آنکھیں دکھانے لگتا چونکہ جمشید بنگ اور تیز طرار لڑکا تھا غصہ تو اسکی ناک پر رکھا رہتا تھا۔ کئی بار وہ شباحت کو پیٹ بھی چکا تھا۔ اسلئے وہ اس سے دہشت زدہ رہتی تھی۔ اکثر اوقات ہنستے مسکراتے گرم جوشی سے مل کر رخصت ہونے والوں کے جذبات کی انتہا تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا یہ ذرا وقتار رونے کی کیفیت سے گذر رہے ہوتے ہیں لیکن اس کیفیت کو دیکھنے اور سمجھنے سے ہم قاصر رہ جاتے ہیں۔ ایک دن جمشید شباحت کے گھر آیا تو وہ اپنے کسی پرانے دوست کیساتھ انگریج تھی۔ جمشید کا پارہ آسمان چھونے لگا۔

اسنے اپنے اس رقیب کو گالی گلوچ دے کر بھگا دیا اور اس کے بعد شباحت سے بولا۔

”تمہارے گھر میں ایک آئے ایک جائے یہ مجھے قطعی پسند نہیں ہے سب کا آنا بند کرو اور ہاں وہ فتح پور کے دولونڈے بھی تمہارے گھر میں بہت گھسے رہتے ہیں کیا نام ہیں ان کے؟“

”محمد علی اور عبداللہ۔“ شباحت نے ڈرتے سمجھتے ہوئے ان کے نام بتائے۔

”ہاں ان دونوں کی بھی چھٹی کرو۔“

”اگر میں ان سب کو بھگا دوں گی تو کھاؤں گی کیا میرا خرچہ کیسے چلے گا۔“

”اس کیلئے میں ہوں نا۔ میں تمہارے سارے اخراجات پورے کروں گا۔“ جمشید نے فخر سے چھاتی پھیلائی۔

”میری قسم کھاؤ۔“

”تمہاری قسم۔“

شباحت نے کچھ دنوں تک کسی نئے پرانے عاشق کو پاس بھٹکنے نہیں دیا تو جمشید شباحت کے اس رویہ پر خوش ہوا مگر اس نے اسے بھرپور پیسہ نہیں دیا۔ دو تین سو روپے دے کر ہی وہ اپنے فرائض کی ادائیگی سمجھ لیتا تھا۔ شباحت کیلئے یہ پیسہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھا۔ اسلئے اس نے پھر سے اپنے دوستوں سے ملنا شروع کر دیا۔ جمشید کو اس کا علم ہو پاتا اس سے پہلے ہی اس کی لاش ایک کنویں میں پڑی پائی گئی۔ ہوا یوں کہ ایک دن دو پہر کے وقت جمشید کہیں جانے کیلئے گھر سے نکلا تھا۔ دوسری صبح تک وہ گھر نہیں لوٹا تو اس کے باپ اعظم علی کو تشویش ہونے لگی۔ انکا سب سے پہلا شک گاؤں کے عزیز اللہ پر گیا۔ دراصل حال ہی میں ہوئے جنرل ایکشن کیلئے عزیز اللہ امیدوار تھے مگر اعظم علی نے ایک دوسرے نمائندے فرید احمد کی حمایت کی تھی اس وجہ سے انکی عزیز اللہ سے رنجش ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے شک و تہی وہ تھانہ نشاط نگر جا پہنچے۔ عروسہ بیگم بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ تھانہ کے ہیڈ محرر فیصل الرحمن سے انہیں معلوم ہوا کہ صدر تھانہ کے تحت کھٹارا گاؤں کے باہر ایک کنویں میں بیس بائیس سال کے نوجوان کی لاوارث لاش پائی گئی ہے۔ نشاط نگر پولیس کیساتھ عروسہ بیگم اور اعظم علی کھٹارا گاؤں پہنچے تو پولیس اپنی کارروائی کر رہی تھی۔ لاش دیکھتے ہی عروسہ بیگم پچھاڑ کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ یہ لاش جمشید ہی کی تھی۔ اسی دن عروسہ بیگم نے تھانہ نشاط نگر میں رپورٹ درج کرا دی۔ اپنی اس رپورٹ میں اس نے عزیز اللہ، عدیل احمد اور محمد یسین کو نامزد کیا تھا۔ مقدمہ قائم ہوتے ہی پولیس نے ملزمان کی تلاش میں ان کے گھروں پر دستک دی تو وہ سب فرار ملے لیکن کچھ دنوں بعد عدیل احمد پولیس کی گرفت میں آ گیا۔ تفتیش میں چلا چلا کر وہ کہتا رہا جمشید کے قتل میں اسکا یا دوسرے نامزدوں کا ہاتھ نہیں ہے مگر اسکی آواز نثار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔ پولیس نے اسکی ایک نہ سنی اور اسے عدالت میں پیش کرتے ہوئے جیل بھیج دیا پھر دن پہ دن گزرتے گئے مگر دیگر ملزموں کا کوئی سراغ ملا۔ نہ مقتول کا موبائل ہی برآمد ہوا۔ پولیس کی کوششوں سے اور جدید تکنیک کی مدد سے اسے معلوم ہو گیا کہ جمشید کا موبائل فتح پور میں استعمال ہو رہا ہے اور اسے محمد علی نامی شخص استعمال کر رہا ہے پولیس نے اسی دوران محمد علی کو گرفتار کر لیا۔ عبداللہ بھی محمد علی کیساتھ تھا اسے بھی پوچھنا چھ کیلئے حراست میں لے لیا گیا۔ پوچھنا چھ میں معلوم ہوا کہ جمشید کا قتل عزیز اللہ اور انکے ساتھیوں نے نہیں بلکہ محمد علی اور

عبداللہ نے شباحت کے کہنے پر کیا تھا۔ جمشید کا قتل شباحت پر قبضہ برقرار رکھنے کا نتیجہ تھا۔ جمشید چاہتا تھا کہ وہ اپنی ذہنی طاقت پر شباحت کو صرف اپنی بنا کر رکھ سکے۔ اس کے برعکس محمد علی اور عبداللہ شباحت پر اپنا حق جتانے کیلئے شباحت پر دونوں ہاتھوں سے روپے لٹا رہے تھے۔ شباحت بھی محمد علی اور عبداللہ کے حق میں ہی تھی اور دونوں کو جمشید کے خلاف بھڑکاتی رہتی تھی۔

”سنو آج جمشید آیا ہے۔ وہ اپنی کمر میں آٹھ انچ کا خنجر گھونسنے ہوئے تھا خنجر کا چمچتا پھل دیکھ کر میں تو ڈر ہی گئی تھی۔۔۔ کہہ رہا تھا کہ یہ خنجر تمہارے لئے نہیں ہے بلکہ محمد علی اور عبداللہ کیلئے ہے۔ ان دونوں نے یہاں آنا نہیں چھوڑا تو میں ان کی جان لے لوں گا۔“

محمد علی اور عبداللہ کا یقین تھا کہ جمشید جو کہتا ہے وہ کر بھی سکتا ہے اور وہ ہی انہیں مارے اس سے پہلے ان دونوں نے اسے مارنے کا منصوبہ بنالیا۔ محمد علی کی ایک بہن کھنار گاؤں کے محمد انیس کو بیابھی گئی تھی۔ حال ہی محمد انیس جنرل انکیشن جیتا تھا۔ اس موقع پر اس نے ایک دن شام کو اپنے گھر پر اجتماعی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ جمشید کا قتل کرنے کا محمد علی کو یہ سنہرا موقع لگا۔ اس نے فون کر کے جمشید کو بھی مدعو کر لیا۔ دعوت کے لالچ میں جمشید کھنار گاؤں پہنچ گیا۔ محمد علی اور عبداللہ اسے گاؤں کے باہر دیسی شراب کے اڈے پر لے گئے اور بوتل خرید کر ایک کھیت میں پینے بیٹھ گئے۔ جمشید پر شراب کا نشہ چڑھنے لگا تو اس کا فائدہ اٹھا کر محمد علی نے اسکے گلاس میں ایک مہلک جراثیم کش دوا گھول دی بس اسکے پانچ سات منٹ بعد ہی زہر نے اثر دکھانا شروع کر دیا۔ جمشید یہاں کا تھاں گر گیا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس نے دم توڑ دیا۔ یہاں وہ تینوں بیٹھے شراب پی رہے تھے وہیں قریب ایک کنواں تھا وہاں ایک سی بھی پڑی تھی۔ محمد علی اور عبداللہ نے لاش کی جیسیں خالی کر کے لاش کو سی سے باندھ کر کنویں میں ڈال دیا اور اس کے بعد وہ دونوں کھنار لوٹ گئے تھے۔ جمشید کا موبائل فون محمد علی نے رکھ لیا تھا اور وہ دھڑلے سے اسکا استعمال کر رہا تھا اسے کیا پتہ تھا کہ فون کا استعمال کرنا ہی اسکے گلے کا پھندا بن جائے گا۔

اب ان دونوں ملزمان کیساتھ شباحت بھی جیل میں تھی کیونکہ جمشید کے قتل میں شباحت کا ہم مشورہ ہونا ثابت ہو گیا تھا۔ علاقہ معززین نے بھی تفتیش میں اس بات کی گواہی دی تھی کہ جمشید کا قتل شباحت کے کہنے پر ہی کیا گیا تھا۔

تھوڑا تھوڑا کر کے چل پار ہی تھی۔ حدیقہ بھابی نے کسی سپاہی سے کہہ کر جیل کے بڑے چو کے سے ایک مٹھی دھنیا منگوا کر باغیچے میں ڈال دیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پودوں کی یادوں سے بھری خوشبو سے اچانک تصویر کی طرح باہر کی پوری دنیا نظر کے سامنے گھوم گئی۔ سچ حدیقہ بھابی ناممکن کو ممکن کر سکتی تھی۔ جیل کے سوپر بھی اس کی بات کو اہمیت دیتے تھے۔ اتنا شخصیت سے بھرپور چہرہ آواز، بات کرنے کا انداز جیسے حکم دینے کیلئے ہی وہ بنی تھی۔ حدیقہ نے اولاد پانے کیلئے اپنے تین ساتھیوں سے مل کر ایک بچے کو قتل کر دیا تھا۔ یہ قتل ایک ڈھونگی پیر کے کہنے پر ہوا تھا۔

ایک دن شام کا وقت تھا۔ حدیقہ اور فائق احمد گھر میں ہی کسی کام میں مصروف تھے تبھی گاؤں کا ایک شخص گھبرایا ہوا اور ہاپتا کا پتا ان کے دروازے پر پہنچا اسکے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ فائق احمد سے بولا۔

”وہ۔۔۔۔ وہاں قمر اقبال کے کھیت میں۔۔۔۔“ اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکلے تو فائق احمد جلدی سے بولا

”ہاں کیا ہوا قمر اقبال کے کھیت میں۔۔۔“

”آپ دونوں جلدی قمر اقبال کے کھیت میں چلیں، وہاں سلیمان کی لاش پڑی ہے۔“

فائق احمد اور حدیقہ کے کلیجے منہ کو آگے۔ دونوں جس حالت میں تھے اسی حالت میں کھیت کی طرف دوڑ پڑے۔ ان کے قدم وہیں پہنچ کر ہی تھے جہاں معصوم سلیمان کی لاش پڑی تھی۔ کسی نے بے حد بے رحمی سے اس کا قتل کر دیا تھا۔ اس کا گردن سے کٹا ہوا دھڑا لگ پڑا ہوا تھا اور کٹی ہوئی گردن اوئدھے منہ لگ پڑی تھی۔ لاش کی حالت دیکھ کر انسان کیا شیطان کا بھی کلیجہ کانپ جاتا۔ کسی نے قتل کی اطلاع تھانہ شالیمار کو دے دی تھی۔ اطلاع پا کر تھانہ انچارج ہارون ہاشم اپنے ماتحتوں کے ساتھ موقع پر آ پہنچے۔ لاش کا ملاحظہ موقع کرنے کے بعد ہارون ہاشم شیخ نامہ بنا کر لاش کو پوسٹ مارٹم کیلئے ہسپتال بھیج دیا۔ پولیس نے موقع واردات سے برآمد ہوئی، خون آلود درانتی بھی ضبط کر لی، جو لاش کے قریب ہی پڑی تھی۔ حالانکہ اس وقت حدیقہ اور فائق احمد دونوں ہی بیان دینے کی حالت میں نہیں تھے۔ لیکن پولیس کی مجبوری تھی اسلئے دونوں کو دلا سہ دیتے ہوئے ہارون ہاشم نے ان سے پوچھ تاچھ کی۔ فائق احمد کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اس نے کسی پر شک ظاہر نہیں کیا لیکن حدیقہ سے پوچھ تاچھ ہوئی تو وہ بول پڑی۔

”یہ کام ضرور میرے چچا زاد بھائی اسامہ احمد نے کیا ہے۔ وہی سلیمان کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کھیت سے چارہ لانے۔“ یہ کہہ کر وہ زارو قطار رونے لگی۔ بہر حال تھانہ لوٹ کر پولیس نے فائق احمد کی تحریر پر مقدمہ درج کر لیا۔ ہارون ہاشم نے معاملے کی اطلاع اپنے اعلیٰ افسران کو دے دی تھی اور ہدایت پا کر تفتیش شروع کر دی تھی۔

سب سے پہلے حدیقہ کے بیان کی تصدیق کیلئے پولیس نے اسامہ احمد کو تھانہ بلا لیا۔ تھانے میں اسامہ احمد سے پوچھ تاچھ کی گئی تو اس نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”جناب ایسا گھناؤنا کام کرنے کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ حدیقہ مجھ سے رنجش رکھتی ہے۔ شاید اسی لئے اس نے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔“ اسامہ احمد نے پھر یہ بھی بتایا کہ اس روز وہ نہ تو سلیمان کو اپنے ساتھ کہیں لے گیا تھا اور نہ ہی حدیقہ کے گھر گیا تھا۔ اسامہ احمد اور حدیقہ کے بیان اختلافی تھے۔ اسامہ احمد سے پوچھ تاچھ کرنے کے بعد جب ہارون ہاشم کو یقین ہو گیا کہ اسامہ احمد سچ بول رہا ہے تو انہوں نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ اگلے روز لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آ گئی۔ پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹروں نے بتایا کہ قتل دھاری دار ہتھیار سے گردن کاٹ کر کیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ایک چونکا دینے والی بات یہ لکھی تھی کہ سلیمان کی گردن کے پیچھے کی طرف سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر نکالا گیا تھا۔ رپورٹ میں قابل ذکر یہ سچ بتایا گیا تھا کہ ضرور سلیمان کی قربانی دی گئی تھی۔ یہ کام کسی شیطان کا ہی ہو سکتا ہے۔ ہارون ہاشم نے اپنے مجبوروں کا سہارا لیا۔ گاؤں اور اس کے آس پاس جتنے بھی ڈھونگی پیر تھے پولیس نے اپنے مجبوروں کی معرفت ان سب کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا شروع کر دی۔ پولیس کی یہ ترکیب کام کر گئی۔ ایک مجبر سے ہارون ہاشم کو کئی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ انہی معلومات کی بنیاد پر پولیس نے گاؤں برنالہ کے ڈھونگی پیر فضل الرحمن کو گرفتار کر لیا۔ فضل الرحمن کی گرفتاری کیساتھ ہی ہارون ہاشم نے حدیقہ کو بھی پوچھ تاچھ کیلئے تھانہ بلا لیا۔ تھانے میں پوچھ تاچھ کا جو سلسلہ شروع ہوا تو اس بے رحمانہ قتل کی گتھی سلجھتی چلی گئی پھر جو سچ سامنے آیا اسے سن کر پولیس بھی بھونچکی رہ گئی۔

علی پور کے تھانہ شالیمار کے تحت گاؤں رسول پورہ ہے۔ فائق احمد اپنے کنبہ کیساتھ اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ اپنے نام کی طرح سیدھا سادا

تھا فائق احمد۔ نہ کسی سے دوستی نہ کسی سے دشمنی اپنے کام سے کام رکھنے والا پڑھ لکھ کر فائق احمد اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ گھر والوں نے اسکی شادی کر دی تھی۔ فائق احمد اور رابعہ دونوں ایک دوسرے کو پا کر خوش تھے۔ انکی خوشی اس وقت اور دو بالا ہو گئی جب رابعہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ بزرگوں نے اسکا نام سلیمان رکھا۔ سلیمان ابھی چھوٹا ہی تھا کہ رابعہ اچانک بیمار ہو گئی۔ فائق احمد نے بیوی کا ہر ممکن علاج کرایا لیکن رابعہ کی حالت سنبھلنے کی بجائے بگڑتی چلی گئی اور اس کی موت ہو گئی۔ ابھی فائق احمد سلیمان کا بھرپور خیال رکھتا تھا مگر ایک بچے کی پرورش ماں ہی بہتر طریقہ سے کر سکتی ہے لہذا گھر والوں نے فائق احمد کو دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سلیمان کیلئے سوتیلی ماں لائے مگر گھر والوں عزیزوں اور رشتہ داروں کے دباؤ میں مجبور اُتیار ہو گیا۔ حدیقہ بھی فائق احمد جیسے حالات سے گزر رہی تھی۔ فائق احمد کی طرح حدیقہ کی بھی پہلی شادی ہو چکی تھی لیکن کسی وجہ سے شوہر سے نبھ نہ سکی تو وہ اسے چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے گھر آ گئی تھی بعد میں اسے طلاق مل گئی تھی اسلئے گھر والوں کو یہ رشتہ ٹھیک لگا تو انہوں نے حدیقہ اور فائق احمد کی ملاقات کرادی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا تو انکی شادی کر دی گئی۔ گوکہ انہیں نے کوئی لافانی کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا۔۔۔ لیکن جس طرح بہت تیز دوڑنے والے اپنے ہی زور میں حد اختتام سے بھی آگے نکل جاتے ہیں اسی طرح انکا سفر موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ آنے والے کئی سال انکی یادوں کے زیر سایہ رہے تھے

شادی کے بعد حدیقہ سلیمان کا اپنی ہی اولاد کی طرح خیال رکھنے لگی اور گھر گریہستی کی دیگر ذمہ داریاں بھی اس نے خوش اسلوبی سے سنبھال لیں۔ وقت گزرنے لگا حدیقہ اور فائق احمد کی شادی کو کئی سال گزر گئے۔ سلیمان اب تک دس سال کا ہو چکا تھا اور گاؤں کے ایک سکول میں پڑھتا تھا لیکن حدیقہ ابھی تک ماں نہیں بن سکی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ حدیقہ کے پاؤں بھاری نہیں ہوئے تھے۔ ایک بار نہیں حدیقہ چھ بار حمل سے ہوئی لیکن بد قسمتی سے چھ بار ہی اس کی اولاد جنم لینے سے پہلے ہی موت کے اندھیروں میں کھو گئی۔ اس سے حدیقہ کے دل میں مایوسی پیدا ہو گئی اور وہ چڑچڑی ہو گئی۔ اسکے ساتھ حدیقہ کو یہ بھی لگنے لگا کہ اس کے ماں نہ بن پانے کا سبب کوئی بری بلا ہے۔ حدیقہ کی یہ مایوسی اور اداسی اسکے یہاں اکثر آنے والے بھانجے پرنس سے بھی نہیں چھپی تھی۔ پرنس قصبے کی ہی الائیڈ کالونی میں رہتا تھا اور ٹوٹے ٹوٹے میں اعتماد رکھنے والا نوجوان تھا۔ اس نے ایک دن حدیقہ سے کہا۔

”میں ایک ایسے نوجوان کو جانتا ہوں جس کیلئے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ وہ بہت پہنچا ہوا پیر ہے۔ اسکے جادو کے علم کے کئی کرشمے تو میں بھی خود دیکھ چکا ہوں۔ وہ چاہے تو تمہاری سونی گود ہری ہو سکتی ہے اسکا نام فضل الرحمن ہے اور وہ پاس ہی کے گاؤں برنالہ میں رہتا ہے۔“

ایک دن حدیقہ گھر والوں کو بغیر بتائے پرنس کیساتھ برنالہ جا پہنچی کہ کسی کو شک نہ ہو اسلئے حدیقہ سلیمان کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ فضل الرحمن کے گھر لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ پیر باری باری سب کے مسئلے سن رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں حدیقہ کا نمبر بھی آ گیا۔ پرنس نے حدیقہ کا تعارف کرا کے اسکا مسئلہ فضل الرحمن کو بتایا۔ پیر نے بیڑی کا کش لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور جب آنکھیں کھولیں تو ان میں انکارے دھبہ رہے تھے۔

”تیرا دشمن چاہتا ہی نہیں کہ تو ماں بنے۔ اس نے تیری کوکھ کیل رکھی ہے۔ تم ماں بن سکتی ہو مگر اس کے لئے ترکیب کرنا ہوگی۔“

”بتائے پیر جی۔ میں اسکے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔“

”ترکیب ذرا مشکل ہے۔“ فضل الرحمن بولا ”تمہیں ایک بچے کی قربانی دے کر گردن کا گوشت کا ٹکڑا لانا ہوگا۔ وہ ٹکڑا میں اس بلا کو کھلا دوں گا جو تمہاری کوکھ کے بچے کھا رہی ہے تبھی تم ماں بن سکو گی۔“

ترکیب سن کر حدیقہ کے ہوش اڑ گئے۔

”لیکن قربانی کیلئے بچہ کہاں سے لاؤں؟“

”تو پھر بھول جا کہ تو ماں بن سکتی ہے۔“

ماں بننے کی طمع میں حدیقہ اس قدر اندھی ہو گئی تھی کہ وہ اپنے سکھ کی خاطر کسی دوسری ماں کی گودا جاڑنے کیلئے تیار ہو گئی۔ پیر نے سلیمان کی طرف اشارہ کیا تو حدیقہ لرز گئی۔

”یہ تو میرا سوتلا بیٹا ہے۔ میرے شوہر کی پہلی اولاد ہے۔“

حدیقہ کو اکساتے ہوئے فضل الرحمن بولا۔

”تو کیا ہوا؟ اگر اپنی کوکھ سے بچہ پانا چاہتی ہے تو تجھے یہ قربانی دینی ہی ہوگی۔ تیری اولاد کے آگے سے کاٹنا بھی تو ہٹ جائے گا۔“

بس فضل الرحمن کی یہ شیطانی بات حدیقہ کے دماغ میں بیٹھ گئی۔ واپسی میں راستے میں اس نے پرنس سے مشورہ کیا۔

”پرنس کیا ایسا کرنا ٹھیک ہوگا۔ میں ایک بیٹا کھو کر اپنا بیٹا پاسکوں گی؟“

پرنس نے بھی حدیقہ کو اکساتے ہوئے کہا

”اگر فضل الرحمن نے کہہ دیا تو مامی آپ کی ماں بن جاؤ گی۔ پھر سلیمان کو نسی تمہاری اولاد ہے۔“

پرنس نے خود غرضی کی بساط بچھاتے ہوئے کہا۔ اصل میں اسے ایک جادوئی عمل کیلئے انسانی خون کی ضرورت تھی اس لئے وہ بھی چاہتا تھا

کہ حدیقہ سلیمان کی قربانی دے دے تو اسے بھی انسانی خون مل جائے گا۔ حدیقہ ابھی شش و پنج میں تھی کہ اسکے کانوں میں بھنک پڑی کہ فائق احمد

اسے بانجھ سمجھ کر تیسری شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے تو وہ پاگل ہو گئی اور اس نے اپنی گود ہری کرنے کیلئے سلیمان کی قربانی دینے کا فیصلہ کر

لیا اور پرنس کو بھی اس کام میں شامل کر لیا۔ یہ کام جو انتہائی مشکل تھا۔ پرنس نے اس کیلئے اپنے ایک دوست نور احمد کو بھی لالچ دے کر اپنے اس

منصوبے میں شریک کر لیا۔

ایک دن سلیمان سکول سے لوٹا تو حدیقہ، پرنس و نور احمد اسے کھیت میں چارہ لانے کے بہانے اپنے ساتھ لے گئے۔ قمر اقبال کے گئے

کے کھیت میں پہنچ کر حدیقہ نے اسے درانتی دے کر چارہ کاٹنے کیلئے کہا۔ سلیمان چارہ کاٹنے میں مصروف ہو گیا تو پرنس نے کلہاڑی کا ایک زوردار وار

اس کی گردن پر کر دیا۔ وارا تناز بردست تھا کہ سلیمان بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔ تینوں نے اسکی گردن کاٹ کر دھڑ سے الگ کر دی اور اسکی گردن کے

پیچھے سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر نکال لیا اسکے بعد درانتی وہیں چھوڑ کر وہ تینوں وہاں سے چل دئے۔ پرنس اور نور احمد گوشت کا ٹکڑا ایک تھیلی میں فضل

الرحمن کو دینے کیلئے چلے گئے جبکہ حدیقہ گھر لوٹ آئی۔ لاش برآمد ہونے پر حدیقہ نے نقلی آنسو بہائے اور پولیس کی تفتیش بھٹکانے کیلئے اپنے چچا زاد

بھائی کا نام لے دیا۔ فضل الرحمن کا بیان درج کرنے کے بعد پولیس نے حدیقہ، پرنس، نور احمد اور ڈھونگی پیر فضل الرحمن کو گرفتار کر لیا۔ حدیقہ نے ماں اور متا جیسے لفظوں کو شرمسار کیا تھا گاؤں والے حدیقہ کو اسکے کئے کی سزا دینا چاہتے تھے۔ حدیقہ کے اس گھناؤنے جرم سے اس کے گھر والوں کو اتنا صدمہ تھا کہ ان لوگوں نے آج تک حدیقہ کی شکل دیکھنا تک مناسب نہیں سمجھا۔ اس مقدمہ کے فیصلہ میں نور احمد، پرنس اور ڈھونگی پیر فضل الرحمن کو سزائے موت اور حدیقہ کو عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔ قریب قریب دو سال حدیقہ نے کسی سے بات چیت نہیں کی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ زندگی چلتی رہی جیل کی بلند و بالا دیواریں بھی اسے باندھ کر نہیں رکھ سکیں۔ تیرہ برس بیت گئے اب حدیقہ اردو انگریزی پڑھ سکتی تھی۔ عجیب اردو، انگریزی ملی ہوئی پنجابی بول سکتی تھی۔ ہنستی مسکراتی تھی۔ نئے وارڈنوں کو وہ قانون سکھاتی تھی۔ ناشائستہ زبان میں وہ گالی بھی دے دیتی تھی۔

دوبنہر میں جانے کیلئے برآمدے کی دیوار توڑ کر دروازہ بنایا جا رہا تھا۔ ہفتے بھر سے ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ایک دن سامنے تین مزدور شاہ، کدال کڑا ہی لئے سیل کے باغیچے سے ہوتے ہوئے آرہے تھے۔ یہ لوگ قیدی نہیں تھے باہر سے لائے گئے مزدور تھے انہوں نے لنگی اور کرتے پہن رکھے تھے۔ انکے پیچھے ایک جمعدار تھا۔ انکو کام کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے باہر کے ان لوگوں کی یاد آرہی تھی۔ جنہیں ہم یاد نہیں کرنا چاہتے تھے جو دن بھر مشقت کے بعد کسی دن تھکے ہارے گھر لوٹتے تھے پھر آنگن میں بیٹھ کے سب لوگ باتیں کرتے تھے۔ رات کو سوتے ہوئے بھی سب لوگ ہشیار ہوتے تھے کہ کہیں رات کو کوئی چور گھر میں نہ گھس آئے یہ لوگ جو آج کام کرنے کیلئے آئے تھے۔ انہی بھلے مانسوں میں سے یہ تین بھی تھے اور جو سیل میں بند تھے ان کی بھی اکثریت اسی شہر سے تھی۔ گاؤں کے عام جان پہچان والے فطری انداز میں ملاقات ہونے پر سب ایک دوسرے کا حال پوچھتے تھے۔ دو مٹھی بھنے چنے دیتے ممکن ہوتا تو دو پہر کو کھانا بھی کھلاتے تھے۔ دیواروں نے آدمی کیسا تھکا آدمی کے رشتے کو کس حد تک ختم کر دیا تھا۔ جمعدار کی طرف جب شاہت بھات کی تھالی بڑھا رہی تھی تب ملتی آواز میں پوچھا

”وہ بھوکے ہی کام کر رہے ہیں اور ہم لوگ اتنی ساری لڑکیاں انکے سامنے کھانا کیسے کھائیں؟“

ہم سبھی نے تھوڑا تھوڑا سالن اور روٹیاں اپنے حصے کی ان مزدوروں کو دے دیں۔ عورتیں بہت خوش ہوئیں کہ ایک کام تو انہیں گھر کی طرح کرنے کو ملا تھا جیل کی زندگی نے یہ سب سوچنے کی ہمت ہی چھین لی تھی جن کے بچے تھے انکو چھوڑ کر دوسری سبھی عورتوں نے ملکر اپنے اپنے حصے کا جتنا کھانا دیا وہ ان تینوں مزدوروں کیلئے کھا کر ختم کرنا بہت مشکل کام تھا۔ جمعدار اپنی مونچھیں ایسے اینٹھ رہا تھا جیسے ان کے لئے کھانے کا انتظام اپنے بوتے پر جیل سے ہی کرایا ہو۔

صبح ایک گھنٹہ میری واک کیلئے مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس دن میں باغیچے میں ٹہل رہی تھی ایک لیچران بچوں کو پڑھانے آئی تھی جو قیدی عورتوں کیساتھ آئے ہوئے تھے۔ ان بچوں نے ملی تو دیکھی تھی لیکن کتابھی نہیں دیکھا تھا۔ زینب خاتون تین برس کی سزا ختم کر کے گھر جانے سے سات دن پہلے ایک شام اپنے تین برس کے بیٹے کی پیٹھ پر ایک زوردار دوہڑا جڑ دیا۔

”کیا بات ہے زینب؟ کیوں مار رہی ہو اسے؟“

زینب بھیں بھیں کر کے رو پڑی اور کہا۔

”دیکھو ناماریہ کیا بدشگون بول رہا ہے یہ لڑکا، پوچھ رہا ہے کہ ماں وارڈن کیساتھ نہ جانے سے ہمیں گھر میں لاک اپ کون کرے گا۔“ دونوں نیچر بڑی اچھی تھیں۔ بڑی نیچر گوری لمبی، خون سے عاری چہرہ کبھی مجھ سے بات کرنے کا خطرہ مول نہیں لیتی تھی لیکن کبھی آنکھیں مل جانے پر ناپسندیدگی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چھوٹی والی اریہ جہاں کافی زندہ مزاج کی لڑکی تھی۔ کبھی کبھی سلاخوں کے پاس رک کر تھوڑی گپیں لڑا کر جانے کے بعد یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی تھی کہ انکا انتظام تھوڑا ناقص تھا۔ جہاں تک ایک آدھ بار روزنامہ جنگ بھی پڑھنے کو دے دیتی تھیں۔ وہ صبح ایک بار بچوں کو پڑھا جاتی تھی پھر دو بجے آتی تھی۔ بچے کہاں تک کیا سیکھتے تھے کچھ معلوم نہیں لیکن انکا ملی جلی آواز میں یہ کہنا۔

سچ کہوں گا سچائی کے راستہ پر چلوں گا۔

وطن کا ہو کر لڑوں گا۔

پاکستان زندہ باد۔

یہ فقرے سن کر میں سمجھ جاتی تھی کہ تین بچ گئے ہیں۔ کل ملا کر دونوں عورتوں کا بچوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ ایک بہت بڑا المیہ تعلیم اور تعلیمی اقدار کا زوال ہے۔ بوسیدگی، قدامت اور بنجر پن آسب کی طرح ہماری درس گاہوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ درس گاہیں جن کا مقصد علم و دانش کی تابندگی کی ترتیب ہے اس وقت جہالت کا اندھیرا پھیلانے کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ تعلیم اور تعلیمی اقدار کا زوال ایک ہمہ گیر معاشرتی زوال کی شہادت دے رہا ہے۔ ہماری درس گاہوں کا رابطہ اس وقت معاشرتی زندگی اور تخلیقی زندگی، رجحانات دونوں سے ٹوٹا ہوا ہے۔ نتیجہ انتشار، آپ دھڑاپی، تنظیمی سازشوں کے سلسلے، جھوٹ، منافقت، غبن، جعلی سندیں، غرض یہ کہ خوفناک بدعنوانیوں کی ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ حالات کی یہ تصویر کسی ظالم حکمران کے دل و دماغ کی طرح سیاہ ہے۔ قیام پاکستان کو چوتھو سال گزر چکے ہیں۔ آج تک ہماری یونیورسٹیوں نے کتنے بڑے آدمی پیدا کئے فہرست بنانے بیٹھ جائیے۔ درس گاہوں کے علم کی حقیقت آشکارہ ہو جائے گی۔ ہماری درس گاہوں نے صرف کلرکوں، نیم سیاسی کھیلنڈروں، بے علم عالموں، بیروزگاروں اور اداس نسلوں کی ایک سپاہ بے سود تیار کی ہے جو زبان حال سے مروجہ نظام تعلیم کے کھوکھلے ہونے کی گواہی دے رہی ہے یا پھر باغی روحوں کا ہجوم سرگرداں پیدا کیا ہے۔ بے قراری، بے نصیبی، بے اطمینانی اور عدم تحفظ جن کا مقدر ہے۔ اور یہ تاریخ کا ایک سیدھا سادھا اصول ہے کہ ہمہ گیر بے چینی اور عدم تحفظ کا زخمیایا ہوا احساس انقلاب کو دعوت دیتا ہے۔

ہم سامراجی اور غلامانہ تعلیمی رواج کو چیلنج کرتے ہیں۔ باغی روحمیں ہم ہیں جن کے حساس میں نرالا درد سما گیا ہے۔ ہم سوچ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں سراپوں کو پہنچ کر دکھانے کے جذبے اور رتجگوں کی اونگھتی ہوئی پنہائیوں میں خوابوں کو تعبیر بنانے کی خواہش کا شکار ہیں۔ حقوق انسانی اور عظمت آدم کیلئے جذباتی حد تک غیرت مند اور مخلص ہیں جلد باز، سر پھرے، آوارہ اور دردمند ہیں۔ علامت ہیں بغاوت کی اور انقلاب کی۔ اے اس تڑپتے ہوئے عہد کے بے حس وارثو۔ ہم زیادہ دیر تک اس بے رحم نظام اور بد شکل معاشرے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ آسمان ہمارے سروں پر بوجھ ہے یہ فضا ہمیں قبولتی نہیں یہ زمین ہمارے لئے اجنبی ہے۔ یہ زمین جو بابا آدم کے دانہ گندم کھا لینے کی پاداش میں بخش دی گئی ظالموں نے جس کی مٹی کا ذرہ ذرہ اپنی مٹھی میں ڈالیا اور اس میں سے پھوٹی ہوئی خوشحالیوں سے اپنی جھولیاں بھر لی ہیں۔

اب ہم کسی ایسے ہی دانہ گندم کی تلاش میں ہیں کہ اسے کھالیں اور ہمیں کسی نئی زمین پر اٹھا کر پھینک دیا جائے۔ شاید پھر نئے احساس کی روشنی کی مدد سے نئی زندگی کا رابطہ لمحہ جاوداں کے ساتھ استوار کیا جاسکے۔

فوزیہ بیگم کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ فوزیہ نے اپنے خاوند صداقت علی کے ذریعے اپنے محبوب تیمور علی کا قتل کر دیا تھا تین سال پہلے کا واقعہ ہے کہ فوزیہ بیگم ایک دن بازار جا رہی تھی اچانک ایک غنڈہ اس کے ہاتھ سے پرس چھین کر بھاگ کھڑا ہوا وہاں موجود ایک نوجوان یہ سب دیکھ رہا تھا اس نے بھاگ کر نہ صرف اس غنڈے سے پرس چھین لیا بلکہ فلمی انداز میں اس کی اچھی خاصی پٹائی بھی کر دی۔ پکڑے گئے نوجوان کو بھلے ہی پولیس میں نہیں دیا گیا لیکن لڑکی کے پیروں پر گرا کر اس سے معافی ضرور منگوائی گئی۔ غنڈے کو پکڑنے والے کی دلیری اس کے ایکشن بھرے انداز کو فوزیہ بغیر پلک جھپکائے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس نوجوان کا نام تیمور علی تھا۔ وہ بھی پورا چھیل چھبھلا اور پونے چھ فٹ کا بٹا نوجوان تھا۔ اس کا رنگ بھلے ہی سانولا تھا لیکن ناک نقشہ کم پرکشش نہیں تھا۔ اچانک ہونے والی اس ڈرامائی ملاقات کے بعد وہ فوزیہ کے دل میں اتر گیا۔ ادھر فوزیہ بھی تیمور کے دل میں سما گئی تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے کے دل میں اترنے کا انجام یہ ہوا کہ دونوں کی ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ دھیرے دھیرے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔ پھر جلد ہی ان دونوں کے درمیان ہر طرح کے تعلقات قائم ہو گئے۔ ایک دوسرے کے اتنے قریب آنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے الگ ہونے کی بات کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ دونوں کا پیار پروان چڑھے ایک سال بیت گیا تھا۔ انہیں پتہ نہیں چلا لیکن ایک سال بعد یعنی دو سال قبل اس محبت کرنے والے جوڑے کو اچانک چھڑنا پڑ گیا۔ وجہ تھی تیمور کا فوج میں بھرتی ہونا۔ الگ ہونے کے باوجود دونوں کے پیار میں کمی نہیں آئی تھی۔ دور ہوتے ہوئے بھی دونوں کے دل ایک دوسرے کیلئے دھڑکتے تھے۔ دونوں کے پاس موبائیل فون تھے۔ ملاقاتیں بند ہوئیں تو دونوں کی فون پر باتیں شروع ہو گئیں۔

نور پور بیدیاں قصبے کیساتھ ایک گاؤں جٹ پور ہے کسان حق نواز کا کنبہ اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ حق نواز کے کنبہ میں اس کی بیوی کے علاوہ دولڑکے تھے تیمور اور اس سے چھوٹا محمد طیب۔ طیب لاہور میں ٹیکسی چلاتا تھا جبکہ تیمور دو سال قبل فوج کی ٹیپور جنٹ میں بھرتی ہو گیا تھا اور واہگہ بارڈر میں تعینات تھا۔ اپنی دو سال کی ملازمت میں ایک دن وہ پہلی بار دس دن کی چھٹی پر گاؤں آیا اور اس وقت وہ تیس سال کا تھا۔ ایک دن گاؤں میں ظہیر عباس کے لڑکے کی شادی تھی۔ شادی میں حق نواز کا کنبہ بھی شریک تھا اور لاہور سے طیب بھی آ گیا تھا۔ شادی والی رات دس بجے تک سنگیت پروگرام پورے جوش کیساتھ چلتا رہا اس کے بعد مقامی لوگ اپنے اپنے گھر جانے لگے۔ تیمور اور طیب بھی ایک ساتھ اپنے گھر لوٹ آئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ تیمور کپڑے بدل کر اکیلا ہی یہ کہتے ہوئے گھر سے نکلا کہ وہ شادی میں عورتوں کا ناچ گانا دیکھ کر آئے گا۔ صبح پانچ بجے طیب کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ تیمور ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا اس نے اس کا نمبر ملایا تو اس کا فون سوچ آف ملا۔ بلاشبہ یہ بات فکر والی تھی اور حیرت ناک بھی لہذا گاؤں بھر میں تیمور کی تلاش شروع ہو گئی۔ ابھی یہ تلاش جاری تھی کہ گاؤں کے ایک کسان ماجد علی نے آکر بتایا کہ اس کے کھیت میں ایک نوجوان کی لاش پڑی ہے جو دیکھنے میں تیمور کی طرح لگ رہا ہے۔ یہ سنتے ہی سب لوگ بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے لاش واقعی تیمور کی ہی تھی۔ یہ بات فوراً گاؤں کے نمبردار عبدالخالق کے علم میں لائی گئی تو انہوں نے فوراً طیب کو اطلاع کرنے اور پور بیدیاں تھانہ بھیج دیا۔ موقع پر پہنچ کر پولیس نے لاش کو قبضہ میں لینے کے

بعد ضابطے کی کاروائی پوری کر کے لاش پوسٹ مارٹم کیلئے سول ہسپتال بھیج دی۔ تیمور کا قتل نہایت بے رحمی سے کیا گیا تھا۔ اسکا سر گردن ہاتھوں ٹانگوں پر ہی نہیں بلکہ جسم کے ہر حصے پر زخم تھے۔ خون بہہ کر اس پاس کی مٹی کو بھگو گیا تھا۔ پولیس نے جانچ کیلئے خون آلود مٹی کا نمونہ لے لیا۔ موقع سے پولیس کو ایک نیلے رنگ کا پتکا ملا۔ پتکے پر بھی خون لگا تھا۔ ہلکے سبز رنگ کی ایک ٹوپی بھی پولیس کے ہاتھ لگی۔ پولیس نے فوٹو گرافر سے لاش اور موقع واردات کی فوٹو گرافی کرانے کے علاوہ جاسوسی کتے بھی لاکر قتل کا سراغ لگانے کی کوشش کی مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ایک فوجی کا بے رحمانہ قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک سنگین معاملہ تھا۔ اعلیٰ پولیس نے قتل کا سراغ لگانے کیلئے سخت احکامات جاری کر دیے۔ تھانہ انچارج صفی اللہ نے کیس کی تہہ میں جانے کیلئے اپنے با اعتماد مخبروں کا جال بچھا دیا اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی یہ پتہ چل گیا کہ فوجی تیمور کا تعلق قرہی جنڈ کی رہنے والی فوزیہ بیگم سے تھا۔ فوزیہ اور تیمور کے تعلقات کا علم ہونے کیساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ ان دونوں کے تعلقات فی الحال نہیں بلکہ دو سال پہلے سے تھے یہ بات تب کی تھی جب فوزیہ کنواری تھی اور اپنے میکہ جٹ پور میں رہتی تھی لیکن پچھلے سال اسکی شادی ہو گئی تھی اور اب وہ اپنے سرال جنڈ میں رہ رہی تھی۔ پولیس نے جب اپنے طریقے سے تفتیش شروع کی تو پتہ چلا کہ گاؤں کی ایک شادی میں شریک ہونے فوزیہ بھی آئی تھی۔ یہ بھی علم ہوا کہ وہ اکیلی آئی تھی لیکن رات دس بجے کے بعد بغیر کسی سے کچھ کہے واپس چلی گئی تھی۔ شک کے دائرے میں آتے ہی پولیس نے اس کے سرال میں چھاپ مارا لیکن وہاں نہیں ملی اور نہ ہی اپنے میکہ میں۔ وہ خود ہی نہیں بلکہ اس کا شوہر بھی گھر سے غائب تھا۔ وہ دونوں بغیر بتائے چلے گئے تھے۔ اس پر پولیس کو دونوں پر شک ہوا تو فوزیہ اور اسکے شوہر نعمان کی تلاش شروع ہو گئی لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ملی تو پولیس نے ان دونوں کے کنبے والوں پر دباؤ بڑھایا اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن ساڑھے دس بجے دونوں جٹ پور کے نہر دار عبدالخالق اور ایک دوسرے معزز شخص کے ذریعے پولیس کے سامنے پیش ہو گئے اور اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا۔

تفتیش میں ایک الگ ہی قسم کی عشقیہ کہانی سامنے آئی۔ فوزیہ اور تیمور کا عشق چپکے چپکے پروان چڑھ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ اس دوران فوزیہ کیلئے رشتے آئے اسکے گھر والے بھی اس پر شادی کیلئے دباؤ ڈال رہے تھے۔ فوزیہ نے پہلے تو سوچا کہ اپنے تعلقات کی بات گھر والوں کو بتا کر رشتے سے صاف انکار کر دے لیکن جب اس نے اس مسئلے پر گہرائی سے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ ایک فوجی سے شادی کر کے وہ زندگی کے مزے نہیں لوٹ سکے گی کیونکہ وہ زیادہ عرصے باہر رہے گا اور وہ خود گھر میں اکیلی پڑی رہے گی اس لئے فوزیہ نے گھر والوں کی پسند سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تکمیل کی آخری حد سے زوال کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے اپنی ذات کو کبھی مکمل نہیں سمجھنا چاہئے۔ آخر ایک دن باتوں باتوں میں فوزیہ نے تیمور کو اپنا آخری فیصلہ سناتے ہوئے کہہ دیا مجھے مجبوراً شادی کرنی ہی پڑے گی لیکن تم فکر مت کرو میری شادی کہیں بھی ہو جائے میرا جسم تمہاری ہی امانت رہے گا۔ جب بھی تم سے میری ملاقات ہوگی میں اپنا جسم بے جھجک تمہارے حوالے کر دیا کروں گی۔ تیمور اسکی ان باتوں پر ناراض بھی ہوا اور اپنا دکھڑا بھی رویا لیکن فوزیہ نے اپنی باتوں کے جال میں پھنس کر اسے خاموش کر دیا۔ ایک دن اس کی شادی جنڈ کے نعمان سے ہو گئی۔ تیمور اور فوزیہ کا تعلق یہیں ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ شادی کے بعد بھی فوزیہ اپنے فوجی عاشق سے فون پر مسلسل باتیں کرتی رہی۔ ہمہ وقت قرب کے شوق میں وہ خود بھی اپنے ہی دل میں مقیم رہی لیکن ایک دن اسکے شوہر نے اسے تیمور سے پیار بھری باتیں کرتے

ہوئے سن لیا تو اسکے دل میں شک کا سانپ سر مارنے لگا۔ بے اندازہ وحشت اور بربریت، بے پناہ محبت اور سپردگی، بے خبری کی انتہا اور کسی سے گہرا اور بے نام رشتہ ہی تضادات انسانی وجود کو کچلتے بھی ہیں اور سنوارتے بھی ہیں۔ سچائی کا پتہ لگانے وہ اپنے سسرال گیا تو کچھ آوارہ قسم کے لڑکوں کو اعتماد میں لے کر اور کچھ لالچ دے کر فوزیہ کے بارے میں پوچھتاچھ کی تو پتہ چلا کہ گاؤں کے تیمور کیساتھ اس کی بیوی کے عشقیہ تعلقات ہیں۔ ان لڑکوں نے یہ بھی بتایا کہ تیمور کے فوج میں بھرتی ہونے کے بعد وہ تعلقات شاید ختم ہو گئے تھے۔ اسکے بعد شک کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ نعمان نے گھر لوٹ کر اس بارے میں صاف صاف فوزیہ سے بات کی تو اس نے بھی دونوک کہہ دیا۔

”ہاں کئی سال پہلے ہم دونوں میں پیار ہوا تھا لیکن اب ہمارے درمیان کچھ نہیں ہے۔“

”اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تم فون پر اس سے رومانی باتیں کیوں کرتی ہو؟“

”پہلے میں اس کی باتوں میں آگئی تھی اور وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا اب بھی جب اسے معلوم ہے کہ میری شادی ہو چکی ہے وہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں فون پر پیار بھری باتیں کرتی رہوں ورنہ وہ خودکشی کر لے گا۔ اسی ڈر سے میں بھی باتیں کر لیتی ہوں۔“

”میں سمجھ نہیں پار ہا ہوں کہ میں تمہاری باتوں پر کیسے یقین کر لوں۔ بات جو بھی ہو مگر مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ پھر بھی میں ساری باتیں بھلا کر تمہیں ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ اگر تم خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ قسم کھاتی ہو آج کے بعد تم اس فوجی سے کوئی سروکار نہیں رکھو گی تو میں تمہیں معاف کر کے گلے سے لگانے کو تیار ہوں۔ اچھی طرح سوچ لو نہیں مانو گی تو میں تم سے جتنا پیار کرتا ہوں اس سے کہیں زیادہ نفرت کرنے لگوں گا۔ نعمان نے کچھ سوچ کر کہا تو فوزیہ نے قسم کھائی کہ وہ فوجی تیمور سے کوئی رشتہ نہیں رکھے گی۔ اس کے بعد دونوں کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ اب جب بھی تیمور کا فون آتا وہ نعمان کے سامنے ہی اس کا فون کاٹ دیتی۔ اس واقع کے کچھ عرصہ بعد تیمور چھٹی پر گاؤں آیا۔ اس کی چھٹیوں کے دوران ہی ایک دن گاؤں میں شادی تھی۔ اتفاق سے وہاں اسے فوزیہ دکھائی دے گئی تو وہ اس کے آگے پیچھے منڈلانے لگا۔ اس کے بعد تیمور اپنے چھوٹے بھائی طیب کیساتھ وہاں سے چلا گیا لیکن اس دوران نعمان وہاں آ کر اپنی بیوی کو تیمور کیساتھ باتیں کرتے دیکھ چکا تھا یہ بات دوسری تھی کہ وہ تیمور کو نہیں پہچانتا تھا۔ اس نے کسی دوسرے سے اس کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ وہی تیمور ہے۔ نعمان کے یہ سنتے ہی تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس نے دل ہی دل میں ایک سنگین جرم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ فوزیہ کا ایک طرف لے جا کر غصے سے بولا۔

”اپنے دوست کو بھی فون کر اور تھوڑی دیر بعد کھیتوں میں بلا۔ اس سے پیار بھری باتیں کرنا تاکہ اسے کوئی شک نہ ہو۔“

اسکے بعد نعمان فوزیہ کو اپنے سکوتر پر بٹھا کر گاؤں کے باہر ایک کھیت میں چھوڑ آیا۔ اس نے فوزیہ سے تیمور کو فون کروا کر کہلوادیا تھا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے وہاں پہنچ جائے پھر فوزیہ کا فون سوچ آف کر کے اپنی جیب میں رکھا اور اپنی بیوی کو وہیں چھوڑ کر سکوتر پر چلا گیا۔ تیمور بھی فون سننے کے بعد واپس شادی والے گھر جانے کا کہہ کر گھر سے نکل آیا اور سیدھا کھیت میں فوزیہ کے پاس پہنچ گیا اور اس سے پیار کرنے لگا۔ ادھر نعمان بھی وہاں سے سیدھا اپنے گھر پہنچا اور سکوتر آنگن میں کھڑا کر کے اپنی سائیکل اٹھائی اور کھیتوں کی طرف چل پڑا جس وقت وہ اس کھیت میں پہنچا جہاں فوزیہ کو چھوڑ کر گیا تھا تیمور علی اسے بانہوں میں سمیٹے پیار کر رہا تھا۔ گھر سے نکلنے وقت نعمان گھاس کا ٹٹے والی درانٹی ساتھ لے آیا تھا تیمور علی کو لالکار تے

ہوئے اس نے درانتی سے حملہ کر دیا۔ تیمور کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا تھا اسلئے پہلے ہی وار میں وہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ تیمور فوجی تھا اسلئے زخمی ہونے کے باوجود نعمان سے الجھ گیا۔ ذرا سی دیر میں دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس اٹھا چک میں نعمان کے سر پر بندھانیلے رنگ کا پٹکا کھل کر وہیں گر گیا۔ فوزیہ نے بھی اس معاملہ میں شوہر کا ساتھ دیا۔ نتیجے میں تیمور علی جلد ہی قابو میں آ گیا۔ اسکے بعد نعمان نے درانتی سے اس پر اتنے وار کئے کہ اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ اس کے باوجود درانتی ساتھ لے جا کر نعمان اور فوزیہ سائیکل پر سوار ہو کر اپنے گھر آ گئے۔ خون آلود کپڑے اتار کر نعمان اور فوزیہ نے گھر میں ہی چھپا دئے۔ سائیکل جانوروں والے شید میں کھڑی کر دی جس درانتی سے تیمور کا قتل کیا گیا تھا اسے وہ صبح اندھیرے ہی دربار پیر موسیٰ کے پاس جھاڑیوں میں چھوڑ آیا تھا۔ اس کے بعد میاں بیوی دونوں گاؤں سے فرار ہو گئے لیکن جب پولیس کا دباؤ بڑھا تو انہیں خود سپردگی دینا پڑی۔ تفتیش کے بعد پولیس نے فوزیہ اور نعمان کی نشاندہی پر خون آلود کپڑے، درانتی اور سائیکل برآمد کر کے دونوں کو عدالت میں پیش کر کے جیل بھیج دیا تھا۔ اب نعمان سزائے موت اور فوزیہ بیگم پچیس سالہ قیدی تھی۔

انجانا پن آدمی کو اتنا مایوس کر دیتا ہے کہ مایوسی تقریباً سنگدلی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ حلیمہ نام کی ایک ادھیڑ عمر بڑھیا تین برس کی سزا کاٹنے آئی تھی۔ اسکی کوئی بات بھی صاف طور سے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بالکل ڈھیٹ دیہاتی اور آدھے ٹوٹے ہوئے دانت تھے۔ کپڑے اتنے گندے کہ کوئی اس کے قریب جا کر اسکی باتیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ گودام میں قیدی لباس نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ہی کپڑے پہنے ہوئے تھی بشری کی چلاہٹ سے صرف اتنا ہی پتہ چلتا تھا کہ حلیمہ کے پاؤں کی انگلی میں درد ہے۔ اکثر سیل کے اس پار سے سدرہ کے گٹھے کی آواز سنائی پڑتی تھی وہ کہتی تھی تم قید بامشقت کی قیدی ہو تمہارے حصے کی مشقت کون کرے گا۔ پاؤں کی انگلی میں درد ہے تو ریزھی سے اینٹ تو ڈھوسکتی ہو۔ ایسے درد ہم نے خوب دیکھے ہوئے ہیں۔ میں ایک دن نہا کر سیل کی طرف لوٹ رہی تھی کہ حوض کے کنارے بیٹھی حلیمہ رو رہی تھی۔

”تمہارے پاؤں میں کیا ہوا؟“

اس نے اپنا پاؤں میری طرف بڑھا دیا۔ مزدوری کرنے والے پاؤں کے انگوٹھے کے اوپر ایک گندے کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ پانی سے بھیگا ہوا تھا۔ ہسپتال کی طرف جاتے دیکھ کر وارڈن نے بھی کچھ نہیں کہا۔ صغراں کیساتھ ہونے والے واقعہ کے بعد سے کبھی سوچتے تھے کہ مجھے ڈاکٹری بھی کرنی آتی ہے۔ تھوڑا سا ڈیٹول اور روئی لگا کر انگوٹھے کی پٹی کھولتے وقت میں نے بھی سوچا تھا کہ کٹا پھٹا تو نہیں ہے شاید ڈر اور درد کے مارے وہ کمزور پڑ گئی تھی۔ پانی سے بھیگی پٹی اتار کر گندے چوڑے ناخن کو ڈیٹول سے پونچھے جا رہی تھی کہ میرے ہاتھ سے روئی کا ٹکڑا گر پڑا۔ پل بھر کیلئے میرا بدن کانپ اٹھا تھا۔ ٹھوکر لگ کر اسکے ناخن کا نچلا حصہ پھٹ گیا تھا۔ نیلے اور کالے شکستہ ناخن کے اس گھاؤ سے ڈیٹول کی مہک سے کیڑے نکل رہے تھے۔

اس دن ملنے والی لڑکیاں وہ دونوں نیچر تھیں۔ میں سیل کی طرف واپس لوٹ رہی تھی کہ شباحہ نے دھیرے سے بلایا تمہاری طرف کے سیل میں آمنہ نام کی ایک لڑکی آئی ہے۔ چھریرا المبا جسم، بدن کے کھلے پورے جسم پر کڑھائی کی ہوئی ہے۔ پیچھے سر پر ایک اونچے جوڑے میں پھول کھونے رکھتی ہے۔ لیڈی کانٹیبیل اسے باندھ کر لائی تھی۔ وہ نا سمجھ نفرت آمیز نظروں سے دیکھتی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس جانے، نام

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اس بات کا فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں کہ کس کا جہاں کرگس کا ہے اور کس کا شاہین کا؟ مجھے تو کوئی اس سوال کا جواب دے دے کہ اس قوم کی کمپیوٹر جینیٹکس بچی ارفع زندگی موت کی جنگ لڑ رہی تھی کوئے کی حالت میں تھی لیکن یہاں کے کسی کھرب پتی بزنس مین، کسی کھرب پتی حاکم وقت کسی مولانا کے کان پر جوں تک نہیں رہی۔ جب ہزاروں میل دور بیٹھا بل گیٹس بری طرح تڑپ اٹھا تھا کیونکہ وہ ارفع بنی نوع انسان کا اثاثہ سمجھتا تھا اور ہم اپنی جینیٹکس بیٹی کو بیٹی تک ماننے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ یہ بھی دنیا کا دولت مند ترین بل گیٹس ہی تھا جس نے چند برس پہلے بھی ارفع کو ملاقات کی دعوت دے کر امریکہ بلایا تھا۔ اسے خراج تحسین پیش کیا۔ شاہباش دی اور حوصلہ افزائی کی جبکہ اس ملک میں تب بھی کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ ارفع کو لائٹ میں لا کر اس ملک کی نوجوان نسل کو پیغام دینا کہ ایسے بچے ہی رول ماڈل اور ملک کا مستقبل ہیں لیکن ہم بد نصیب، بد بخت کیا جانیں۔ کون عزت دار ہے کون بے عزت؟ کون بیش قیمت اور کون بے قیمت۔ کون رحمت ہے کون زحمت؟ کون ہیرا اور کون پتھر، کون پھول کون کانٹا۔ یہاں پدرم سلطان بود۔ ڈہنی طور پر نکلے نکلے کے لوگ تو بلٹ پروف گاڑیوں میں دندناتے پھرتے ہیں اور ارفع جیسی عالی دماغ کوئے میں پڑی زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ اس کے لئے فکر مند تھا تو صرف اور صرف بل گیٹس کہ ہیروں کی پہچان جو ہریوں کو ہی ہو سکتی ہے اور گندگی کے کیڑے صرف گندگی میں ہی خوش رہتے ہیں۔ واقعی ہماری اور ہمارے حریفوں کی دنیاؤں میں زمین و آسمان کی انتہاؤں سے بھی زیادہ فرق ہے۔ اغیار اور کفار کی دنیا ایجاد، اختراع، تخلیق اور تعمیر کیساتھ ساتھ عقل اور علم کے احترام کی دنیا ہے جبکہ ہماری دنیا؟؟؟ ہمارے ہاں کہیں ڈنڈا، کہیں ڈنڈی۔۔۔ کہیں دھوکا منڈی اور اس منڈی کے معزز آڑھتی اور دلال۔۔۔ بے شک ہم اور ہمارے حریف دو مختلف دنیاؤں میں زندہ ہیں۔

اچانک ایک آفت سے بلاوا آیا کہ تمہارے گھر سے منی آرڈر آیا ہے، دستخط کرنا ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ عباد کھڑا تھا کسی کام کے سلسلہ میں ڈپٹی جیلر نے بلوایا تھا یعنی پتھروں کی دراڑ میں بھی گھاس اگتی ہے۔ عباد علی تحریک حقوق انسانی کا ہمارا بڑا پیارا ساتھی عباد۔ اور ٹیل کالج کا قابل ترین طالب علم تھا۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ بار اور دو چار لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ بوڑھے نصر اللہ کیساتھ جنہوں نے ڈپٹی جیلر سے کہا تھا آپ مجھے جیل کو ڈکھا سکاں گے آپ جب پیدا نہیں ہوئے تھے تب سے میں جیل کو ڈکھاتا ہوں۔ کالا باغ میں رہتا تھا۔ جب بہت دنوں سے ماں کو میری چٹھی نہیں ملی تھی تب ماں مجھے منی آرڈر بھیجتی تھی۔ کوپن کی تحریر بھر سے مجھے ان لوگوں کی خبر ملتی تھی۔ وہ روپے سب سے زیادہ مجھے اخبار خریدنے کے کام آتے تھے حالانکہ کسی کسی دن خاص خبر رہنے پر اس دن کا اخبار مجھے نہیں دیا جاتا تھا۔ کافی دن تک اخبار بند رہنے کے بعد مجھے پھر سے لائبریری کی ایک دو کتابیں دی جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ جیل کے حاکم کی کتابیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن وہاں موجود ہوتے تھے جنہیں پڑھنے سے لگتا تھا کہ جیل میں نیبوکنج کے آس پاس صرف جوان عورتیں منڈلاتی پھرتی ہیں اور ان کی دکھ بھری داستان سننے کیلئے کچھ خوبصورت ڈاکٹر اور نرم دل حاکم رہتے ہیں لیکن حقیقت میں انکے بارے میں قیدی عورتوں کی رائے کان کھول کر سننے کے لائق ہوتی تھی۔

جھنگ ڈسٹرکٹ جیل میں انگریزوں کے زمانے میں قیدیوں کیلئے لائی گئیں کچھ اچھی کتابیں بھی تھیں اور بہت پرانے ایڈیشن کی کالی جلد

میں انسائیکلو پیڈیا بھی موجود تھا۔ ایک دن دو قیدی عورتیں سیل میں جب گہری نیند سو رہی تھیں اچانک گیلے باغیچے سے تقریباً ڈیڑھ ہاتھ لمبا کالا سانپ گھس آنے پر ان کی ہلاکت کا ہتھیار بننا تھا۔ علم کے خزانے سے بھری وہ کتابیں جو وارڈن رات میں لاکھ چیخ و پکار پر بھی وارڈ کا دروازہ کھولنے پر بھی تیار نہیں ہوا تھا بلکہ لاشی ہاتھ میں لے کر خطرے کے سرحد سے باہر کھڑا رہا تھا۔ دوسرے دن مرے ہوئے سانپ کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو کر بولا۔

”واہ! آپ تو بہت ہمت والی ہیں۔“

جواب دینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی کہا۔

”آپ کے گھر میں اگر اسی طرح سانپ گھس آتا تو آپ میں ہمت خود بخود آ جاتی۔“ دن بدن میری ہمت میں اضافہ دیکھ کر سبھی حیران ہو رہے تھے۔ یہاں کی لاہری سے ”فارہوم داویل ٹولس“ کتاب منگوائی تھی۔ رات کے وقت اسے پڑھتے پڑھتے ٹھٹھا مارنے پر وارڈن دوڑ کر آ گئے تھے کہ سیل میں اکیلے رہتے ہوئے کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی لیکن لاہری کے معاملے میں کسی اور وجہ سے ہشیار ہونا پڑا تھا کہ جس چھوٹی پرچی پر میں کتاب کا نام لکھ کر بھیجتی تھی اس کے پہلے صفحے پر بیچ میں خوش خط حروف میں ایٹھ کی گئی ہے جیسی وضاحت درج ہوتی تھی۔ میں نے کیٹلاگ منگوا لیا تاکہ کتابوں کی ایک فہرست تیار کر کے اپنے پاس رکھ سکوں۔ بہر حال دو اچھی کتابیں قرآن العین کی آگ کا دریا اور عبد اللہ حسین کی اداس سلیس کو میں نے قریب قریب رٹ لیا تھا آخر میں امجد جاوید کی جب عشق سمندر اوڑھ لیا منگوا کر پڑھی۔ لیکن سادہ کاغذ کیلئے کئی بار کہنا بھی بے کار ثابت ہوا۔ طویل میعاد کی سزا ہونے پر وہ بامشقت سزا ہو جاتی تھی۔ عورتوں کا مخصوص کام اکثر آنگن اور باغیچے میں جھاڑو لگانا، چنے بھون کر، چکی میں پیس کر ستونا بنانا۔ دریاں اور صفیں بنانا اور نیم پاگلوں کی دیکھ بھال وغیرہ کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دو قیدی جو کام سیکھ لیتی تھیں وہ ہسپتال میں روگیوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ یہ بہت آرام دہ اور با اثر کام تھا۔ اس طرح کے کام والے قیدیوں کو سال میں چند رہ دن کی چھوٹ اور مہینے میں ایک سو روپیہ تنخواہ بھی دی جاتی تھی۔ تنخواہ کا آدھا خرچ بھی کر سکتے تھے یعنی میٹرن سے ضرورت کا سامان منگوانے پر خرید کر بھیجا جاتا تھا بشرطیکہ وہ جیل کے قانون کے مطابق غیر قانونی نہ ہو۔ اس کی جو بھی قیمت بتائی جاتی تھی اسے مان لینا پڑتا تھا باقی آدھی تنخواہ جمع رہ جاتی تھی رہا ہو کر جاتے وقت قیدیوں کو وہ جمع شدہ روپیہ بحالی رقم، امدادی رقم کی صورت دی جاتی تھی۔ جاتے وقت خوش ہو کر اس میں سے کتنا دینا ہو گا عام طور پر اس کا بھی مقررہ اصول ہوتا تھا چونکہ نشلی شے اور رنگین ملبوس منگوا یا نہیں جاسکتا تھا۔ اسلئے عورت قیدیوں کے روپے جمع ہی رہ جاتے تھے۔ جائزے کی شروعات میں اکثر عورتیں فرمائش کرتیں کہ ماریہ تم سویٹر بن دو گی۔ میرا جوش ان لوگوں سے بھی زیادہ تھا کیونکہ میرا تو وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ مجھے تو متحرک اور ہشیار رہنا ہی تھا اسلئے ہفتہ وار معائنے کے دن سپریمینٹ کے روبرو بہت انکساری سے عرضی پیش کی گئی۔ صاحب بہادر کو یکبارگی اس میں اعتراض کرنے جیسی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی صرف تھوڑی حیرت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تم ان کے سویٹر تیار کر دو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ پھر اون آئی۔ پہلے حنا کیلئے۔۔۔ ماجدہ کیلئے۔۔۔ صغرا کیلئے۔۔۔ کول کیلئے بس۔ جس وارڈن نے رومانہ کو چپا تھا وہ جس دن اون کا بنڈل ہاتھ میں لے کر آیا تھا یہ سوچ کر اسے نہیں دیا کہ اس سے دوسرے کا سویٹر اس کے لالچ کے پنجوں میں چلا جائے گا۔ کیوں نہیں بنو گی۔ آپ کا کام نہیں کرنا ہے اسلئے۔ پھر اون آنا بند ہو گئی۔ دفتر میں رپورٹ کر دی گئی کہ سویٹر بننا تو ایک بہانہ تھا اون سی سی بنائی جا رہی ہے۔ انکو انری کرنے والوں کو چھان بین کرنے پر کچھ نہیں ملا تھا۔ صاحب

جی مار یہ بہت خطرناک لڑکی ہے۔ کہیں رسی کو چھپا دیا ہوگا اس نے۔ بھابی کو افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنا والا سوٹر پہلے کیوں نہیں بنوا لیا مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ کوئل کی ماہر انگلیوں نے اس ہنر کو بہت اچھی طرح سے دریافت کر لیا تھا جب میں نہیں رہوں گی تب وہ بن سکے گی۔ اس میں کسی بھی کام کو بہت مہارت سے کرنے کی ایک عجیب صلاحیت تھی۔

کوئل سیل کی سب سے فٹ فاٹ، صاف ستھری اور اچھے مزاج کی لڑکی تھی۔ کہیں بھی تھوڑی سی گندگی رہ جانے پر کوئل کے پاس معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ دوپہر میں آرام کے وقت پاؤں سپار کر بٹھناتی ہوئی کوئی بھی ایک کتاب پڑھتی تھی۔ سیل میں جو بھی ضرورت کا سامان آتا تھا وہ قیدیوں کی طرف سے گیٹ کے پاس وارڈن کے سامنے اسے سمجھ لینے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی۔ کوئی سامان کم آنے پر بچوں کا دودھ یا چینی خراب آنے پر وہ ہمیشہ ہنستی رہتی تھی۔ چھٹی ناک، موٹی موٹی آنکھوں سے ہمیشہ اس کی ہنسی جھلکتی تھی۔ اس کے بات کرنے کا ڈھنگ وسطیٰ پنجاب کے لہجے کے اسٹائل کا تھا جو بڑا ہی سننے میں پیارا لگتا تھا۔ چھوٹا گورا سڈول قد، شہ جیسا چہرہ اور اسکے چہرے پر ایک تل تھا۔ وہ بیس سال کی سز یافتہ مجرم تھی۔ اس دن کوئل میری سلاخوں سے سر نکالے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی لیکن اچانک سپریم کورٹ کی اپیل میں ریلیز ہونے کی خبر آئی۔ وہ ہچکاڑ کھا کر باغیچے کی گھاس پر گر پڑی تھی۔ بغیر آنسوؤں کے ماتم سے آسمان پھٹا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میں اب کس گھر میں واپس جاؤں گی۔ کونسا آگن ہوگا اس کے لئے؟

میں جس سیل میں رہتی تھی وہ وارڈ کے پچھلے حصے میں مغربی کنارے پر تھا۔ جیل کے مشرقی سرے پر اور بھی تین سیل تھے۔ آسیہ کو جب وارڈ میں ڈرپ لگائی گئی تھی تب ان سیلوں کو ایک بار دیکھا تھا اور ایک بار تب دیکھا تھا جب مجھے خون سے لت پت بے ہوشی کی حالت میں وہاں پھینک کر چلے گئے تھے۔ میری سیل کے سامنے برآمدے کے باہر ہی دیوار تھی اسکے پار سے ایک ہسپتال کے ہیڈ کوارٹر اور پری حصہ دکھائی دیتا تھا۔ بادل اور پرندے میرے پاس آجایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی باہر کی اٹھل پھٹھل ہوا کا جھونکا بھی دکھائی دیتا تھا لیکن پانچ فرلانگ کی دوری پر واقع اس سیل میں بارش کی ایک بوند بھی نہیں پہنچتی تھی۔ اس سیل میں بند رہنے پر نہ میں کسی کو دیکھ سکتی تھی اور نہ ہی مجھے کوئی دیکھ سکتا تھا۔ دن بھر کام کام ختم کر کے لاک اپ میں جانے سے پہلے روز ایک بار بھابی آتی تھی۔ دو بیڑی جلا کر بڑی منت سماجت کیسا تھ ایک مجھے دے کر اور ایک خود لے کر سلاخوں سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ دن بھر کی خبریں اسی سے ملتی تھیں۔ کسی وارڈن نے کل رات ایک گچھا پیچی توڑ لیا تھا۔ سالے اپنے باپ بھائی کا ماتھا کھا کر یہاں آ کر کیوں نہیں رہتے مانا کہ گھر سے اس کے باپ نے پارسل کے ذریعے کپڑے بھیجے تھے۔ وہ میری بغل والی سیل میں ہی رہتی تھی۔ نیم پاگل، گورا رنگ، اونچا قد، عمر بائیس تیس سال رہی ہوگی۔ گٹھیل بدن، چوکور دانت اور چھوٹے چھوٹے کٹے بالوں میں وہ ایک سکول کی بچی کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ وہ بہت موٹی لڑکی تھی جس دن سوچ لیتی تھی کہ نہانا نہیں ہے اس دن وہ نہاتی ہی نہیں تھی اور بشری کو اتنی گالیاں دیتی تھی کہ اس کی اٹھائیس پشتوں تک یاد رکھنے کے قابل ہوتی تھیں۔ پھر کبھی کبھی خوش ہوتی تو شادی بیاہ کے گانے ہنسی مذاق کے گانے رات بھر گاتی رہتی۔ کتنا ہنستی تھی مہوش ازنجیر سے باندھ کر جب اسے نہلانے کیلئے لے جایا جاتا تھا تب اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے ہنسی جھلکتی دکھائی دیتی تھی۔ صبح گنتی کے وقت وہ مردہ بن کر پڑی رہتی تھی اور زور سے ٹھٹھہ کرنے لگتی تھی۔ وارڈن کو ڈرانا چکانا اس کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ دن بھر ہنستی رہتی اور تب تک ہنستی رہتی جب تک وہ اپنی

فطری کیفیت میں نہ لوٹ آتی تھی۔ پاگل پن کا دورہ پڑنے کے بعد ہی وہ پھر عام آدمی کی طرح ہنستی بولتی تھی۔ مذاق کرتے ہوئے وہ پوچھتی تھی۔
 ”اے ماریہ۔ ارات کا کھانا آئے گا کیا۔“

”ہاں آئے گا۔“

”تو پھر ایک گانا سن۔“ اس کے بعد

چھپ گیا کوئی رے دور سے پکار

دردانو کھے ہائے دے گیا پیار کے

آج ہیں سونی سونی دل کی یہ گلیاں

بن گئیں کانٹے میری خوشیوں کی کلیاں

پیار بھی کھویا میں نے سب کچھ بار کے

دردانو کھے کوئی دے گیا پیار کے

گیت کی آواز جیل کی دیوار سے ہوتے ہوئے آسمان کو چھو رہی تھی۔ اس کے بغل میں واقع سیل میں آنے والے مہمانوں کی آمد و رفت کا تانٹائی بندھا رہتا تھا۔ عرفہ بیگم بھی کچھ دنوں کیلئے تھی۔ ایام حمل میں وہ اعصابی توازن کھو بیٹھی تھی۔ کسی محبت بھرے میڈیکل کیئر سینٹر کے بدلے اسے میاں والی سے ملتان جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ عرفہ بیگم ایک گول مٹول بچے کو جنم دے کر آہستہ آہستہ صحت مند ہو رہی تھی۔ ایک دن میٹرن کولگا کہ عرفہ بچے کو لیکر چپ چاپ بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ بعض اوقات پاگل پن کا دورہ پڑنے پر اپنے حواس کھو بیٹھتی تھی۔ اسلئے جیلر کی طرف سے فرمان جاری کیا گیا تھا کہ بچے کو اس سے ہٹا لیا جائے۔ عرفہ بچے کو نہ گود میں لے سکے گی اور نہ ہی دودھ پلا سکے گی۔ قیدیوں کے حصے کا کھانا کھا کر تندرست بدن والی اس نمائندے کا خیال اور فرمان جاہل اور ضدی ماں کو پسند نہیں آیا تھا اور ناپسندیدہ انداز سے اس نے اس کی مخالفت کی۔ بشری کا آنچل پھٹ گیا تھا۔ عرفہ کی آنکھوں کے نیچے اور کھلی پیٹھ پر نیلے ہرے خون کے جھنکے کا نشان نظر آیا۔ وہ بچہ رات بھر روتا رہا اسلئے جسے کی چینی میٹرن اور وارڈن کی چائے اور شربت میں گھلنے لگی تھی۔ مٹی کا نام ہی ماں ہے اسلئے رات بھر ماں کی چھاتی سے بوند بوند دودھ پک کر سیل کے فرش پر جمع ہوتا رہا۔ نہ وہ شعلہ زن ہوئی نہ برس پڑی نہ ہی کہیں کسی کا ستیاناس کر پائی۔ ناقابل برداشت کہرام سے ماحول کو چاک کرتی ہوئی عرفہ کو یہاں سے لاہور سینٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ دو چار دنوں تک دودھ چینی کی راحت کا انتظام کر کے وہ معصوم بچی چل بسی۔ خالی سیل میں سعیدہ خاتون کو صبح لایا گیا تھا پھر شام کو واپس لیجانا پڑا تھا۔ پاگل سعیدہ لگا تار آٹھ برسوں تک اندھیری سیل میں رہنے کے بعد روشنی میں آ کر اپنے فطری نرم لہجے میں سب سے یہ کہہ کر گڑ گڑاتی رہی کہ اسے واپس اندھیرے میں بھیج دیا جائے۔ کسی سے جواب نہ پا کر وہ عجیب ڈھنگ سے متواتر سلاخوں پر اپنا سر ٹپکتی رہی۔ خون سے اس کا چہرہ لت پت ہو جانے کے کافی دیر بعد اس کی سیل کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی پڑی۔ سعیدہ کو کبھی میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ صرف سب کچھ سنائی دیتا تھا۔

میری بیماری میں کوئی فرق نہیں آ رہا تھا۔ مسلسل متلی کرتی جا رہی تھی۔ پھر سیل سے دو گھنٹے کیلئے چھٹی ملی تھی لیکن اب میں زیادہ گھوم پھر

نہیں سکتی تھی۔ آم کے بیڑوں پر گچھوں میں آم لٹک رہے تھے اتنے نزدیک سے دیکھنے کا پہلے کبھی موقع نہیں ملا تھا۔

وارڈ کے باغیچے میں ڈھیر سارے کھٹل کے بیڑ تھے۔ ان کے پتے اتنے بھاری تھے کہ ہوا سے بھی نہیں ہلتے تھے۔ ایک پرندہ تک نے ان پر گھونسلانہیں بنایا تھا۔ تب سے مجھے کھٹل کا بیڑا اچھا نہیں لگتا۔ جون کی گرمی سے سبھی تڑپ رہے تھے۔ اس وقت میٹرن اور وارڈن پاگلوں کی طرح ہیڈ وارڈن کے ساتھ بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ کیا بات ہے؟ پہلے وہ الٹ پلٹ کر سرچ کرنے لگے تھے۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ کیا کسی نے بھاگنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد کھودا پہاڑ نکلی چوہا۔ آئی جی جیل خانہ جات کل دورے پر آرہے ہیں تو کیا ہوا؟ اس بات کو سننے کا کون؟ ہلال کی گنی مرغی کی طرح میٹرن وارڈن اور سپاہی بھاگتے پھر رہے تھے۔ سارے مہینے کی چچھاتی دھوپ باغیچہ اس طرح چمک رہا تھا جیسے سوئی بھی چنی جاسکتی تھی۔ ہر پودے کو پانی سے دھویا گیا تھا۔ پھر باغیچے کے کنارے کی مینوں کے گھیرے کو اکھاڑ کرنے ڈیزائن سے لگا کر ایک کو چونے سے تو دوسرے کو چار کول سے رنگا گیا تھا۔ لڑکیاں پسینے سے تر پتر ہو رہی تھیں۔ ان کا دم نکلا جا رہا تھا۔ شام کو ہاتھ پاؤں دھونے تک کیلئے پانی نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے کسی نہ کسی طرح رات گزر گئی تو صبح کا ناشتہ آٹھ بجے کے پہلے ہی مل گیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے ان کے آنے کی خبر تھی، پہلے تو یہ تاکید کر دی گئی تھی کہ اس وقت بلا وجہ ادھر ادھر آنا جانا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی باہر والے حصے کو جھاڑ پونچھ کر ادھر ادھر لگے رنگوں کو صاف کیا گیا تھا۔ کمبلوں کو تکر کے گودام میں بند کر کے رکھا گیا تھا۔ میں نے میٹرن سے پوچھا

”کیا آئی جی صاحب قیدیوں کیساتھ کھانا نہیں کھائیں گے یا پھر جیل میں کھانا ہی ایک غیر قانونی کام ہے۔“

”یہاں سب برتن صاف ستھرے نہیں ہیں۔ یہ سب اچھا دکھائی نہیں دے گا۔“ اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا۔ بارہ بجے گیٹ میں وی آئی پی کے داخلے کی گھنٹی بجنے لگی۔ سبھی قیدیوں نے اپنے اپنے کٹ سنہال کر رکھے تھے۔ خاص طور پر وہ قیدی جن کی رہائی میں دو تین برس باقی رہ گئے تھے۔ دیگر سبھی کا حساب لگا کر سزا کی میعاد پوری ہونے پر جیل آفس سے ہی انکار ریلیز آرڈر آ جاتا تھا لیکن جن کو عمر قید کی سزا سنائی جاتی تھی انکا ریلیز آرڈر انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کی بلڈنگ سے آتا تھا۔ اسلئے دن پورے ہونے اور دیگر شرطوں کے پورا ہو جانے کے باوجود انہیں جیل حکام کی جنت کی طرف آنکھیں لگائے رہنا پڑتا تھا کہ ایک وہاں بیٹھا سب سے طاقتور انسپکٹر جنرل انکے حکم نامہ پر دستخط کرے گا۔ وہی انسپکٹر جنرل آج خود انسپیکشن پر آرہے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے سے بارہ بجے کے دوران وارڈ میں پہلے بچوں کیلئے پھر بارہ سے ساڑھے بجے کے بچے سبھی قیدیوں کیلئے کھانا آ جاتا تھا لیکن اس دن تو بارہ بجے وی آئی پی آئے تھے۔ جیل کے خاص پچانک پران کی آمد کا ہونٹ بچتے ہی وارڈ کے اندر لڑکیاں قطار بنا کر برآمدے میں کھڑی ہو گئیں۔ دیوار سے لگ کر لمبی لائن، ناک تک گھونگھٹ کھینچے ہوئے ہاتھوں میں اپنا اپنا کارڈ تھا۔ ہوئی تھیں۔ بچوں سے کہا گیا تھا کہ وارڈ کے پہلے بیڑ کے نیچے چپ چاپ بیٹھ جائیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان میں سے کوئی بھی فرمان میرے لئے جاری نہیں کیا گیا تھا میں صرف دیکھ رہی تھی کہ حکومتی نظام کتنی بے بسی کیساتھ لوگوں کو خوف زدہ کئے ہوا تھا۔ کھڑے کھڑے ایک بچ گیا اور پھر ڈیڑھ۔ لوگوں کی بات چھوڑ ہی دیں تو بھی بچے بھوک سے تڑپ رہے تھے لیکن عام بچوں کی طرح رونے یا شکایت کرنے یا ماں کے پاس جانے جیسی عیاشی کا تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دو بجے گیٹ کے سپاہی نے آن کر خبر دی کہ آئی جی صاحب چلے گئی ہیں کوئی انسپیکشن وغیرہ نہیں ہوگی۔ کوئی دربار وغیرہ نہیں لگے گا۔ سپرنٹنڈنٹ کے خسر

خس سے ڈھکے آفس میں بیٹھ کر بات چیت کر کے اور چائے پی کر چلے گئی ہیں۔ تبصرہ بے معنی ہے۔ صرف اتنا کہا جاسکتا تھا کہ اس دن دوپہر کا کھانا پونے تین بجے ملا اور رات کا کھانا حسب دستور ساڑھے چار بجے ملا تھا۔ کھانا لے کر سیل کے اندر جانے کا قانون نہیں تھا فوراً برتن صاف کرنے ہوتے تھے۔

ساڑھے پانچ بجے لاک اپ ہوتا تھا جب تک بارش اچھی طرح شروع نہیں ہوئی تھی لڑکوں کے سیل سے چار کرخت چہرے والے قیدی ایک اور میٹ کو لے کر سپاہی سمیت ہیڈ وارڈن ہمارے سیل میں حاضر ہوئے تھے۔ کھٹل کے بیڑ اوپر سے نیچے تک پھلوں سے لد گئے تھے۔ انہیں توڑا جانا تھا۔ اس میٹ کو حدیقہ بھابی جانتی تھی اور ہم سب اسے ہمتی اور سچے آدمی کی صورت میں جانتے تھے۔ پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ باغیچے کے بھی بیڑوں سے کھٹل توڑے جا رہے تھے۔ ایک جگہ رکھنے سے وہ ٹیلے کی طرح دکھائی دے رہے تھے پیچھے نہانے کی جگہ کے آس پاس اور بھی ساتھ بیڑ تھے۔ بھابی کیا کچھ کہے جا رہی تھی۔ میٹ نے بھی بھابی کی آنکھوں کی طرف دیکھو اس کے بعد کھٹلوں کا ہٹا ہوا تھا سیل کے بھی قیدیوں کے نام پر ایک ایک دود دینے کے بعد جو بچ گئے انہیں کبل میں باندھ کر لے گیا۔ جاتے جاتے میٹ ایک بار پھر بھابی کی طرف دیکھ کر چلا گیا تھا۔ پیچھے والے بیڑوں کے پھل رہ گئے تھے مردوں کے سیل کی طرف سے عورتوں اور بچوں کیلئے سوغات تھی بعد میں اس میٹ کا نام رییس الدین معلوم ہوا تھا۔ وہ جیل کے قیدیوں کا پنچاقتی رکن تھا۔ وہ عمر قید کا قیدی تھا۔ رییس الدین شادی کے ابتدائی دنوں سے ہی شازیہ سے دور رہنے لگا تھا۔ وہ اکثر راتیں باہر گزارتا تھا۔ نئی بیوی کا نشہ ہی نرالا ہوتا ہے لوگ تو سات سمندر پار کر کے تالے توڑ کر اپنی بیوی کے پاس چلے جاتے ہیں اور رییس تھا کہ اکثر راتوں کو لا پتہ رہتا تھا۔ اکیس سالہ رییس شیر کوٹ کا باشندہ تھا اس کی شادی بیس سالہ شازیہ سے ہوئی تھی۔ ایک دن مجبور ہو کر شازیہ نے رییس سے پوچھ ہی لیا ”تم کبھی رات کو دیر سے گھر آتے ہو اور کبھی تو آتے ہی نہیں۔ سچ بتاؤ تم رہتے کہاں ہو اور میرے بغیر تمہیں سکون کیسے ملتا ہے۔“

”اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔“ رییس ہنسنے لگا۔ ”آنکھوں پہ تم سے چپکار ہوں گا تو گھر کا خرچہ کیسے پورا ہوگا۔ تمہارے شوق کیسے پورے کروں گا۔“

”اچھا؟“ شازیہ رییس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ شازیہ کو چار مہینے ہونے کو آئے تھے ”تم مجھے کہاں گھمانے لے گئے ہو یا کون سے شوق پورے کئے ہیں میرے۔ پورا دن گھر بیٹو کام کاج میں بیت جاتا ہے اور رات کو جب تم گھر پر ہوتے ہو تو کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنا شوق پورا کرنے میں بٹ جاتے ہو۔“

”میرے شوق میں تم بھی تو برابر شریک ہوتی ہو۔“ رییس شرارت سے بولا۔

بیوی ہوں تمہاری۔ تمہارا دل رکھنے کیلئے مجھے بھی تمہارے اس گندے کھیل میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ فی الحال یہ بتاؤ راتوں کو تم کہاں غیب رہتے ہو۔“ شازیہ نے حیا سے کہا۔

”یار شازیہ تم بھی کیاری کا سانپ بنا رہی ہو۔“ اس نے اسے سمجھایا۔ ”ہم رہتے ہیں شیر والی میں اور دکان ہے۔ چناب نگر میں کباڑ کا کام ایسا ہے کہ مال آتا جاتا رات کو ہی ہے۔ چناب نگر نزدیک تو ہے نہیں کہ ٹہلتا ہوا گھر آ جاؤں۔ رات کو آسانی سے آنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں اسلئے

دوکان پر ہی سو جاتا ہوں۔“

شوہر کی مجبوری سمجھ کر شازیہ نے بھی صبر کر لیا۔ اس رات رئیس وقت پر گھر لوٹا تو اس کے پاس ایک سی ڈی تھی۔ شازیہ کو دیتے ہوئے بولا ”دیکھو میں تمہارے لئے شوق کا سامان لے کر آیا ہوں۔ اسے چھپا کر رکھ دو سونے سے پہلے دیکھیں گے۔“ شازیہ نے سی ڈی الماری میں رکھ دی۔ کھانا کھانے کے بعد کنبے کے سبھی لوگ سونے کیلئے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تب رئیس نے سی ڈی پلیئر میں لگا کر چالو کی۔ مگر سکرین پر اس فلم کے جو مناظر ابھرے تو انہیں دیکھ کر شازیہ کی سانسیں جہاں کی تہاں رک گئیں۔

”اجی عورتیں اتنی بھی گندی ہوتی ہیں!“

”شازیہ۔۔۔ اسے گندہ پن نہیں بولتے نہیں کہتے ہیں۔ نئے زمانے میں سب کچھ ایسا ہی نیا نیا ہوتا ہے۔“ رئیس مسکرایا۔

”لعنت بھیجو ایسے نئے زمانے پر“ یہ کہہ کر شازیہ منہ ڈھک کر سو گئی۔

شازیہ اور رئیس کی شادی کو ایک سال سے کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ رئیس کا دیر سے رات کو گھر آنا یا پوری پوری رات غیب رہنا بدستور جاری رہا۔ رئیس کے باپ اسلام الدین کی آنکھیں رئیس کو اب اور زیادہ غصے سے گھورنے لگی تھیں۔ ماں بھی دبی زبان میں نہ جانے اسے کیا کہتی تھی۔ ماں باپ اور بیٹے کے درمیان کا یہ پوشیدہ مسئلہ کب تک راز رہتا۔ ایک دن شازیہ کے سامنے یہ راز کھل ہی گیا راز کیا کھلا شازیہ کی کھوپڑی ہی گھوم گئی وہ اس قدر فریب کا شکار ہو گئی اس کے لئے تصور تک کرنا مشکل تھا۔ وہ پوشیدہ راز یہ تھا کہ رئیس دوہری زندگی جی رہا تھا۔ رقیہ نامی لڑکی سے پانچ چھ سال سے اس کا معاشرتہ چل رہا تھا۔ گھر والوں کی رضامندی سے وہ رقیہ کو اپنی زندگی میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ ماں باپ کو ملوانے کیلئے وہ رقیہ کو گھر بھی لایا تھا لیکن عادات و خصائل سے وہ انہیں پسند نہیں آئی اسلئے اسلام الدین نے صاف انکار کر دیا۔ رقیہ کو اپنی بہو تسلیم نہیں کر سکتے۔ والدین بھلے ہی رقیہ کو بہو تسلیم کرنے کیلئے راضی نہیں ہوئے تھے لیکن رئیس اسے اپنی بیوی تسلیم کر چکا تھا اسلئے اس نے گھر والوں کی مرضی کے خلاف رقیہ سے شادی کر لی۔ اسلام الدین نے بھی صاف کہہ دیا شادی تم نے اپنی مرضی سے کی ہے اسلئے تمہاری بیوی کیلئے ہمارے گھر میں کوئی جگہ نہیں جہاں مناسب اور بہتر سمجھو رقیہ کو وہاں رکھو۔ رئیس کی دکان چناب نگر میں تھی اس نے دکان کے پاس ہی ایک کمرہ کرائے پر لے کر رقیہ کو وہاں رکھ دیا۔ اس کا زیادہ تر وقت رقیہ کے پاس ہی گذرتا تھا گھر وہ کم ہی آتا تھا۔ بیٹے کو ہاتھ سے بے ہاتھ ہوتے دیکھ کر ماں باپ فکر میں پڑ گئے کہ عشق میں باغی بیٹے کو کس طرح مٹا کر گھر لایا جائے اسلئے انہوں نے ایک چال چلی۔ انہوں نے بیٹے کے شادی شدہ ہونے کی بات چھپا کر شازیہ سے اس کی شادی کرادی۔ شازیہ بیوی بن کر گھر آ گئی اس کے باوجود رئیس رقیہ کے سحر سے نہیں نکل سکا۔ باپ اسے آنکھیں دکھاتا رہتا، ماں اسے سمجھا سمجھا کر ہار گئی مگر رئیس نے رقیہ کو اپنی زندگی سے الگ نہیں کیا۔ دراصل ہر آدمی کی زندگی میں بقدر ظرف ایک فارمولا ہوتا ہے وہ کچھ نہیں کرتا بس زندگی بھر اسے دہرایا جاتا ہے۔ ایک بار نہیں تو دوسری بار۔ دوسری بار نہیں تو تیسری۔۔۔ سارے سٹپس (steps) سمجھ لیتا ہے لیکن اس پر کسی بات کو کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سال بھر بعد شازیہ پر جب یہ راز کھلا تب تک رقیہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔ شازیہ کا تو جیسے جگر چاک ہو گیا۔ اس نے رئیس سے دونوں کو کہا۔

”اپنی دونوں بیویوں میں سے تمہیں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا یا تو رقیہ کو طلاق دے کر پوری طرح میرے ہو جاؤ یا پھر مجھے طلاق دے کر

اس رشتے سے مجھے آزاد کر دو۔ دو کشتیوں کے سوار کبھی پار نہیں اترتے کیونکہ تمہاری کشتیوں میں بھی سوراخ ہو چکے ہیں اور پھر مور یوں کو مگورے بننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔“ دو کشتیوں کے سوار نے خود کو مصیبت میں گھرا دیکھا تو فوراً چال چلی۔

”شازیہ پورے سماج کے سامنے میں نے تمہیں قبول کیا ہے اسلئے تمہیں طلاق دے پانا ممکن نہیں ہے نہ میں تمہیں طلاق دینا چاہتا ہوں کیونکہ رقیہ میری بیٹی کی ماں بن گئی ہے اسلئے اسے چھوڑ پانا بھی میرے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ تم مجھے کچھ ماہ کی مہلت دو تا کہ میں ایک بڑی رقم کا انتظام کر لوں اسکے بعد رقیہ کو مہر کی رقم کے علاوہ الگ سے کچھ پیسے دے کر اس سے نجات پا لوں گا۔“

شازیہ کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

”تم سچ مچ رقیہ کو چھوڑ دو گے؟“

”ہاں ہاں شازیہ میں سچ مچ رقیہ کو طلاق دے دوں گا۔ تم میری بات کا یقین کرو۔“

رئیس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ شازیہ نے اس کی بات پر یقین کر لیا لیکن کافی عرصہ گزر گیا مگر رئیس نے رقیہ کو طلاق نہیں دی طرح طرح کے بہانے بنا کر وہ شازیہ کو بہکا تا رہا۔ سال بھر بعد آخر شازیہ کی سمجھ میں آ گیا کہ رئیس رقیہ کو طلاق نہیں دینے والا۔ اسلئے وہ لڑائی جھگڑے پر آمادہ ہو گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رئیس زیادہ تر وقت چناب نگر میں ہی گزارنے لگا۔ اب شازیہ پھر رئیس سے طلاق کا مطالبہ کرنے لگی آخر روز روز کے لڑائی جھگڑے سے تنگ آ کر ایک دن رئیس نے شازیہ کو طلاق دے دی۔ شازیہ اپنا سارا سامان سمیٹ کر میکے چلی گئی تو میکے والے شازیہ کی دوسری شادی کی کوشش میں مصروف ہو گئے انہیں جلدی ہی کامیابی بھی مل گئی۔ انہیں سلیم پور میں رہنے والے انور کے بارے میں معلوم ہوا۔ چار پانچ سال قبل انور کی شادی مقامی لڑکی حسن جہاں سے ہوئی تھی۔ دونوں میں خیالاتی اختلافات تھے اس وجہ سے اس نے حسن جہاں کو طلاق دے دی تھی اور حسن جہاں نے جواب میں انور پر مقدمہ دائر کر دیا تھا جو زیر سماعت تھا۔ شازیہ کے میکے والے انور کے گھر والوں سے ملے تو بات بن گئی۔ زیر سماعت مقدمے کی پرواہ نہ کر کے شازیہ کا نکاح انور سے کر دیا گیا۔ شازیہ شیر کوٹ سے لاہور آ کر رہنے لگی۔ انور بے حد شریف پاکباز شخص تھا۔ کسی قسم کی جنسی کجروی اس میں نہیں تھی۔ اسکے ساتھ شازیہ بہت خوش تھی لیکن اس کی خوشیوں کو گھن تب لگا جب سابقہ شوہر رئیس اسے تلاش کرتا ہوا لاہور آ پہنچا۔ دراصل رئیس نے غصے اور جھٹلاہٹ میں شازیہ کو طلاق دے دی تھی لیکن بعد میں اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اسے دونوں بیویوں سے شازیہ کا انتخاب کرنا تھا۔ طلاق کے لائق تو رقیہ تھی اسلئے اس نے شازیہ کو پھر سے اپنانے کا فیصلہ کر لیا لیکن اب تک شازیہ انور کی بیوی بن چکی تھی۔

رئیس کا ایک دوست تھا فیروز۔ وہ شیر کوٹ کے ہی محلے لوہاری گیٹ میں رہتا تھا۔ رئیس نے اس سے مشورہ لیا تو وہ چمک کر بولا شازیہ کا نکاح انور سے ہو گیا ہے دوسرے ہی دن سے رئیس سلیم پور کے چکر لگانے لگا۔ شازیہ کے سسرال کے آس پاس وہ گھنٹوں منڈ لایا کرتا آخر کار ایک دوپہر کو شازیہ کا گھر سے نکلتے دیکھا تو اس کے پیچھے ہولیا۔ شازیہ نے رئیس کو پہنکار کر بھگا دیا۔ رئیس نے اس کی نہ سننے پر اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی۔ یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ مردہ ضمیر میں غیرت کہاں دوڑ جائے اور وہ کچھ کر گزرے جس کی توقع ہی نہ کی جاسکتی ہو۔ رئیس کی دھمکی کے مطابق مرنا تھا شازیہ کو لیکن مارا گیا انور۔ ایک دن شام کو سلیم پور جامعہ مسجد کے پاس واقع اکمل سٹوڈیو کے سامنے گولی مار کر اس کا قتل کر دیا گیا۔ مقتول

کے بھائی امین الدین نے گولی مار کر بھاگتے ہوئے دونو جوانوں کو دیکھا تھا اسلئے اس نے تھانہ سلیم پور میں واقعہ کی رپورٹ درج کرا دی۔ تھوڑی دیر میں تھانہ انچارج انسپیکٹر نقیب احمد۔ ایس آئی عبدالعلیم اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ موقع واردات پر پہنچے اور ضابطے کی کارروائی کرنے کے بعد پولیس نے لاش پوسٹ مارٹم کیلئے بھجوا دی۔

تفتیش میں جو حقائق سامنے آئے وہ حسن جہاں کے گھر والوں کو شک کے دائرے میں کھڑا کرتے تھے۔ انور کے شاز یہ سے نکاح کر لینے سے وہ اس سے ناراض تھے اور اسے جان سے مارنے کی مسلسل دھمکیاں دے رہے تھے۔ پولیس نے اسی بنیاد پر حسن جہاں کے گھر والوں کو اٹھالیا لیکن تفتیش میں وہ سب بے قصور ثابت ہوئے اسلئے انہیں چھوڑ دیا گیا۔ مقتول کی طرح اس کی بیوی کی بھی دوسری شادی تھی اسلئے عبدالعلیم نے واقع سے متعلق سراغ جمع کرنے کیلئے شاز یہ کے سابق شوہر رئیس کو بھی پوچھا تھا کیلئے بلانے کا فیصلہ کیا اور شاز یہ سے رئیس کا پتہ لے کر عبدالعلیم شیرکوٹ میں واقع اس کے گھر پہنچ گئے۔ گھر پر رئیس کی ماں اور بہن خیر النساء ملیں۔ پولیس کو دیکھ کر وہ دونوں گھبرائی ہوئی تھیں اور کوئی معقول اور اطمینان بخش جواب نہیں دے پا رہی تھیں۔ نہ انہیں یہ معلوم تھا کہ پچھلے دو دن سے رئیس کہاں ہے۔ اس سے رئیس خود بخود شک کے دائرے میں آ گیا۔ عبدالعلیم نے خیر النساء سے رئیس کا نمبر لے کر ڈائل کیا تو وہ بند ملا اس پر بھی رئیس پر انکا شک گہرا ہو گیا۔ انہوں نے موبائل کمپنی سے رئیس کی کال ڈیٹیل ٹریس کرائی تو تجسس خیز معلومات ملیں۔ حادثہ کے وقت رئیس کی لوکیشن سلیم پور میں تھی اور رات آٹھ بجے اس نے جعفر آباد میں واقع ناز سینما کے پیچھے رہنے والی اپنی دوسری بہن نشاء سے بات کی تھی۔ شک کی بنیاد پر عبدالعلیم نے نشاء کے گھر پر دستک دی تو رئیس وہاں مل گیا۔ رئیس کو تھانہ سلیم پور لے جا کر تفتیش کی گئی تو بے گناہ انور کے قتل کا راز کھل گیا۔ ہوا یہ کہ شاز یہ کے ذریعے دھتکارے جانے پر طے ہو گیا تھا وہ انور کو چھوڑ کر رئیس کے ساتھ نہیں جانے والی۔ دوسری طرف رئیس کسی بھی قیمت پر شاز یہ کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کیلئے رئیس اور فیروز سر جوڑ کر بیٹھے تو نتیجہ نکلا کہ اگر انور ہی اس دنیا میں نہ رہے تو شاز یہ بیوہ ہو جائے گی۔ اور عدت کے بعد رئیس سے نکاح کرنا اس کی مجبوری ہوگی اسلئے انہوں نے انور کو ہی قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ قتل کرنے کیلئے اسلحہ کی ضرورت تھی اسلئے فیروز اور رئیس نے شامی کے باشندے سدھیر سے ریوالتور اور گولیاں آٹھ سو روپے میں خرید لیں اس کے بعد گھات لگا کر انور کو قتل کر دیا۔ فیروز نے لاہور میں ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ رئیس کی نشاندہی پر اسی رات فیروز کو بھی گرفتار کر لیا۔ اسلحہ مہیا کرنے والے سدھیر کی گرفتاری دوسرے دن کی گئی۔ اس طرح رئیس عمر قید اور دوسرے دونوں ساتھی فیروز اور سدھیر بیس بیس سال کی قید بامشقت کاٹ رہے تھے۔

نیند کے جھونکے میں دیوار سے گرنے کی وجہ سے میری پیٹھ کی ہڈی میں چوٹ آگئی تھی اور ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ سیل سے اب مجھے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ وارڈ کی حدود میں چلتے ہوئے پیٹھ میں درد بہت ہوتا تھا۔ ادھر حالات ایسے تھے کہ رات کی بنیسیں ڈوب چکی تھیں۔ ہر دن ہمارے زخمی سینوں پر مونگ دینے کیلئے طلوع ہو رہا تھا۔ مختلف مافیاز کے محاصرے میں بھوکے پیاسے عوام کیلئے سورج سوانیزے پر تھا اور ہر شہر عملاً بیروشیما ناگا سا کی بن چکا تھا۔ ان گنت بھوکے بھیڑیے ہر طرف سے عوام کو بھینچوڑ رہے تھے۔ نچوڑ رہے تھے، نوج رہے تھے اور ان کا رہا سہا لہو چوس رہے تھے جبکہ جائے پناہ کہیں نہیں اور اگر کہیں تھی تو اس پر بھی سورج سوانیزے پر آچکا تھا۔ غیرت کے علم اور الم بردار کیا یہ بے غیرتی کی انتہا نہیں کہ ایک

مسلمان ملک میں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو ناپاک دودھ ملے۔ مریضوں کو جعلی دوائیں ملیں۔ کھانے کی ۹۹ فی صد اشیاء میں ملاوٹ ہو۔ انکی غیرت کبھی اس حقیقت پر غور کیوں نہیں کرتی کہ اس خود مختار ملک میں چنے کی دال مہنگی اور مینس سٹایسے ہوتا ہے۔ گھر کے اندر بھی غیرت کھانا سیکھو۔ سامراج سے ضرور لڑو لیکن جو سامراج اندر موجود ہے جو کینسر اور مافیا اندر سے ہمیں کھوکھلا کر رہا ہے کبھی ان کے خلاف بھی تو اپنی زنگ آلود تلواریں بے نیام کرو۔۔۔ پڑھو اسے اور پھر سفید پوش والدین کی اذیت اور دکھ درد بھی محسوس کرو۔ ذرا تصور کرو ان والدین کا جو اپنے پیٹ کاٹ کاٹ کر اپنی اولادوں کو نجی سکولوں میں پڑھا رہے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی کا بیٹا جہادی بنا۔؟ مجھ سے پوچھو کہ بھونکنا بہت آسان اور کاٹنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ دنیا اور ہمارے نام نہاد بھکاری خود مختاری کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ منہ کھائے تے اکھ شرمائے۔

پیٹھ کا درد کچھ اور بڑھ جانے کی وجہ سے مدرسے کے برآمدے میں لیٹی ہوئی تھی۔ اتنے میں چلچلاتی دھوپ میں ایک آدمی آیا تھا۔ گٹھلیا بدن لمبے بال، گندے کپڑے، لال آنکھیں، آتے ہی مجھے دھتکار تے ہوئے بولا۔
 ”فرش پر کیوں لیٹی ہو۔ کیا ہوا تمہیں؟“ میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور فوراً جواب دیا۔
 ”میری پیٹھ کی ہڈی فریکچر ہو گئی تھی۔“

اسے دیکھنے سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی تھی کہ یہ آدمی بہت غریب رہا ہوگا۔ میں نے بیٹھنے کو کہا۔ پہلے تو وہ ڈھیٹ بن کر کھڑا رہا۔ اور پھر بولا۔

”بیٹھو گا نہیں بتاؤ کیا بات ہے؟“
 ”بیٹھو گے نہیں تو کیا بات کروں ایک بات تو نہیں ہے جو کھڑے کھڑے کر دوں۔“ یہ نہیں کیا سوچ کر اب وہ ہاتھ کی چھوٹی لالٹی کو گھٹنے پر رکھ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ مجھے ماریہ کہتے ہیں۔ میں حقوق انسانی کی چیئر پرسن ہوں اور یہ بھی بتا دیا کہ کون لوگ ہمارے اپنے ہیں اور ہم لوگ انسانی حقوق کیلئے لڑتے ہیں۔

”میں کون ہوں تم جانتی ہو؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے اپنا نام سعادت بلوچ بتایا اور وہ جیل میں سزائے موت کا قیدی تھا۔ جس جرم میں اس کو سزائے موت ہوئی تھی وہ اسکی بیوی عرفہ کا قتل تھا جسکے اسنے بہتر ٹکڑے کر کے کھائی اور اور دریائے کی جھاڑیوں میں پھینکے تھے۔ میرے چہرے پر کسی طرح کا رد عمل ہوتے نہ دیکھ کر پوچھا ”ڈر گئی ہو کیا؟“

”نہیں ڈروں گی کیوں کوئی بھی انسان پیدا نشی تو ڈکیٹ نہیں ہوتا اس کے حالات اسے ڈکیٹ بناتے ہیں، قاتل بناتے ہیں اس سے میں انجان نہیں ہوں۔“

دھیرے دھیرے اس کے جڑے کی کسی ہوئی نسیم ڈھیلی پڑ گئیں۔ اسکے بیٹھنے کا انداز بدل گیا۔ پانچ منٹ پہلے والا رعب دار شخص ایک زخمی بچے جیسا بن گیا جیسے ماں کے پاس وہ اپنی چوٹ کا ذکر کر رہا ہو۔ اس نے اپنی پوری زندگی کی تذلیل کی کہانی سنا دی۔ سعادت بلوچ اپنے کنبے کیساتھ اشرافی ٹاؤن میں رہتا تھا۔ اسکے باپ احمد ظاہر غیر ممالک میں مین پاور سپلائی کرتے تھے۔ سعادت کے علاوہ انکا ایک دوسرا بیٹا

لیاقت بلوچ اور اکلوتی بیٹی نتاشہ تھی۔ سعادت شروع ہی سے پڑھائی میں تیز اور دماغ کا ذہن تھا۔ سعادت کی محنت اور ذہانت کے معیار کا اسی بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے دوبارہ پنجاب یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔ یونیورسٹی کی پڑھائی ختم کرنے کے بعد سعادت نے سافٹ ویئر انجینئر بننے کی سمت میں قدم بڑھائے تو اس کی قابلیت کے مد نظر ایک انسٹیٹیوٹ میں آسانی سے اس کا داخلہ ہو گیا۔ ایک دن ریسٹورنٹ میں سعادت کی ملاقات عرفہ سے ہو گئی۔ وہ ایم فل کر رہی تھی۔ عرفہ کا کنبہ آبائی طور سے فتح دلاز کارہنے والا تھا۔ کئی سال قبل اس کے والد ڈاکٹر فرحان چوہدری لاہور آ کر اسلام پارک میں بس گئے تھے۔ عرفہ کے علاوہ ڈاکٹر عرفان کے دو بیٹے تھے۔ گوہر چوہدری اور یاسر چوہدری۔ گوہر کی جنت کالونی میں بائیو کیمیکل فیکٹری تھی اور وہ اپنے کنبے کیساتھ خیاباں ٹاؤن میں رہتا تھا جبکہ یاسر کا سنگاپور میں ذاتی بزنس تھا۔ سب سے چھوٹی ہونے کے سبب عرفہ سب کی لاڈلی تھی۔ بھائیوں کی طرح وہ بھی اپنے بل بوتے پر کچھ کر دکھانا چاہتی تھی لیکن اس دن ریسٹورنٹ میں ایک کامن دوست کے ذریعے سعادت سے ملاقات کیا ہوئی۔ عرفہ کی زندگی میں خوشگوار موڑ آنا شروع ہو گئے۔ ملاقات پہلی تھی لیکن دونوں نے ہی محسوس کیا کہ ان کا تعارف صدیوں پرانا ہے۔ چہرے تو نہیں پہچان سکے مگر روح نے پہچان لیا ہے۔ محبت، محبت ہے اسے کسی بھی لفظ تصور یا خیال میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو ہر طرف ہے، ہر جگہ ہے۔ اسے خود میں سمونا ہوتا ہے۔ محبت کو لفظ نہیں وجود چاہئے ہوتا ہے بھر جانے کیلئے یہ جیسے جیسے بوند بوند بھر جاتی ہے تعصب، غصہ، نفرت، بے چینی، ملامت، بے چارگی اور کرب سب کچھ دھلتا جاتا ہے۔ کہیں بہ جاتا ہے اور وجود محبتی ہو جاتا ہے A loving person پھر انسان جدھر دیکھتا ہے، انسان جسے چھوتا ہے محبت ہوگی۔ سب اداسیاں محبت ہوگی، تنہائیاں بھی محبت۔ ایک ملاقات نے آئندہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سعادت اور عرفہ تقریباً روز ہی ملتے، باتیں کرتے اور پوری پوری رات جاگ کرتا رہے گنتے رہتے۔ ہر تارے میں انہیں محبوب کا عکس نظر آتا تھا۔ آخر ایک دن دونوں طرف سے اظہار ہو گیا۔ I love you۔ اسی دن سے دونوں کی کوسٹوری شروع ہو گئی۔ وہ روز ملتے فون پر لمبی لمبی باتیں کرتے لیکن چاہت کو دونوں نے ہی بے لگام نہیں ہونے دیا۔ پیارا اپنی جگہ تھا اور تعلیم اپنی جگہ۔ وقت پہ لگا کر اڑا۔ ایم فل کی ڈگری عرفہ کے ہاتھ میں آگئی اور سعادت کمپیوٹر انجینئر بن گیا۔ سنہرے مستقبل کے بند دروازے کی چابی اب دونوں کے ہاتھ میں تھی اس لئے ایک دن سعادت بولا۔

”عرفہ اب ہمیں شادی کر لینا چاہئے۔“

”ٹھیک ہے۔“ عرفہ نے عزم کیساتھ کہا۔ ”تم اپنے کنبے سے بات کرو میں اپنے گھر والوں کو اس رشتے کیلئے راضی کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

”اگر ہمارے گھر والے راضی نہیں ہوئے تب؟“

”ہم بالغ ہیں ہمارے سامنے دوسرے متبادل بھی کھلے ہوئے ہیں۔“

اسی شام عرفہ اور سعادت نے اپنے اپنے گھر پر بات کی۔ ڈاکٹر فرحان چوہدری ہوں یا احمد طاہر بلوچ دونوں ہی بھڑک گئے۔ ہمیں کسی بھی قیمت پر یہ شادی منظور نہیں۔ سعادت کے پیار میں عرفہ پاگل تھی تو عرفہ کیلئے سعادت دیوانہ۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کو شادی کیلئے راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ روئے گڑ گڑائے۔ پیار کی دہائی دی۔ بھوک ہڑتال کی لیکن اس رشتے سے نہ ڈاکٹر فرحان خوش تھے نہ احمد طاہر خوش تھے۔ ادھر

سعادت کو انہی دنوں میں امریکہ میں واقع ایک کمپنی میں پرکشش نوکری بھی مل گئی۔ نوکری جوائن کرنے سعادت امریکہ گیا تو عرفہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ کمپنی نے سعادت کو رہنے کیلئے عالی شان فلیٹ دیا تھا۔ اسلئے ان دنوں کو کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ سعادت کام پر چلا جاتا تو عرفہ گھر میں اکیلی بندرہ کر بور ہوتی رہتی۔ اس لئے اس نے خود بھی نوکری ڈھونڈنا شروع کر دی۔ سعادت کو اس بات کا علم ہوا تو وہ بھڑک اٹھا۔

”عرفی! کیا میں تمہیں خرچ کیلئے پیسے نہیں دیتا جو تم خود کمانا چاہتی ہو۔“

شوہر کی بات سن کر عرفہ سناٹے میں رہ گئی۔ وہ دقیانوسی خیالات کا تھا اور اس سے نوکری نہیں کرانا چاہتا تھا۔ وہ ضدی تھا تو عرفہ بھی کم ہیشی نہیں تھی۔ اسلئے ٹھان لیا تھا کہ وہ نوکری کرے گی تو اب اپنا فیصلہ بدلنے کو تیار نہیں تھی۔ آخر کار کئی دنوں کی بحث اور لڑائی جھگڑوں کے بعد جیت عرفہ کی ہوئی۔ کچھ شرطوں کیساتھ سعادت نے اسے نوکری کرنے کی اجازت دے دی۔ عرفہ کے ملازمت کرنے سے آمدنی تو ضرور بڑھ گئی مگر گھر کا سکھ چین جاتا رہا۔ گھر کا کوئی کام ہونے سے رہ جاتا تو سعادت چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔

”میں نے تمہیں نوکری کرنے کی اجازت اسی شرط پر دی تھی کہ گھر کا سارا کام تمہیں ہی کرنا ہوگا۔ تم شرط نہیں پوری کر پا رہی ہو۔ اسلئے نوکری کرنے کا تمہیں حق نہیں ہے آج ہی استعفیٰ دے دو۔“

عرفہ نوکری چھوڑنے کے موڈ میں قطعی نہیں تھی اسلئے آئے دن ہونے والے شوہر و بیوی کے جھگڑے نے سنگین رخ اختیار کر لیا جسکے نتیجے میں کچھ عرصہ قبل جو عرفہ سعادت کے سپنوں کی رانی تھی اس سے اب وہ بور ہونے لگا تھا۔ عرفہ کے کاموں میں مین میخ نکالتے رہنا بھی اس کی عادت بن گئی۔ عرفہ کو بھی لگنے لگا کہ سعادت کو دل کی رانی کی نہیں بلکہ گھریلو نوکرانی کی ضرورت ہے۔ جھگڑوں کے نتیجے میں میاں بیوی میں جب زیادہ اختلاف ہو گئے تو عرفہ نے نوکری چھوڑ دی۔ اس کے بعد اس نے اپنا سارا سامان سمیٹا اور سعادت کو بائی بائی کہہ کر لاہور لوٹ آئی اور سعادت سے اس کا رابطہ قطعی ٹوٹ گیا۔ عرفہ نے اپنے مستقبل کے بارے میں نئے سرے سے سوچنا شروع ہی کیا تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد سعادت روٹھی ہوئی بیوی کو منانے آپہنچا۔ سعادت نے اپنے برے برتاؤ کیلئے عرفہ سے معافی مانگی تو اس نے بھی ازدواجی زندگی کی تنگی کو دھو دینے کا فیصلہ کیا۔ صلح و صفائی ہو گئی تو عرفہ سعادت کیساتھ امریکہ چلی گئی۔ پھر عرفہ نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا اپنے کا نام انہوں نے علی حسن اور بیٹی کا نام انیلا۔ عرفہ کو یقین تھا کہ جڑواں بچوں سے اسکی ازدواجی زندگی کی ڈور اور مضبوط ہوگی لیکن ہوا اس کا الٹ۔ سعادت کے رویے اور دقیانوسی سوچ کی وجہ سے لڑائی جھگڑے نہیں رکے اور عرفہ گھریلو تشدد کا شکار ہوتی رہی۔ اسی طرح دن گذرتے رہے۔ کل کی محبت نے پل بھر میں کئی صدیاں سمیٹ کر قدموں میں ڈال دیں۔ ان پر نہ دھول تھی نہ کوئی نشان۔۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے اچانک وہ آج سے گلے مل کر الگ ہو گئیں۔ ساکت رہتے ہوئے بھی پیچھے بھاگی لیکن روکنے میں ناکام رہی۔ آنسو پیتی ہوئی وہ باہر کود بکھیتی تو اس وقت باہر کی فضا میں اندر سے بھی زیادہ گھٹن تھی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ کاروباری مندی کی آندھی چلی تو امریکہ بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا لہذا سعادت کی نوکری چھوٹ گئی اور اسے بیوی بچوں سمیت لاہور لوٹنا پڑا۔ لیکن امریکہ سے واپسی سے کچھ ہی دنوں بعد سعادت کو رائے ونڈ میں واقع ایک کمپنی میں نوکری مل گئی۔ بیوی بچوں کو لاہور چھوڑ کر سعادت اکیلا ہی رائے ونڈ چلا گیا۔

سعادت جس کمپنی میں نوکر ہو کر رائے ونڈ گیا تھا اس میں انسہ جبین نامی لڑکی بھی کام کرتی تھی۔ شوہر سے اس کی بنتی نہیں تھی اسلئے آپسی

اتفاق سے دونوں میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد انس نے ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا اور اپنے اکلوتے بیٹے کیساتھ وہاں رہنے لگی تھی۔ سعادت بیوی سے دور تھا تو انسہ شوہر کو ٹھکرا آئی تھی۔ مکمل وجود کے ہوتے ہوئے بھی انسہ اور سعادت ادھورے تھے لہذا دونوں کی دوستی جلد ہی گل کھلانے لگی۔ سعادت نے اپنا کرائے کا فلیٹ چھوڑ دیا اور انسہ کے گھر میں اس کے شوہر کی حیثیت سے رہنے لگا۔ معتبر ذرائع سے پتہ چلا کہ پڑوسیوں کا منہ بند رکھنے کیلئے ان دونوں نے کورٹ میرج کر لی۔ ادھر کسی بھی خواہ نے عرفہ کو فون کر کے اس آشنائی کی اطلاع دے دی تو وہ تھملا گئی۔ اس نے شوہر کے سامنے دو متبادل رکھے۔ یا تو بچوں سمیت میں تمہارے ساتھ رہنے کیلئے رائے وٹا آ جاتی ہوں یا پھر تم نوکری چھوڑ کر لاہور لوٹ آؤ۔ بعض اسباب کے سبب بیوی بچوں کو ساتھ رکھ پانا سعادت کیلئے ممکن نہیں تھا۔ اسلئے اس نے نوکری چھوڑ کر لاہور لوٹ آنے کا فیصلہ کر لیا۔ لاہور لوٹ کر اس نے عرفہ پر احسان جتانے کیلئے کہا تمہارے کہنے پر میں نوکری چھوڑ کر چلا آیا کیا یہ بات مجھے دودھ کا دھلا ثابت کرنے کو کافی نہیں۔ سعادت لاہور لوٹ آیا تھا کسی بھی قیمت پر عرفہ اب اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی اسلئے وہ اسے لے کر گنگوٹاؤن چلی گئی۔

وہاں پر انہوں نے شیر گڑھ میں واقع مغل پارٹمنٹ میں ایک فلیٹ لے لیا اور وہیں پر سعادت نے نوکری کی تلاش شروع کر دی چونکہ اس میں قابلیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اسلئے اسے جلد ہی ایک بڑی کمپنی میں پرکشش نوکری مل گئی لیکن خوشحالی کی یہ عمر زیادہ لمبی نہیں رہی۔ سعادت نے پھر وہی اپنا پرانا رویہ اختیار کر لیا عرفہ پھر سے گھریلو تشدد کا شکار ہونے لگی۔ جب اس کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا تو ایک دن اس نے گھریلو تشدد کی شکایت حقوق انسانی کمیشن میں کر دی۔ چونکہ عرفہ کو سعادت پر اعتماد نہیں رہا تھا اسلئے وہ خفیہ طریقے سے اس کی جاسوسی کرتی رہی تھی۔ اسی سے اسے معلوم ہوا کہ انسہ جنہیں کی اپنے شوہر سے دوبارہ ان بن ہو گئی تھی اس بار آپسی رضامندی سے نہیں بلکہ قانونی طور پر طلاق لے کر اس سے ہمیشہ کیلئے تعلق توڑ لینا چاہتی تھی اور چاہتی تھی کہ سعادت پھر سے اس کی زندگی میں آجائے۔ اس سمت سعادت بھی ملتفت تھا۔ عرفہ نے سعادت سے جواب طلب کیا تو وہ پھر سے گھریلو تشدد کا شکار ہونے لگی۔ میاں بیوی کا جھگڑا اسی طرح چلتا رہا اور اپنے موبائل سے عرفہ اپنے دکھوں کو میسے والوں کو بیان کرتی رہی۔

پھر یکا یک جب عرفہ کے فون آنا بند ہو گئے تو اس کا بھائی گوہر پریشان ہو گیا۔ وہ کال کرتا، گھنٹی بجتی لیکن کال ریسپونڈ نہیں کی جاتی تھی اسلئے مایوس ہو کر گوہر نے عرفہ کے موبائل پر پیغام بھیجنا شروع کر دئے۔ کافی دنوں بعد اسے میسج کا جواب میسج سے ملا۔ میں سکھی اور خوشحال ہوں مصروفیت کی وجہ سے کال ریسپونڈ کرنے یا کال بیک کرنے کا وقت نہیں مل رہا ہے۔ اس لئے اپنی خیریت کا پیغام بھیج رہی ہوں۔ میری طرف سے آپ لوگ بالکل پریشان اور فکر مند نہ ہوں۔ عرفہ کے پیغام سے گوہر مطمئن نہیں ہوا۔ اسلئے اس نے عرفہ کو موبائل پر مسلسل فون کرنا جاری رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرفہ کی بجائے سعادت نے کال ریسپونڈ کرنا شروع کر دی اور عرفہ سے بات کرانے کے بہانے بنائے لگا اس پر گوہر کو دال میں کچھ کالا نظر آیا تو وہ امر سدھو میں رہنے والے ایک دوست کو ساتھ لے کر گنگوٹاؤن جا پہنچا۔ عرفہ کا پاسپورٹ گوہر کے پاس تھا اسلئے پاسپورٹ لوٹانے کے بہانے گوہر نے اپنے دوست کو عرفہ کے گھر بھیجا۔ گھر میں سعادت اور دونوں بچے تو موجود تھے لیکن عرفہ نہیں تھی۔ سعادت نے بتایا کہ عرفہ شاپنگ کرنے بازار گئی ہوئی ہے جبکہ بچوں کا کہنا تھا کہ ماں بہت دنوں سے اپنی نانی کے گھر گئی ہوئی ہے۔ دوست نے واپس لوٹ کر یہ ساری باتیں گوہر کو بتا دیں تو اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اسلئے وہ فوراً شیر گڑھ کی پولیس چوکی بندال پہنچا۔ چوکی انچارج اکرام اللہ کو اس نے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے درخواست کی کہ اس

کی بہن عرفہ کے بارے میں سعادت سے پوچھتا چھ کریں۔

اکرام اللہ کچھ ماتحت پولیس والوں کو ساتھ لے کر بلاتا تاخیر سعادت کے گھر پہنچے۔ گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ فلیٹ کے مالک احمد جاوید نے بتایا کہ سعادت اپنے دونوں بچوں کو اپنی کار میں لے کر کہیں گیا ہے۔ اکرام اللہ نے موبائل فون سے سعادت سے رابطہ قائم کیا تو وہ فیروز پور روڈ پر مل گیا۔ اسے فوراً فلیٹ پر آنے کیلئے کہا گیا۔ سعادت نے فلیٹ پر آ کر کہا کہ ایک دن شاچک کیلئے عرفہ مجھ سے چالیس ہزار روپے مانگ رہی تھی۔ جبکہ میں اسے بیس ہزار روپے سے ایک پیسہ بھی زیادہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ اسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ غصہ میں اس نے اس کا خون کر دیا۔ اکرام اللہ نے پوچھا۔

”عرفہ کی لاش کہاں ہے؟“

”اس کے اندر۔“ سعادت نے پاس رکھے ڈیپ فریزر کی طرف اشارہ کیا۔

اکرام اللہ نے فریزر کا ڈھکن کھولا تو اس میں پولی تھین بیگ میں عرفہ کی لاش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ملے۔ حیوانیت کی انتہا تھی۔ سعادت نے اقبال جرم کرتے ہوئے بتایا کہ عرفہ کو قتل کرنے کے بعد اس نے لاش باتھ روم میں رکھ کر باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ اگلے دن پاور ہاؤس فیروز پور روڈ پر واقع ایک دکان سے پتھر کاٹنے کی ایک مشین اور سریا کاٹنے والے کچھ ہلیڈ خرید لایا۔ انہی اوزاروں سے اس نے عرفہ کی لاش کے بہتر ٹکڑے کئے۔ اب اس کا منصوبہ ایک ایک کر کے ان ٹکڑوں کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ ان میں سے آٹھ دس ٹکڑوں کو تو وہ ٹھکانے لگا بھی چکا تھا۔

گمشدگی کا معمولی سا دکھائی دینے والا معاملہ ایسا لرزہ خیز نکلے گا کہ اکرام اللہ نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسلئے انہوں نے اس سنسنی خیز واقعہ سے اعلیٰ پولیس افسران کو بھی واقف کرایا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مغل اپارٹمنٹ پولیس چھاؤنی میں تبدیل ہو گیا۔ دراصل سعادت عرفہ سے اوب چکا تھا اور اس سے نجات پا کر دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ سعادت کی دوسری بیوی انسہ جیس بھی بن سکتی تھی۔ اس کے علاوہ دونوں بچوں کو لے کر امریکہ بھاگ جانے کا بھی منصوبہ تھا۔ اگلے ہی دن گوہر کی تحریر کی بنیاد پر سعادت کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر لیا گیا اور سعادت کو چار یوم کے ریمانڈ پر لے لیا۔ اب پولیس کے سامنے سب سے اہم کام عرفہ کی لاش کے ٹھکانے لگا دئے گئے ٹکڑوں کو برآمد کرنا تھا۔ سعادت نے پولیس کو بتایا کہ اس نے پولی تھین بیگ میں رکھ کر لاش کے کچھ ٹکڑے الرجم پارک کی کھائی میں اور کچھ راوی کی جھاڑیوں میں پھینکے تھے۔ سعادت کی نشاندہی پر پولیس نے عرفہ کی ٹانگ کا ایک پنجہ برآمد کر لیا۔ اس کے علاوہ پولیس کو اور کچھ نہیں ملا تھا۔ بعد میں عدالتی حکم پر پولیس نے عرفہ کے دونوں بچوں کو اس کے ماموں گوہر کو سونپ دیا تھا اور یہ بد نصیب شخص اب سزائے موت کا قیدی تھا۔

صفرا کے حصے کا تھوڑا کام ہر روز فوریہ بی بی کر دیا کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر بہت دنوں تک محسوس نہیں ہوا کہ یہاں کوئی صرف دوسروں کی مدد کرنے کیلئے چاروں طرف لپائی پتائی کر کے صاف رکھنے کیلئے صبح گلے میں دوپٹہ ڈال کر جیل کی سرخ دیواروں کو سلام کرنے نہیں آتا تھا۔ وہاں جو بھی رہتے تھے سب کے سب مجرم تھے۔ سزا یافتہ مجرم تھے۔ سماجی دار الشفا کے کیڑوں کو چن چن کر وہاں رکھا گیا تھا۔ جیل کی زندگی سے جان چھڑانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اس گھٹیا چیونٹم سے جو گھنگریا لے بالوں سے چپک جائے تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بد صورت جمہوریت ڈکے کی چوٹ پر عوام

سے انتقام لے رہی تھی۔ یہ ڈائن عوام کو سکا سکا کرتین شفٹوں میں مارے دے رہی تھی۔ اس نے عوام کو بری طرح نڈھال اور کنگال کر دیا تھا۔ عوام پر ہر طرح سے یلغار جاری تھی۔ بدترین المیہ یہ کہ عوام بھی عوام کیساتھ کچھ کم نہیں کر رہے تھے۔ مہنگائی کے تباہ کن ریلے پر میں نے ایک قیدی سے پوچھا ”اس قدر مہنگائی میں عام آدمی کا جینا ممکن نہیں تو ہوگا کیا؟“

”فکر نہ کرو کیونکہ ہر مہنگائی بہت سے لوگوں کی مزید کمائی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔“ قیدی نے زہریلی ہنسی کیساتھ جواب دیا تو ریڑھ کی ہڈی میں سائبیریا کی سرد لہر دوڑ گئی۔ بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ عوام کی بھاری اکثریت مہنگائی نہ صرف پاس اون (Pass on) کرتے ہوئے اسے واقعی مزید کمائی کا ذریعہ بنالیتی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر کو اگر ایک سو روپیہ فیس بڑھانی چاہئے تو وہ تین سو روپے کا اضافہ کرتے ہوئے اسے جائز بلکہ ہذا من فضل رہی سمجھے گا۔ ٹرانسپورٹر کو اگر ایک روپیہ فی کلومیٹر بڑھانے کی مجبوری ہے تو وہ تین یا پانچ روپے فی کلومیٹر کے حساب سے کرایہ میں اضافہ کر دے گا۔ بیکری والے سے لے کر پرچون فروش تک اور پھل بیزی والے سے لے کر ڈرگ سٹور تک، رشوت لینے والے سے لے کر کمیشن خور تک ہر کوئی مہنگائی کو مزید مہنگائی کیلئے استعمال کر رہا ہے اور تباہ ہو رہے ہیں خالص عوام۔ جو مختلف مجبوریوں کی بنا پر مہنگائی کو کمائی کا ذریعہ نہیں بنا سکتے ورنہ سچ یہ ہے کہ مہنگائی کے ہر راوند پر ریڑھی والے سے لے کر چھابڑی والے تک ہر کوئی مہنگائی کی غلیظ گنگا میں اشرار کر کے خود کو پوتر سمجھ رہا تھا۔ بات فوزیہ ہی کی نہیں یہاں کسی کیلئے بھی خیر کی خبر نہیں۔ جیل میں ہر طرف بے چارگی کی صف ماتم پکھی ہوئی تھی اور بے بس قیدی اپنے چھوٹے بڑے جرائم کیساتھ دھکتے کونکلوں پر ننگے پاؤں محو ماتم تھے۔ میں کاغذ سے اپنے ہم نوا قیدیوں کے آنسو نہ پونچھ سکوں تو میری یہ قید کس کھاتے کی۔ ریاض مجید نے کہا تھا۔

میں تجھے بھول جاؤں اگر

میرا دہنا ہاتھ اپنا ہنر بھول جائے۔

فوزیہ نے اپنے شادی والے دن اپنے محبوب عدنان کے ہاتھوں اپنے شوہر ولید حسن کو قتل کروا دیا تھا۔ اس دن شہنائی کی آواز سریلی اور مسحور کن تھی۔ اس سے شادی حال میں جیسے جان سی پڑ گئی تھی۔ لڑکی والے بارات اور دلہا کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ اندر دلہن بنے خوبصورت فوزیہ بی بی کو سہیلیاں، رشتے کی بھابھیاں اور بہنیں گھیرے چھیڑ رہی تھیں اور گھر کے باہر لگا شامیانہ پھولوں اور بجلی کے رنگین قلموں سے جگمگا رہا تھا۔ سارا ماحول بے حد خوشنما اور خوشیوں سے بھرا تھا۔ دلہن کے والد امتنان علی پگڑی باندھے باہر کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ اچانک شور مچا دلہا آگیا دلہا آگیا۔ پھر تو ساری کی ساری لڑکیاں فوزیہ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ ولید حسن کے گھوڑی سے اترتے ہی امتنان علی نے اس کا استقبال کیا اور رسم پوری کر کے اندر لے گئے۔ باراتیوں کیلئے زمین پر موٹی دری بچھا کر اس پر موٹے موٹے گدے ڈالے گئے تھے۔ پھر اس کے اوپر قالین بچھا کر بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ٹیک لگانے کیلئے گاؤں تکے رکھے گئے تھے۔ باراتیوں کو ناشتہ کرایا جانے لگا تھا۔ دلہن والوں کی خاطر و مدارت سے باراتی خوش تھے۔ ولید حسن اپنی ہونے والی دلہن فوزیہ کے خوابوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے دوست اور اس کے ہم عمر رشتے دار اسے چھیڑ رہے تھے۔ اچانک بجلی گل ہو گئی۔ چاروں طرف شور ہونے لگا۔ جلدی جنریٹر چلاؤ۔ جنریٹر چلانے والا جنریٹر چلانے گیا تو پتہ چلا کہ جنریٹر خراب ہے۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ روشنی کا انتظام ہو پاتا اس سے پہلے ہی دل دہلانے والی ایک مردانہ چیخ

گوئی۔ سبھی چونکے افراتفری مچ گئی۔ تبھی کوئی موم بتی جلا کر لے آیا۔ موم بتی کے اجالے میں لوگوں نے جو دیکھا اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئیں۔ دلہا ولید حسن خون سے لت پت پڑا تھا۔ اس پر چاقوؤں سے اتنے وار کئے گئے تھے کہ شمار کر پانا مشکل تھا۔ ذرا سی دیر میں کھرا مچ گیا۔ سبھی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

ولید حسن کے دوستوں نے اسے کار میں ڈالا اور قریبی ہسپتال لے گئے لیکن ڈاکٹروں نے اسے دکھتے ہی مردہ قرار دے دیا۔ ہنسی خوشی کا ماحول لمحے بھر میں ماتم میں بدل گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ کسی نے فون کر کے اس حادثہ کی خبر پولیس کو دی۔ اطلاع پا کر تھانہ رسول پور کے انچارج بلال احمد اور سب انسپکٹر علی ارشد آٹا فائنا میں پولیس کے ساتھ موقع واردات پر پہنچ گئے۔ پولیس نے موقع واردات کا معائنہ مختلف پہلوؤں سے کیا اور ولید حسن کی لاش کے فوٹو کھینچوائے اور پنجمائے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد پولیس نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھتا چھ شروع کی۔ لیکن وہاں کوئی بھی کچھ نہیں بتا پایا۔ دراصل کسی نے کچھ دیکھا ہوتا یا کسی کے علم میں ہوتا تب تو کچھ بتاتا۔ جب پوچھتا چھ چل رہی تھی تبھی امتنان علی کی ایک قریبی رشتہ دار نے ہمت جمع کر کے تھانہ انچارج بلال احمد کو بتایا۔

”سر! اچانک لاسٹ چلی گئی تھی اسی وقت میں نے اندھیرے میں عدنان کو اُس طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جہاں دولہا بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن جب لاسٹ آئی تو وہ وہاں نہیں تھا۔ ممکن ہے اس واردات سے اُس کا کوئی تعلق ہو۔“

انسپکٹر کو اس شخص کی باتوں میں دم نظر آیا۔ وہ فوراً عدنان کے گھر کی طرف چل دیے۔ اس کا گھر امتنان علی کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ انہوں نے نیل بجائی تو دروازہ عدنان کے دادا خلیل احمد نے کھولا۔ وہ دروازے پر پولیس کو دیکھ کر چونک گئے۔

”عدنان کہاں ہے؟“ انسپکٹر نے اُن سے پوچھا۔

”وہ دوسری منزل میں اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔“ خلیل احمد نے بتایا۔ علی ارشد سڑھیاں چڑھ کر سیدھے عدنان کے کمرے میں جا پہنچے۔ عدنان واقعی سو رہا تھا۔ انہوں نے اس کا کالر پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”بول تو نے ولید حسن کا قتل کیوں کیا؟“ عدنان ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نہایت پرسکون لہجے میں بولا۔

”سر! ولید حسن کا قتل میں نے ہی کیا ہے۔ لیکن یہاں آپ مجھ سے کچھ نہ پوچھئے۔ آپ کو جو بھی پوچھتا چھ کرنی ہے اس کے لیے مجھے تھانہ لے چلئے۔ میں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔“ انسپکٹر بلال جلد سے جلد معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے تھانہ میں ایک بند کمرے میں انہوں نے عدنان سے پوچھتا چھ شروع کر دی۔ عدنان نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ پیار میں اندھے عدنان کی محبت کی کہانی سن کر بلال ششدر رہ گئے۔

الہ آباد کے محلہ سید گنج میں امتنان جدی پشتی مکان تھا۔ اس کے کنبے میں بیوی جویریہ کے علاوہ ایک بیٹی فوزیہ اور ایک بیٹا اظہر تھا۔ ان کی گزشتہ خوشحال تھی۔ اتقان علی ایک دربار میں متولی تھے۔ ان کے پڑوس میں احسان الہی رہتے تھے۔ عدنان احسان الہی کا دوسرے نمبر کا بیٹا تھا۔ فوزیہ سے دو سال بڑا تھا۔ بچپن ہی سے دونوں ساتھ ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ شاید اسی وجہ سے جوان ہونے پر وہ انجانے میں ہی ایک دوسرے سے پیار کرنے لگے تھے۔ موقع ملتے ہی وہ دونوں گھر سے نکل جاتے اور کسی پارک میں بیٹھ کر گھنٹوں محبت کے تاج محل بناتے رہتے۔ سیانی

لڑکی کو لڑکے کے ساتھ گھومتے دیکھ کر محلے والے کا نا پھوسی کرنے لگے۔ اس کی بھنک فوزیہ کی ماں کے کانوں میں پڑی تو انہوں نے بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بیٹی اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ اس طرح تمہارا عدنان کے ساتھ گھومنا پھرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ اب لوگ انگلیاں اٹھانے لگے ہیں۔ تم اپنا چال چلن ٹھیک رکھو۔ ورنہ ہماری بدنامی ہوگی۔ پھر کتنا دکھ ہوگا ہمیں۔ دوسروں کو اپنے بارے میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر دلی دکھ ہوگا۔“

لیکن فوزیہ نے ان کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ بیٹی کی بغاوت سے جو یہ حیران رہ گئی۔ انہیں ڈر لگنے لگا کہ بالغ ہو چکی فوزیہ کے قدم کہیں بہک ہی نہ جائیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ وہ کیا کریں۔ کیونکہ ان کے شوہر کو دربار سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔

عدنان چھوٹا تھا تبھی اس کی ماں مر گئی تھی۔ اسے اس کی دادی فاطمہ نے پالا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس کے باپ احسان الہی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس کے بعد احسان الہی الگ ہوا تو دادی نے مکان کا ایک بڑا حصہ عدنان کے نام کر دیا۔ اس کی دادی اپنے جیتے جی عدنان کی شادی کر دینا چاہتی تھی۔ اس بات کا علم فوزیہ کو ہوا تو وہ عدنان کے گھر جا کر غصے سے بولی۔

”سنا ہے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔“

”تم نے صحیح سنا ہے۔ میں نے لا کھ منع کیا لیکن دادی کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ کہتی ہیں کہ اب میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔“

”ٹھیک ہے تمہارے گھر میں ایک بیوی کی ضرورت بھی ہے۔“ کہتے کہتے فوزیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”نہیں فوزیہ۔ میں کسی دوسری لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ جذبات میں بہتے ہوئے عدنان نے فوزیہ کا ہاتھ تھام کر کہا ”بچپن سے

میں نے تمہیں چاہا ہے۔ تمہارے ہی خواب دیکھے ہیں۔ اب میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا فوزیہ۔“

”عدنان میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

”ٹھیک ہے میں آج ہی اس شادی کے لیے منع کر دیتا ہوں۔“ عدنان نے ایک عزم کے ساتھ جواب دیا۔

عدنان نے شادی سے انکار کیا تو دادی نے اس بات کو ہنسی میں اڑا دیا۔ اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس لیے شادی سے انکار نہیں ہو سکتا تھا۔

شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ عدنان نے فوزیہ سے کہا کہ شادی سے انکار اب اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ مجبور ہے۔ فوزیہ اس کا منہ بکتی رہ گئی۔ اس کے بعد عدنان کی شادی ہو گئی۔ گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر فوزیہ نے دیکھا کہ باجے گا بجے کے ساتھ عدنان حرا کو بیاہ کر لے آیا ہے۔ اگلے

دن خون کا گھونٹ پی کر فوزیہ مان کے ساتھ عدنان کے ریسپیشن پر گئی تھی۔ اس نے دیکھا حرا اس سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ اُسے لگا کہ اتنی حسین بیوی پانے کے بعد عدنان اُسے بھول ہی جائے گا۔ یہی سوچ کر وہ اس رات سو نہیں سکی تھی۔ سارے دن کی تھکن سے چور۔۔۔ آرام سے بستر پر لیٹی تو

بھول ہی گئی کہ نیند کے آنچل میں چھپے تھکے تھکے وہ خواب بھی تو ہیں۔ جن کا ساتھ دینا بھی باقی ہے۔

اگلے دن رات اٹھ بچے فوزیہ عدنان سے ملی تو روتے ہوئے بولی!

”اتنی خوبصورت بیوی پانے کے بعد تو تم مجھے بھول ہی جاؤ گے۔“

”ایسی بات نہیں ہے فوزیہ۔ میں ہمیشہ تمہارا ہی رہوں گا۔“ عدنان نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ فوزیہ نے عدنان کے سینے میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک دوسرے میں سما گئے۔ ادھر عدنان اپنی محبوبہ کے ساتھ موج مستی کر رہا تھا ادھر سہاگ بیچ پر دھجی بیٹھی حرا عدنان کا انتظار کر رہی تھی۔ پھر سوچوں سوچوں میں ایک خوف ایسا طاری ہو گیا کہ دیر تک دیوار پر وال کلاک کی ٹک ٹک چھائی رہی۔

رات تین بجے کے آس پاس عدنان نے کمرے میں قدم رکھا تو حرا کو لگا کہ اس کا شوہر آ کر اب گھونگھٹ اٹھائے گا۔ لیکن اس کے سارے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جب عدنان اس سے بغیر کچھ کہے سنے چپ چاپ پلنگ پر ایک کنارے لیٹ کر آنکھیں موند کر سو گیا۔ شوہر کی اس حرکت پر حرا ہکا بکارہ گئی۔ گزرتی ہوئی رات کی سیاہی پر جب ایک آنسو گرا تو پل بھر کو روشنی پڑی۔۔۔۔۔ یہ چمک نچوگ کی وہ گھڑی تھی جو ساری عمر پر بھاری ہوتی ہے۔

حرارت بھر اس کا انتظار کرتی رہی۔ وہ آتا مگر پیار کرنا تو دور اس سے بات تک نہیں کرتا تھا۔ عدنان کی یہ بے رخی حرا سے برداشت نہیں ہوئی تو چوتھے دن اس نے اس سے ہی پوچھ لیا۔

”آخر آپ مجھ سے ایسا برتاؤ کیوں کر رہے ہیں؟ کیا برائی میں مجھ میں یا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟“

”تم میں کوئی برائی نہیں ہے اور نہ ہی تم نے کوئی غلطی کی ہے۔ ہم دنیا کی نظروں میں بھلے ہی میاں بیوی ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں کسی اور کو اپنا تن من دے چکا ہوں۔ میرے گھر والوں نے زبردستی میری شادی تم سے کی ہے۔ میری غلطی یہ ہے کہ میں ان کی بات کی مخالفت نہیں کر سکا۔ میں نے تم سے مجبوری میں شادی کی ہے۔ اس لیے خراج مجھے معاف کر دو۔“ حرا رو پڑی تھی۔ لیکن جب وہ میسے گئی تو اس نے اپنی ماں کو سب کچھ بتا دیا۔ اس کی ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بیٹی! اس مسئلہ کو صرف تم ہی سلجھا سکتی ہو۔ شوہر کو اپنی فیور میں کرنے کی کوشش کرو۔ گھر کا مسئلہ گھر میں ہی سلجھانا ٹھیک ہے۔ بات باہر آ گئی تو لوگ ہنسیں گے۔ صبر سے کام لو اور اس پر اپنے حسن کا جادو چلاؤ۔ جب موسم بدلنے پر نہیں آتے اور ایک طویل مدت کے لیے اپنے وسط میں ٹھہر جاتے ہیں تو پھر ہم اپنے اندر کے موسم تبدیل کرنے لگتے ہیں۔“

ادھر عدنان اور فوزیہ کا ملنا جلنا پہلے کی طرح جاری رہا۔ فوزیہ کا کمرہ پیچھے کی طرف تھا۔ وہ اپنے کمرے میں اکیلی ہی سوتی تھی۔ ایک رات عدنان نے اس کے دروازے پر دستک دی تو اپنے محبوب کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اپنی خوبصورت بیوی کو چھوڑ کر اس کا محبوب اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ عدنان سے لپٹ گئی۔ دونوں ایک ہو گئے۔ اس کے بعد تقریباً روز ہی دونوں ملنے لگے۔ لیکن دونوں کا یہ ناجائز تعلق زیادہ دیر تک لوگوں کی نظر سے چھپا نہیں رہا۔ لوگوں کے لیے یہ چٹ پٹا مسالہ تھا۔ دونوں کے کنبے والوں کو بھی علم ہو گیا تھا۔ عدنان شادی شدہ تھا۔ اس لیے امتنان علی نے بھی فوزیہ کے ہاتھ پہلے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

رحمت آباد کے رہنے والے طارق علی کے اکلوتے بیٹے ولید حسن سے فوزیہ کی شادی طے ہو گئی۔ ولید حسن یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس ڈگری لے چکا تھا۔ انہی دنوں منگنی ہوئی اور شادی کی تاریخ رکھی گئی۔ شادی طے ہونے کے بعد فوزیہ نے عدنان سے روتے ہوئے کہا۔

”عدنان میں نے اپنا سب کچھ تمہیں سوپ دیا ہے۔ اب میں نہیں چاہتی کہ کوئی دوسرا مرد مجھے ہاتھ لگائے۔“

”شادی تک وہی کرو جو تمہارے گھر والے کہتے ہیں۔“

اس کے بعد عدنان نے فوزیہ کو اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔

شادی والے دن عدنان نے جزیئر والے کو کچھ روپے دے کر پانچ منٹ تک جزیئر خراب ہونے کے بہانے بند رکھنے کے لیے راضی کر لیا۔ اس نے مین سوئچ آف کر کے بجلی گل کر دی۔ جزیئر آپریٹر نے خراب ہونے کا بہانہ کر کے جزیئر چالو نہیں کیا اور اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر عدنان نے پیچھے سے ولید حسن کا منہ دبا کر دھار دار چاقو سے اس کے جسم پر ان گنت وار کر کے آخری وار گردن پر اس طرح کیا کہ ولید حسن کی فوری موت ہو گئی۔ تاریکی کی وجہ سے کوئی اسے دیکھ نہیں پایا۔

تھانہ رسول پور پولیس نے عدنان کے خلاف مقدمہ قتل درج کر کے سازش میں شامل ہونے کے جرم میں جزیئر آپریٹر اعجاز علی اور فوزیہ کو بھی گرفتار کر لیا۔ جہاں سے انہیں جیل بھیج دیا گیا۔

اس دن میں صبح سے سوچ رہی تھی کہ انسان اگر بے حسی، بے شرمی، بے حیائی کی زرہ بکتر زیب تن کر لے تو زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ کوئی شرمندگی، ندامت، خجالت، ناسف، کچھتاوا، احساسِ زیاں اس کے نزدیک بھی نہیں پھٹک سکتا۔ جبکہ احساسِ آدمی کے لیے زندگی کسی امتحان سے کم نہیں۔ مثلاً اکثر لوگ یورپ امریکہ وغیرہ ہستے کھیلتے جاتے ہیں اور ہستے کھیلتے واپس آ جاتے ہیں۔ میں جب بھی گئی تھی وہاں پہنچ کر بھی جلتی کڑھتی رہتی تھی اور واپس آ کر بھی ہفتوں سوچتی رہتی تھی کہ ہم جو ہر اچھائی کے ٹھیکیدار ہیں۔ کفار مغرب کے مقابلے پر اس قدر گرے ہوئے اور گئے گزرے کیوں ہیں؟ وہاں گندگی دکھائی نہیں دیتی یہاں صفائی نظر نہیں آتی۔ وہاں نظم و ضبط اپنی انتہا پر، یہاں بے سمت بھگدڑ زدہ ہجوم، وہاں پر آپ دو نمبر دوائی اور ملاوٹ زدہ خوارک کا تصور تک نہیں کر سکتے، یہاں دونوں نایاب۔ انتہائی کہ جاسن دھوکے تو جاسن رنگ اترنے لگتا ہے۔ ہم دعائے سفر سے آغاز کرتے ہیں اور ہماری ٹرینیں کئی کئی گھنٹے لیٹ ہوتی ہیں۔ ان کے ٹیوب شیڈز پر گاڑیاں منٹ منٹ بعد مسلسل بروقت پہنچتی ہیں کہ ایک بھی منٹ بھر لیٹ ہو جائے تو پورا نظام تھس تھس ہو جائے اور یہ سب سسٹم بغیر کسی بھی دعائے سفر کے رواں دواں ہے۔ کیونکہ ان کی نیتیں ہی دعائیں بن چکی ہیں۔ وہاں حکمران آتے ہیں ڈیوٹی سمجھ کر اپنی ٹرم پوری کر کے یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے کبھی آئے ہی نہ تھے۔ یہاں باپ دادا، پڑدادا پیراں تسمہ پا اور اگر کسی غیر خاندانی کے پاؤں تلے بیڑ آ جائے تو وہ بھی جو تک کی طرح چپک کر اس چکر میں پڑھ جاتا ہے کہ پورا خاندان ہی ایوان میں پہنچا دے۔ ان کا بس نہیں چلتا ورنہ یہ اپنے نوزائیدہ پوتوں، پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو بھی اقتدار میں پہنچا کر کہیں شاباش خوب پچھیاں بوٹیاں کرو کیونکہ یہ ملک تمہارے دادا نانا کی جاگیر ہے۔ وہاں فسادات بھی پھوٹ پڑیں تو بڑے سے بڑا ہتھیار ہے بیس بال کا ڈنڈا اور یہاں فتنوں پر بھی فائرنگ۔ قبضہ مافیا، شوگر مافیا، ملک مافیا کہ اس ملک میں وہ دودھ بک رہا ہے جو مہذب دنیا میں کب کا مین ہو چکا۔۔۔۔۔ کہیں ڈرگ مافیا کہیں تاروان مافیا۔ کشم یوڈی سی اور ریونیو کے پٹواری تک ارب پتی۔ جو کرپٹ ترین ہیں وہ کرپشن کے بارے سب سے زیادہ اونچی آواز میں بولتے ہیں۔ بدکار ترین کردار سازی میں مصروف۔ جاہل ترین علم کے سرچشمے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے بھی ہمیں مکمل طور پر رامیٹ آف کر دیا ہے کہ مین میڈ

مصیبتوں کے علاوہ قدرت بھی ہمیں سزا دینے پر تکی ہوئی ہے کہ بھوک، تنگ، بیروزگاری، قتل و غارت، اغواء، زیادتی، لائینڈ آرڈر کا فقدان، لوڈ شیڈنگ، مہنگائی و ذاتی کارنامے ہی ہیں۔۔۔ غیب سے بھی ہولناک آفتیں نازل ہو رہی ہیں۔ مثلاً سیلاب، بارشیں رہی سہی کسر نکال رہی ہیں۔ ظلم کی سزائز لے، سفاکی کی سزا سیلاب، بے رحمی اور بے حسی کو سزا بارشیں لیکن بے حسی کی برف ہے کہ پگھلنے کا نام نہیں لے رہی۔ شاید اسے سورج کے سوانیزے پر آ جانے کا انتظار ہے۔ اور حقیقت صرف اتنی ہے کہ جب روم جل رہا تھا تو صرف نیرو بانسری بجا رہا تھا۔ جبکہ یہاں نیرو سے لے کر تھو تک سب اپنی اپنی بانسریاں بجا رہے ہیں۔

نوزیہ وغیرہ جس سیل میں رہتی تھیں۔ وہاں جنوبی پنجاب سے آئی ہوئی ماہم بھی تھی۔ جس کا تعلق کسی سیاسی خاندان سے تھا۔ خاندان کے بڑے پن کی بات اس کی باتوں سے جھلکتی تھی۔ میں اس کے پاس کھڑی ہوتی تو اس کے بڑے پن کو دیکھتی رہ جاتی تھی۔ یہاں آنے کے بعد میں نے پہلے دن جب اس کو دیکھا تو سوچا تھا کہ یہ کوئی وارڈن ہے۔

میری غلط فہمی دور ہونے کے بعد کئی دنوں تک وہ مجھے چائے اور بسکٹ کھلاتی رہی تھی۔ میں نے بعد میں دیکھا کہ اس شہری لڑکی کے ساتھ کئی لوکیں میں آئی ہوئی لڑکیوں کی دوستی تھی۔ وہ ڈویژن پر بھی نہیں تھی اور ہونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کے گھر سے قیمتی سامان آنے کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ 48 سالہ ماہم کے شوہر کا نام علی حیدر تھا۔ وہ مانگاویز کے اجمیر ڈپو میں ملازم تھے۔ دونوں اجمیر کے گل پاس علاقے میں رہتے تھے۔ ماہم اور علی حیدر کی دو اولادیں تھیں۔ سولہ سالہ بیٹی مونا اور اٹھارہ سالہ بیٹا زاہد۔ وہ دونوں کالج میں پڑھتے تھے۔ ماہم کو طالب علمی کے دور سے ہی سیاست میں دلچسپی تھی۔ طلباء تحریک میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھی۔ لیکن تب اپنی سیاست کو چکانے کا انہیں زیادہ موقع نہیں ملا۔ والدین نے ان کا بیاہ علی حیدر سے کر دیا۔ شادی پھر بچوں کی پیدائش اور گھریلو ذمہ داریوں کے سبب سیاست سے فاصلہ برقرار رکھنا ماہم کی مجبوری بن گئی۔ بچے بڑے ہوئے، خود اپنی دیکھ بھال کرنے کے قابل ہو گئے تو ماہم کے اندر خوابیدہ پڑے سیاسی کیڑوں میں دوبارہ بیداری آ گئی۔ پوری طرح جاگ کر زلفوں نے آنکھیں کھول دیں اور ماہم کو کاٹنے لگے۔ لہذا ماہم نے پھر سے سیاست میں سرگرم ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ بیوی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے۔ علی حیدر کو کسی طرح کا اعتراض نہیں تھا۔ شوہر سے حوصلہ ملا تو نئے نئے تیرتلواروں سے لیس ہو کر ماہم دوبارہ سیاست میں کود گئی۔ اُس نے ایک بڑی سیاسی جماعت کی ممبری لے لی اور مقامی سیاست میں خود کو جھونک دیا۔

گزر تے وقت کے ساتھ ساتھ شہر میں ماہم کی شناخت بن گئی۔ علاقائی اخبارات میں بھی اُسے جگہ ملنے لگی۔ لوگ جان گئے کہ اجمیر میں ماہم نام کی کوئی لیڈر ہے۔ اب تک وہ اپنے شہر کی سٹی صدر بن چکی تھی۔ ڈکٹیٹر کے زمانے میں ماہم اپنے حامیوں اور ورکروں کے ساتھ ڈکٹیٹر کا تختہ اکھاڑ پھینکنے کے لیے سڑکوں پر اُتری تھی۔ یہ صرف اجمیر کی بات نہیں صوبے کے سبھی ضلع ہیڈ کوارٹروں میں سیاسی پارٹی ڈکٹیٹر مخالف مظاہرے کر رہی تھی۔ اس معاملے پر انتظامیہ کے بھی تیور تیکھے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پر امن تحریک میں جوش آ گیا۔ جس کے نتیجے میں سخت انتظامیہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ مظاہرین پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور سینکڑوں کو گرفتار کیا۔ ماہم کو متعدد سنگین مقدمات میں چالان کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ تب اپنے کیس کی پیروی کے لیے ماہم نے مشہور وکیلوں میں سے ایک 38 سالہ علی زیب کا انتخاب کیا۔ علی زیب نے ماہم کا مقدمہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

تو دونوں نے قریب ہونا فطری تھا۔ دھیرے دھیرے دونوں کے تعلقات گہرے اور مضبوط ہونے لگے۔ ماہم نے علی زیب کے گھر میں گھس پیٹھ کر لی۔ علی زیب کی بیوی زنیہ کو اس نے اپنے اعتماد میں لے لیا۔ تو اس کے سات سالہ بیٹے سے بھی خوب گھل مل گئی۔

ماہم سے قربت کے سبب علی زیب کی کار بھی اکثر اس کے دروازے پر کھڑی رہنے لگی۔ علی حیدر سے اس کی دوستی ہو گئی تو مونانے اُسے اپنا بھائی بنا لیا۔ مونانے بہن بنی تو ماہم کو خود بخود علی زیب کی ماں ہونے کا درجہ مل گیا۔ اس رشتے کی تقدیس، اہمیت اور عزت برقرار رکھنے کے لیے علی زیب احترام کے ساتھ ماہم کے پاؤں چھو کر پیار لینے لگا۔ لیکن ایک دن مونانے اُس پر انکشاف کیا کہ کھانے والے دانت الگ ہیں دکھانے والے دانت الگ۔ اس کی ماں کے ساتھ علی زیب کے ناجائز تعلقات کی چاروں طرف چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ مونانے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ماں بھٹک گئی ہے۔ اس نے رشتہ قائم کیا بھی تو اُس شخص کے ساتھ جو عمر میں اُس سے دس سال چھوٹا تھا اور جیسے اس کی بیٹی نے بھائی بنا رکھا تھا۔ اس کا کالج میں دل نہیں لگا۔ اس کے دل میں ماں کا کردار اتھل پتھل مچانے لگا۔ کیا حقیقت میں جب ماں گھر میں اکیلی ہوتی ہے۔ تب علی زیب اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے آتا ہے۔ اس وقت بھی تو ماں اکیلی ہو گئی تو کیا علی زیب کے ساتھ اپنی عزت کو پامال کر رہی ہو گئی؟ جا کر دیکھنا چاہیے کہ سچ کیا ہے؟

اس لیے پیڑ پڑ ختم ہوتے ہی مونانے گھر پہنچ گئی۔ اس کا دل دھک رہ گیا۔ کیونکہ گھر کے باہر علی زیب کی کار کھڑی تھی۔ اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ مونانے ڈور تیل بجائی۔ ایک بار نہیں۔۔۔ بار بار بجائی۔۔۔ ماں کو آوازیں دی۔ تب کہیں پانچ منٹ بعد ماہم نے اندر سے سلائیڈنگ کھولی۔ ماہم نے بیٹی سے نظریں نہیں ملائیں۔ دروازہ کھولا اور فوراً پلٹ کر اندر چلی گئی۔ مونانے اندر داخل ہوئی تو ڈرائنگ روم میں علی زیب کو بیٹھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں انجانے خوف اور چہرے پر بدحواسی کا سایہ تھا۔ بال بے ترتیب اور شرٹ کے بٹن بھی غلط لگے ہوئے تھے۔ مونانے ماں کے بیڈ روم میں گئی تو وہاں بیڈ پر پیچھی چادر پر طوفانی شکنیں پڑی دیکھیں۔ بچکے بھی بے ترتیب تھے، یہ دیکھ کر مونانے سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ اپنے منہ بولے بھائی کی کر تو ت پر مونانے کا خون کھول اٹھا۔ اُسے کھری کھری سنانے کے لیے غصے میں پاؤں پٹختی ہوئی وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو علی زیب وہاں نہیں تھا۔ مونانے فوراً دروازے پر جا کر باہر جھانکا تو کار بھی ندر تھی۔ علی زیب کے دل میں چور تھا اور مونانے کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے موقع پانے ہی وہ وہاں سے کھسک گیا تھا۔ مونانے آنکھوں نے ماں کو تلاش کرنا شروع کیا تو احساسِ ندامت میں مبتلا وہ دوسرے کمرے میں بیٹھی ہوئی مل گئی۔ مونانے کا سامنا کرنے کا ماہم میں حوصلہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ بغلیں جھانکنے لگی۔ چند لمحوں تک ماں کو گھورنے کے بعد مونانے کہا۔

”مئی آپ کے بال الجھے ہوئے ہیں۔“ ماہم کا ہاتھ فوراً سر پر چلا گیا۔ انگلیوں کے لمس سے اس نے جانا کہ مونانے سچ کہہ رہی ہے۔ مونانے کا خون کھول رہا تھا۔ اس لئے وہ ہاتھ میں پکڑی کتابیں میز پر زور سے پٹک کر باہر چلی گئی۔

اب مونانے کا رخ علی زیب کے گھر کی طرف تھا۔ علی زیب گھر پر ہی تھا۔ اس لیے مونانے کو زخمی شیرنی کی طرح اپنے گھر کی طرف آتے ہوئے دیکھا تو پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ علی زیب نہیں ملا تو مونانے سارا غصہ زنیہ پر اتار دیا۔ جو علی زیب کی بیوی تھی۔

”تمہارا شوہر بھائی میرا بنا رہا۔ پاؤں میری ماں کے چھوٹا رہا اور پھر اسے ہی خراب کر دیا۔۔۔ سمجھا دینا اس ذلیل انسان کو آئندہ میرے

گھر کا رخ نہ کرے۔ نہ ہی مئی کے پھیر میں پڑے۔ ورنہ میں اپنی جوتی سے اس کا منہ سرعام لال کر دوں گی۔“

زنیرہ کو حالات کا علم تو نہیں تھا۔ اس لیے وہ شوہر کے خلاف نازیبا کلمات کیسے سن لیتی۔ اس نے مونا کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا شروع کر دیا۔ تو گھر میں مچا و بال باہر تک آ گیا۔ محلے والوں کے ساتھ راہ گیر بھی جان گئے کہ شہر کی سٹی صدر ماہم اپنے سے دس سال چھوٹے علی زیب ایڈوکیٹ سے چھپا چھپی کھیل رہی ہے۔ شہر میں بدنامی شروع ہوئی تو جوان بیٹی سے آنکھ ملانا مشکل ہو گیا۔ تو شرمسار ماہم نے اپنا ناجائز رشتہ ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ویسے بھی علی زیب سے رشتہ برقرار رکھنے پر ماہم کو تباہی کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ دوسری طرف علی زیب نے ہنگامے سے گھبرا کر چار چھ دن تک ماہم سے فاصلہ بنائے رکھا۔ مگر اس کے بعد وہ اپنے دل پر قابو نہیں رکھ سکا۔ ماہم سے پہلے کی طرح خفیہ ملاقاتیں کرنے کے لیے اس نے کوشش شروع کر دی۔ ماہم نے صرف ایک بار علی زیب کا فون اٹینڈ کیا۔ وہ بھی صرف یہ کہنے کے لیے کہ تعلقات کا خاتمہ ہی ان دونوں کے حق میں ہے۔

”ماہم! ایسا ظلم مت کرو۔“ علی زیب گڑ گڑایا، ”میں تم سے پیار کرتا ہوں اور تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔“

”پیار تو میں بھی تم سے کرتی ہوں لیکن وقت اور حالات کا تقاضا وصل نہیں۔ ہماری محبت سے قربانی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ بھول جاؤ کہ ہم نے کوئی نکاح کر لیا تھا اور ہم یہاں میاں بیوی تھے۔“ اس کے بعد ماہم نے فون بند کر دیا۔ لیکن علی زیب پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ بار بار ماہم کو فون کرنے اور اس سے ملنے کے لیے کہتا رہا۔ تو ماہم نے اتنا کر موبائل سے اپنا اسم کارڈ ہی نکال پھینکا۔ اس نے علی زیب سے تقریباً کنارہ کر لیا تھا۔ علی زیب کو اس کے بغیر جینا منظور نہیں تھا۔ ماہم کے گھر کے چکر لگاتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ لیکن وہ اس سے ملنا تو دور اس کا سامنا کرنے کو تیار نہیں تھی۔

ایک دن وہ معمول کے مطابق کچہری گیا۔ عدالتوں میں اس کے پاس جو کیس تھے۔ ان کی پیشی نمٹانی اور بعد از دوپہر تین بجے پرسکون لہجے میں فون پر زنیرہ سے بات کی۔ اس کے بعد ضلع پولیس، ڈی پی او، بار کونسل کے صدر، انچارج تھانہ جات اور اپنے باپ کے نام سوسائڈ نوٹ لکھ کر پوسٹ کیا۔ سوسائڈ کی ایک کاپی اپنے پاس بھی رکھ لی۔ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد شام پانچ بجے علی زیب خود ہی کارڈ رائیو کر کے ماہم کے گھر پہنچا۔ گھر کے اندر جانے کی بجائے وہ کار میں ہی بیٹھا رہا۔ اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی جراثیم کش گولیاں لیں۔ تھوڑی دیر میں زہر نے اثر دکھانا شروع کر دیا۔ تو اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ زہر سے ہونے والی تکلیف وہ برداشت نہیں کر پایا۔ تو زور زور سے چلانے لگا۔ چیخیں سن کے آس پاس کے لوگ کار کے پاس جمع ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ بیہوش ہو گیا۔

ماہم کے گھر میں کوئی تھا یا نہیں، یہ تو پتہ نہیں لیکن علی زیب کی چیخیں سننے کے باوجود اس کے گھر سے کوئی نہیں نکلا۔ محلے والے ہی بے ہوش علی زیب کو کار سے نکال کر انور ہسپتال لے گئے۔ علی زیب کی حالت نازک تھی۔ اس لیے ڈیوٹی ڈاکٹر نے اُسے داخل کر کے فوراً اس کا علاج شروع کر دیا۔ اور علاقہ کی پولیس کو بھی معاملے سے آگاہ کر دیا۔ زنیرہ کو بھٹک تک نہیں آئی تھی کہ اس کا شوہر زندگی اور موت کے درمیان پھنسا جھد و جھد کر رہا ہے۔ شوہر کے گھر نہ لوٹنے سے وہ پریشان اور فکر مند تھی۔ علی زیب کا سیل فون بھی برابر بند تھا۔ اس لیے دیر رات کو اس نے تھانہ اسلام نگر جا کر علی

زیب کے لاپتہ ہونے کی رپورٹ درج کروادی۔ اس نے علی زیب کے غائب ہونے کا الزام ایک سیاسی پارٹی کی مٹی صدر ماہم پر عائد کیا تھا۔ تھانے سے زنیہ گھر پہنچی ہی تھی کہ اس کے پاس ماہم کا فون آگیا۔ متعلقہ تھانے میں ماہم کا کوئی حمایتی پولیس والا تھا۔ اس نے ہی ماہم کو فون کر کے اس کے خلاف درج ہوئی رپورٹ کے بارے میں بتایا تھا۔ زنیہ کے کال ریسورٹے ہی ماہم اس پر برس پڑی۔

”تیری ہمت کیسے ہوئی میرے خلاف رپورٹ درج کرانے کی۔ تیرے شوہر نے مجھے کم بدنام کیا ہے کہ تم بھی ذلیل کرنے کے لیے کمر کس کے کھڑی ہو گئی۔ علی زیب نے خود اپنی قبر کھود لی ہے۔ میں تجھے برباد کر دوں گی۔“

دھمکی دے کر ماہم نے فون بند کر دیا۔ لیکن زنیہ کی سمجھ میں یہ راز نہیں آیا کہ علی زیب نے کیسے اپنی قبر کھودی ہے۔ اس راز کا خلاصہ چند منٹوں کے بعد تب ہوا جب علی زیب کے ایک گھریلو دوست کو فون آیا۔ ماہم کے چکر میں علی زیب نے زہر کھا لیا ہے۔ زنیہ اپنے کچھ رشتہ داروں اور بہی خواہوں کو ساتھ لے کر ہسپتال پہنچی تو علی زیب کو موت سے لڑتے پایا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تبھی ماہم اپنے حامیوں کے ہمراہ ہسپتال پہنچ گئی اور وہاں بھی زنیہ کو دھمکیاں دینے لگی۔ جس سے وہاں اچھا خاصہ ہنگامہ ہو گیا۔ ماہم کو علی زیب کی جان کی نہیں اپنی عزت کو فکر تھی۔ دھمکیاں دے کر اور وبال کر کے وہ اپنے حامیوں کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔

چالیس گھنٹے کی مسلسل جدوجہد کرنے کے بعد آخر کار علی زیب نے موت کو شکست دے دی۔ حالانکہ سوسائڈ نوٹ سے پہلے ہی پولیس کو حادثہ کے سبب کا علم ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود پولیس ڈی۔ پی۔ او مختار رسول نے علی زیب سے مفصل پوچھنا چھ کی۔ دل جلے علی زیب نے پوری داستان بیان کر دی۔ ماہم اور علی زیب کی پہلی ملاقات یوں تو مقدمہ کے سلسلہ میں ہوئی تھی لیکن اس پہلی ملاقات میں ہی وہ ایک دوسرے کے دل میں اتر گئے تھے۔ دوسروں کی نظروں میں پاک صاف رہنے کے لیے اس نے بیٹی مونا کو بھائی بنانے کا کہہ دیا تھا۔ تو علی زیب عوامی طور پر اس کے پاؤں چھونے لگا تھا۔ دونوں کا پیار حد سے پار اترنے لگا تو ایک دن انہوں نے زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ بھانے کا فیصلہ کر لیا۔ انہی دنوں ماہم نے اپنے گھر والوں سے پارٹی اجلاس میں جانے کا بہانہ کیا تو علی زیب نے زنیہ کو کسی مقدمہ کی لمبی بحث کے لیے ہائی کورٹ میں جانے کی پٹی پڑھائی۔ اس کے بعد سیر کے لیے راولپنڈی، اسلام آباد اور مری گئے۔

دونوں ہی مزے سے دوہری زندگی جی رہے تھے۔ ان کے تعلقات میں تلخی تب آئی جب ایک پولیس انسپٹر سے ماہم کی قربتیں بڑھنے لگیں۔ ان دونوں کی نزدیکیوں سے علی زیب کو ناجائز تعلق کی بو آ رہی تھی۔ اس نے ماہم کو انسپٹر سے فاصلہ بنا کر رکھنے کے لیے کئی بار سمجھایا مگر وہ چکنا گھڑا ثابت ہوئی۔ ماہم کو قطعی پسند نہیں تھا کہ علی زیب اس کے ذاتی معاملات میں دخل دے۔ دوسری طرف علی زیب ماہم کی محبت پر اپنا پورا حق سمجھنے لگا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ماہم صرف اس کی ہی ہو کر رہے۔ پولیس انسپٹر اور ماہم کے تعلقات پر ماہم اور علی زیب کے درمیان سرد جنگ چل رہی تھی۔ کہ تبھی مونا نے ان کی چوری پکڑ لی اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد ماہم نے بھی علی زیب سے منہ پھیر لیا۔ ایسی سے مایوس ہو کر علی زیب نے زہر کھا لیا۔ علی زیب کے بیان پر پولیس نے معاملہ درج کر لیا۔

ادھر زنیہ نے اے۔ ایس۔ پی ماجد علی کو درخواست دے کر ماہم سے جان و مال کی حفاظت کی فریاد کی۔ ماجد علی نے فوراً معاملے کی غیر

جانبدرانہ تفتیش کا حکم دے دیا۔ مقامی اخبارات میں یہ معاملہ خوب سرخیاں بٹور رہا تھا۔ چونکہ ماہم اجیر کی سٹی صدر تھی۔ اس لیے سنسنی خیز معاملہ صوبائی ہیڈ کوارٹر تک جا پہنچا۔ چنانچہ پارٹی کی صوبائی صدر عجیرہ عزیز نے فوراً کارروائی کرتے ہوئے ماہم کو اس کے عہدے سے برخواست کر دیا۔ ماہم نے میڈیا کے سامنے کہا۔

”علی زب میرے چھوٹے بھائی جیسا ہے۔ لیکن معصوم اور نادان ہے اور مخالف لوگ اسے بھڑکا کر میرے خلاف اُلٹے بیان دلو رہے ہیں۔ یہ سب سیاسی مخالفین کی سازش ہے۔ جو شہر میں میری شبیہ خراب کرنا چاہتے ہیں۔“

بہر حال پولیس نے علی زب کے خلاف خودکشی کی کوشش اور بیوی ہوتے ہوئے ماہم سے ناجائز تعلقات رکھنے کے الزام میں مقدمہ درج کر دیا اور ماہم کے خلاف علی زب کو خودکشی کرنے کے لیے اکسانے کے علاوہ کچھ اور الزامات پر مقدمہ درج کر کے ماہم اور علی زب کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھجوا دیا۔ وہاں جیل میں ڈویژن بوڑھی سے بگڑ کو بوڑھی گھونڈی پڑ گیا تھا۔ جیل میں رہتے ہوئے کئی طرح کی پریشانیوں سے تنگ آ کر ماہم نے گھر سے پارسل رضائی منگوائی تھی۔

سپرینڈنٹ کے ہفتہ وار جنرل دورے پر اسے ناک تنگ گھونگھٹ کھینچ کر ترکاری بنانے والا دھنیا، زیرہ، سونف، میتھی سے لے کر سبز مرچ اور مونگ کی دال اور کچھ بھی نہ ملنے کی شکایت کرتی تھی۔ ویسی شکایت اور سامان کی پرچی شاید سپرینڈنٹ کی گھر والی نے بھی کبھی پیش نہیں کی ہوگی۔ اسے بغیر شکایت کے ہی سبھی طرح کی ضروری اور غیر ضروری چیزیں مل جاتی تھیں۔ انہی دنوں ایک سابق ایم۔ این۔ اے راحت شاہ سولہ ایم۔ پی۔ او کے تحت جیل میں آئی تھی۔ اس وقت بغل والی سیل میں مہوش نے پلچنگ فٹائل ڈلو کر دھلوائی کروائی تھی۔ پنگ سفید چادر سے ڈھکا بستر کے ساتھ ساتھ بڑی بالٹی میں ہاتھ نہ دھونے کے لیے برآمدے میں پانی بھی رکھ دیا گیا تھا۔ جیل منتظم ان کے لیے چپل سے لے کر گرم پوشاک تک کا ہاتھ جوڑ کر انتظام کیا کرتے تھے۔ خیر راحت شاہ جتنے دن تک وہاں رہی۔ ان کے چھوٹے موٹے کام کے لیے چار لڑکیاں برآمدے میں حاضر رہیں۔ میرے ساتھ بھی بات چیت کرنے کے لیے وہ محترمہ آئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ تنظیم حقوق انسانی کے چیئر پرسن کو اس طرح بند کر کے رکھنا نا انصافی ہے۔ ہمیں ارباب اقتدار سے جہاں تک ہو ماہرانہ ڈھنگ سے آسائشوں کا انتظام کرنا چاہیے۔ ان کا کھانا باہر ہوٹل سے آتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد انہیں جاڑے کی دھوپ میں دری بچھا کر دی جاتی تھی۔ انعم اور نورین ان کے پیٹ میں تیل اور پانی کا مرکب لگا دیتی تھیں۔ لیکن اس بات سے میں انکار نہیں کر سکتی کہ انہوں نے مجھے ایک دن ایک ڈبہ کریم سکٹ دیا تھا۔ اور میں نے اسے لے بھی لیا تھا۔ کیونکہ میری خدمت گزار آپا سدرہ، سعدیہ کرن وغیرہ بچوں نے کریم سکٹ کبھی آنکھوں سے دیکھا تک نہیں تھا۔

مجھے اب ہڈی فریکچر سے بالکل آرام آ گیا تھا۔ سدرہ تھوڑا تھوڑا کر کے چلنے لگی تھی اور مجھ پر اپنا حق خوب اچھی طرح سمجھتی تھی۔

مجھے تم پیار کرتی ہونا؟ میں تمہاری بیٹی ہوں نا؟

آخری جملہ اُسے ڈاکٹر نے سکھایا تھا۔

وہ ایک بچی کرن تھی جیسے بشری بھی بہت پیار کرتی تھی۔

سپرینٹنڈنٹ جیل دورے پر آئے تو کرن میری سیل کے دروازے پر پیٹھ لگائے نہایت بے فکری سے کھڑی تھی۔ سپرینڈنٹ کو تجسس بھری نظروں سے دیکھتے ہی بشری بھاگ کر آئی اور تقریباً بھاگتے ہوئے واپس چلی گئی۔ وہ کرن کا منہ چوم کر گئی تھی کہ سپرینڈنٹ کو بھی دیکھ کر ہنس دینا پڑا۔ اس سے عجیب بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس ہنسی کے ذریعے اس کی جگہ پکی ہو گئی تھی۔ دورے کے بعد اس کی ماں کو ڈانٹنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس کا کوئی مار کہ بھی نہیں تھا۔ دو بچوں کو لے کر وسطی پنجاب سے آئی ہوئی وہ بیچاری یونہی سیدھی سادھی رہتی تھی۔ کرن سڑک پر گھومتی رہتی تھی وہ انڈر ٹراک تھی۔ اس کے علاوہ وہ لڑکی ماں کی پروا بھی تو نہیں کرتی تھی۔ میں سلاخوں کے بیچ سے اس کے ملائم بدن کا حساس کرتی تھی۔ لاک اپ کے وقت اس کی ماں اُسے یہاں سے کھینچ کر لے جاتی تھی۔ صبح آ کر بتاتی تھی کہ سیل میں سونے سے پہلے وہ آپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہتی کہ میں نے ماریہ آنٹی کے پاس جانا ہے۔ اور میرا نام لے لے کر متواتر روتی رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ مجھے ماریہ آنٹی کہہ کر پکارتی تھی۔ اچانک کہیں سے دوڑ کر آتی۔

”میں اچھی لڑکی ہوں نا بولونا؟“ اس سوال کا جواب یہ کہ یقینی طور پر طے تھا کہ وہ کہیں سے شیطانی کر کے آئی ہے۔

”ہاں بیٹی، تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ میری اچھی بیٹی گھر کے آگن میں کھیلنے کی بجائے تمہیں یہاں کیوں لایا گیا تھا؟“

شاید اس بدنصیب معاشرے میں ایسی ہی انہو نیاں ہو رہی ہیں کہ قدم قدم پر منیر نیازی یاد آتا ہے۔

یہاں کچھوے سانپوں کی دردیاں پہنے پھر رہے ہیں۔ واقعی یہاں رہزنوں نے رہنماؤں کے روپ دھار کھے ہیں۔ سوداگر صوفی بنے پھرتے ہیں۔ عطائی ڈاکٹر کہلاتے ہیں۔ بے سُرے بے تانے تان سین کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ بازی گراور رنگ بازیا سدا ان کے طور پر مشہور ہیں۔ جرائم پیشہ پولیس میں بھرتی کیے گئے۔ چور چوکیدار بن بیٹھے۔ سڑکیں بنانے والے سڑکیں لگانے لگے۔ محافظ قتل نکلے اور معزز کہلائے۔ مذہبی رہنماؤں نے منافرت کو ہوا دی۔ طب علم تخریب کار بن کر اپنے ہی اساتذہ پر حملہ آور ہو گئے۔ نام نہاد اسلامی شہر میں گڑ کے سوا کچھ نہ ملا۔ معالجوں نے مریض اور وکیل نے کلائنٹ بیچ دیا۔ حاجی صاحب کا ایمان خالص لیکن ان کے دودھ میں ملاوٹ نکلی اور جو ہر سال حج پر جاتا تھا وہ جعلی دوائیں بناتا پکڑا گیا۔ ایسے روح فرسا حالات میں اگر کرن نامی پھول جیسی بچیاں اپنی ماؤں کے ساتھ جیل میں تھیں تو حیرت کیسی؟

نمرہ نام کی ایک نئی لڑکی سزا پا کر آئی تھی۔ اسے میں نے ایک عجیب و غریب حادثے کے دوران دیکھا تھا۔ ایک آم کے پیڑ پر ایک سانپ چڑھ گیا تھا۔ بشری کے ہاتھ میں لاٹھی کھینچ کر ایک لڑکی نے نمرہ کو دے دی تھی اور بعد ازاں نمرہ نے سانپ کو مار ڈالا تھا۔ ایسی ہمت دیکھ کر میں بہت حیران ہوئی تھی۔ سانپ مارنا تو ہمت کی بات ہے ہی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ ہمت کی بات بشری کے ہاتھ سے لاٹھی چھیننا۔ نمرہ کی ہمت اور جرات کی بات تھی۔ ایک پل میں سانپ کا سر کچل کے رکھ دیا تھا۔ اسے مار کہ دنیا ہی پڑا تھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں اُسے بیس سال کی سزا ہوئی تھی۔ اٹھارہ انیس برس کا دمکلا چہرہ، گھنے کالے بالوں کے نیچے چھوٹا سا ماتھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ نمرہ کے لیے عمر قید کی سزا سن کر میرا دل برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ لیکن سوچنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ بشری کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے نمرہ کو نکٹ دلوانا ہوگا۔ اس کے ایک زہریلے سانپ کو مارا ہے۔ قانون کے مطابق زہریلے سانپ کو مارنے پر سات دنوں کا معرکہ ملتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے یہ بات کہی تو ڈاکٹر صاحب نے تھوڑا سا مسکرا کر کہا۔

”کیا سچ سچ زہریلا تھا وہ سانپ؟“

”زہریلا ہے یا نہیں۔ یہ تو مارنے کے بعد دیکھا جاتا ہے۔ جرات کر کے سانپ مارا ہے یہی کیا کم ہے؟“
 ”اچھا ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“

لیکن اس بات کو بھی تسلیم کر لیا گیا کہ دوسرے معاملوں میں بھی نمرہ میں ہمت ہے۔ وہ اپنا کام کرتے بیچ بیچ میں اسد علی کو کھانا کھلا دیتی تھی۔ وہ وارڈن کے ٹیڑھے سوال سے تھلا اٹھی تھی۔ اسد علی کو اپنی کوکھ سے نہیں پیدا کیا تو کیا ہوا؟ کھانا کھلانے میں کیا جرم ہے؟ سبھی تمہاری طرح بانجھ ہیں کیا؟ اس کے بعد اس نے اتنی مار کھائی کی اس کے ہونٹ کال پھٹ گئے۔ سات دن تک گھٹنے بھیا تک طور پر پھولے ہوئے رہے۔ ڈاکٹر نے کچھ کہنا نہیں چاہا۔ لیکن مجھے یوں لگا جیسے وہ میری بات پر متفق ہیں کہ گھٹنوں کا زخم شاید مستقل ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ بات سپرینڈنٹ صاحب سے کہوں گی لیکن نمرہ ہی نے مجھے روک دیا۔ اس دوران اس نے سسٹر کی بات سن لی تھی۔

”یہ درد تو برداشت ہو جائے گا۔ لیکن وہ بے عزتی برداشت نہیں کرے گی۔ اگر ایسا ہوا تو وہ گلے میں پھندا ڈال لے گی۔“

ایک دن وہ اسی لنگڑے پاؤں سے دوڑتی ہوئی نمرہ نے اطلاع دی کہ عشرت پھر آئی ہے۔ کند ذہن، چہرے پر کسی جانور کی طرح صبح سا جذبہ۔ پھر بھی وہ جانور نہیں تھی۔ اس کا جسم بھی عورت ہی کی صورت تھا۔ کورٹ میں جھسیلا کرنے کے جرم میں اسے بار بار آنا پڑتا تھا۔ پچھلی بار تقریباً آٹھ مہینے پہلے ایک گورا چٹا بچہ گود میں لے کر آئی تھی۔ دن بھر اسے گود میں لے کر عجیب آواز میں لوری گا گا کر سلایا کرتی تھی۔ وہ پیروں سے گھسکتی ہوئی میری سیل کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہی چہرہ مگر چہرے پر بے حساس ہنسی تھی۔ بدن پر لوگوں کی طمع خیزی کی چھاپ دیکھ کر میں نے پوچھا۔

”تیرا منا کہاں ہے عشرت؟“

”مار یہ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ وہ پھول سا چہرہ اس طرح مجھ سے جدا ہو جائے گا۔“ اور عشرت رونے لگی تھی، ”منٹھائی کی دوکان پر جا کر بار بار وہ تنگ کر رہا تھا۔ اس لیے اس پر گرم پانی ڈال دیا۔ وہ آدمی اچھا نہیں تھا مار یہ۔ میرا منا مار دیا۔“ نمرہ بشری کی نظر سے اسے پہچانے کے لیے ڈانٹتے ہوئے آرہی تھی۔

”پھر یہاں چلا رہی ہو عشرت؟“

اس کے جیٹھ کا بچہ لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے سے اس سے لپٹے جا رہا تھا کہ اچانک کندھے کے اوپر سے گڑکی چاشنی کی کھولتی کڑھائی میں گر گیا تھا۔ خاندانی جھگڑے نے اپنا رخ بدل دیا۔ لیکن جیل کی دیواریں بھی نمرہ کا دکھ کم نہیں کر پاتی تھیں۔

”ارے مار یہ۔ وہ تو بچاری جان تھا۔ چاچی کے علاوہ وہ کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔“ میں نے دیکھا عشرت نمرہ کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ دونوں میری سیل کے پاس ہی کھڑی تھیں۔

حالات بتدریج خراب ہو رہے تھے۔ انہی دنوں جیل انتظامیہ نے بغیر کسی جرم کے، کسی سبب کے، بغیر کسی اکتاہٹ کے، تحریک حقوق انسانی کے چارور کروں کو مار ڈالا۔ فائر کی آواز پوری جیل نے سنی تھی۔ بندوق کی ٹوک سے پھونک پھونک کر انہیں مارا گیا۔ ان میں سے سترہ سالہ نوجوان نوید علی تھا۔ جس کا خون ہو گیا تھا۔ ان دنوں سیل میں اتنے کڑے پہرے میں رکھا گیا تھا کہ بیس پچیس دنوں بعد مجھے اس حادثے کی خبر ملی

تھی۔ وہ بھی تب جب ماں نے ڈاک کے ذریعے اخبار میں لیٹ کر ضروریات زندگی کا کچھ سامان بھیجا تھا۔ اس سامان کے ساتھ آیا ہوا خط پڑھ کر وارڈن نے چپ سادھ لی تھی۔ ڈاکٹر اور حدیقہ بھابھی میری طرف نہیں آتے تھے۔ یہ سب اشارے مجھے سختی کی علامت لگ رہے تھے۔ ایک اور بات یہ کہ اسی تحریک حقوق انسانی کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک غیر واضح خوف نے میرا گلا دبوچ لیا تھا۔ میرے پاس جو واحد ہتھیار تھا وہ جمعدار تھا۔ جو جھاڑو لے کر اندر آتا تھا۔ تب قائدے کے مطابق مجھے باہر آ کر کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اس دن چینی چلاتی ساری پابندیاں توڑ کر برآمدے سے اتر کر سیدھے باغیچے میں آکھڑی ہو گئی اور میں برابر کہتی رہی کہ سپرینڈنٹ کے آنے تک میں سیل کے اندر نہیں جاؤں گی۔ ان سے مجھے کام ہے۔ سپرینڈنٹ نہیں آئے۔ دوپہر دو بجے سبھی عورتوں کو لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔ حدیقہ بھابھی نے کئی بار کہا تھا کہ آج آپ میری بات مان لیجیے۔ اندر چلی جائیے۔ وارڈ بند ہونے کے بعد سب وارڈن تقریباً پندرہ سپاہیوں کو لے کر آ گیا۔ فیملی وارڈ کی وارڈن نے آتے ہی مجھ پر تشدد شروع کر دیا۔ اس دن رات کے پچھلے پہر اندھیری کال کوٹھری میں مجھے ہوش آیا تھا۔ صرف گھنٹے تک ڈھکی قمیض میرے بدن پر تھی۔ شلوار پھٹ چکی تھی۔ تھوڑا سکون محسوس ہونے پر دھیرے دھیرے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

کچھ وقت بعد گھڑی کے گھنٹے کی آواز سنائی پڑی تھی۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ اس کے ایک منٹ بعد جیل صدر گیٹ کی گھڑی میں بھی اس طرح تین بار رات کی بے حس ہوا میں گھنٹے کی آواز بازگشت ہوتی رہی۔ سناٹے میں یوں لگ رہا تھا جیسے وقت بھی ٹھہر گیا تھا۔ صبح جب میٹرن آئی تو اس کے ساتھ تھریا وارڈن کے علاوہ دو سپاہی بھی تھے۔ انہوں نے آتے ہی میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ ان سے شرمانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ ڈاکٹر کے سامنے جانے میں تھوڑا جھجک ہو رہی تھی۔ یہ لوگ ایسی پٹر مردگی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ ورنہ پاگلوں کو بھی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے وقت عزت و احترام سے لے جایا جاتا ہے۔ لیکن مجھے ان لوگوں نے قمیض تک تبدیل نہیں کرنے دی۔ مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ انہوں نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ کہاں درد ہے۔ میں نے خود ہی ندامت سے کہہ دیا کہ خود سے بڑی نفرت ہو گئی ہے۔

دو دنوں بعد جیل پولیس کے گھیرے میں سپرینڈنٹ آئے اور بڑی ملائم آواز میں کہا۔ کچھ انڈر ٹرائل قیدیوں نے سپاہیوں پر حملہ کر دیا تھا۔ ایسی مڈ بھیڑ میں بد قسمتی سے کچھ قیدیوں کی موت ہو گئی۔ بہتے قیدی لڑکوں کو جدید اسلحہ سے لیس سپاہیوں سے مڈ بھیڑ میں بد قسمتی سے وہ مارے گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی موت بد قسمتی سے ہی ہوئی ہے تو پھر کوئل، صفیہ کی، فوزیہ اور میری کیوں نہیں ہوئی۔

لوگ خدا کو بھول گئے ہیں۔ حکم تھا کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ ہم نے اپنی اپنی رسیاں اور رسی ایجاد کر لیے۔ فرمایا کہ گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر فوقیت نہیں۔ ہم نے چوہدری اور کئی ایجاد کر لیے۔ سمجھایا گیا کہ تم ایک جسم کی مانند ہو کہ ایک عضو تکلیف میں مبتلا ہو تو پورا جسم درد محسوس کرے۔ یہاں اعضا ہی اعضا کو کھانے لگے۔ کہا کہ صفائی تمہارا نصف ایمان ہے۔ ہمارے شہر گندے، اعمال گندے، نیت گندی، نظریں گندی، بیشک تم غالب آؤ گے اگر تم مومن ہو۔ ”یہاں یہ کامیاب پروپیگنڈا کیا گیا کہ دنیا میں مردار اور اس پر چھپنے والے کتے ہوتے ہیں۔ یہ راز منکشف ہوا کہ جو خود کو کسی منصب کے لیے پیش کرے وہ اس منصب کے لیے بدترین ہے۔ ہم نے اُمید دار ایجاد کر لیے۔ دولت اور طاقت کے ارتکاز کی نفی کی گئی۔ ہم نے ان دونوں کے مراکز قائم کر کے انہیں خود پر مسلط کر لیا۔ ہماری فراست سے ڈرنے کا حکم تھا۔ ہم فکر کی نجاسب کے رستے پر

روانہ ہو گئے۔ بھوک چھوڑ کر کھانے کا حکم تھا۔ ہم نے دانتوں سے اپنی قبریں کھودنا شروع کر دیں۔ فرمایا اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ہم نے صبر کو استقلال کی انتہا کی بجائے سرنیزد سمجھ لیا۔ ہم بت پرستی سے روک دیئے گئے۔ ہم نے شخصیت پرستی شروع کر دی۔ ہمیں کائنات کا عظیم ترین قائد عطا ہوا۔ ہم نے پاور پلیمیر کو قائد بنالیا۔ فرمایا علم مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے۔ ہم نے علم کو دینی اور دنیاوی میں تقسیم کر کے دو مرلے کے حجرے پر دارالعلوم کا بورڈ آویزاں کر دیا۔ علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے۔ ہم ڈش واشنگ کے لیے مغرب کی طرف نکل گئے۔ فرمایا گناہ عظیم یہ ہے کہ تم وہ بات کہو جو تم خود نہیں کرتے۔ ہم ننگے تضادات کے چلتے پھرتے ہمالیہ بن گئے۔ فرمایا۔ (اے نبی ﷺ) تم سے دریافت کرتے ہیں اللہ کی راہ میں کس قدر خرچ کریں۔ تم ان کو سمجھا دو کہ جتنا تمہارا حاجت سے زائد ہو خرچ کر دو۔ اور ہم نے اپنی ضرورتوں کو عیاشیوں تک پھیلا دیا۔ فرمایا۔ اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ مخلوط مت کرو۔ اور جان بوجھ کر حق بات کو نہ چھپاؤ۔ حالانکہ تم اس بات کو جانتے ہو۔ ہم نے حق ناحق شرک کے بعد بدترین گناہ ایذا رسائی خلق ہے۔ ہم نے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعے اس کی نفی کی۔ فرمایا کہ ایمان والے کے شایاں نہیں کہ اپنے آپ کو ذلیل کرے یعنی اس بلا میں ہاتھ ڈالے جس کے مقابلہ کی اس میں طاقت نہیں ہم نے بغیر کسی سعی کے ”مرگ بر امریکہ“ کا درد شروع کر دیا۔ سمجھایا کہ مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ ہائے ہم اور ہمارے..... سیاسی سوراخ۔ کہا جو دو بھوکے بھیڑیے جو بکریوں میں چھوڑ دیئے جائیں وہ اس قدر فساد برپا نہیں کرتے جس قدر انسان کے اندر دولت اور منصب حرص، ہم اس کی زندہ مثال ہیں۔ فرمایا تم سے پہلے قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔ دیکھو تم ایسا نہ کرنا۔ میں تم کو منع کرتا ہوں۔ فرمایا لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اسے ظلم سے نہ روک سکیں تو رب ان سب پر عذاب نازل کرے گا۔ ہمارے ہاں عذاب کا آغاز ہو چکا۔ اب پہلا باب ختم ہونے کو ہے۔ فرمایا مسلمان کو ایذا پہنچانا خدا کے نزدیک کعبہ در بیت المعمور گرانے سے پندرہ گنا بڑا ہے۔ ان کا کیا ہوگا جنہوں نے کروڑوں مسلمانوں کے لیے زندگی عذاب کر دی ہے۔ مرکز سے لے کر صوبوں تک۔ فرمایا جاہل کو ایک بار عذاب دیا جائے گا اور عالم کو سات بار۔ کیا یہ فرمان علماء کے علم میں بھی ہے؟ اور اگر ہے تو وہ عذاب سے بچنے کے لیے سیاست کے سوا اور کیا کر رہے ہیں۔ فرمایا تم میرے پاس حسب نسب نہیں اعمال لے کر آؤ۔ میں تو مخدوم ہوں۔ گدی نشین ہوں۔ ابن کلاں ابن کلاں ہوں۔ آقا جنگ سے واپس ہوئے تو فرمایا۔ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹتے ہیں۔ پوچھا بڑا جہاد کون سا۔ فرمایا اپنے نفس کے خلاف جہاد۔ کیا جہاد یوں نے بھی کبھی یہ فرمان سنا؟ ہمیں صدیوں پہلے وہ سب کچھ بتایا سمجھایا گیا جو آج کی مہذب دنیا نے صدیوں بعد سیکھا۔ لیکن ہم آج بھی سیکھنے پر آمادہ نہیں۔ ایک سادہ سا سوال ہے کہ کیا یہ جاننے کے لیے کہ ہم بے بھکے لوگ ہیں۔ یہی سچ کافی نہیں کہ گذشتہ کئی صدیوں سے مسلسل زوال پذیر ہیں۔ ہماری مسلسل پسپائی اس بات کی گواہی ہے کہ ہمارے اعمال بد، رویے منفی، اور سوچ مسخ شدہ ہے۔ اور ہم اپنے مرکز سے بہت دور ہو چکے۔

انہی دنوں سپرینڈنٹ جیل کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ وہ نوجوان سپرینڈنٹ نئی پوسٹنگ پر جانے سے پہلے مجھ سے ملنے آئے تھے۔ ڈے ڈاکٹر اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کی جگہ دوسرے ڈاکٹر آ گئے تھے۔ فیملی وارڈ میں ایک ہی شخص کو عام لوگوں جیسا برتاؤ کرتے پایا تھا۔ ایک وارڈن ہمیشہ کم عمر کی لڑکیوں کے ساتھ دل کرتی رہتی تھی۔ اور اتنی ہنستی تھی کہ اس کا نام میں نے ”ہنسی بانو“ رکھ چھوڑا تھا۔ اس دن شام کو ان کی ڈیوٹی تھی کسی کے سامنے وہ ایک بار بھی مجھے سیل کے اندر جانے کے لیے نہیں کہتی تھیں۔ وہ شاید شروع سے ہی جانتی تھی کہ میں تنظیم حقوق انسانی کی چیئر پرسن ہوں۔ اس کے

بعد صرف ایک ہی دن دوپہر کے وقت اس کی ڈیوٹی ادھر کے وارڈ میں پڑی تھی۔ اس دن وہ اداس چہرہ لیے میری سیل کے دروازے سے پیٹھ لگا کھڑی ہو گئی تھی۔

”مار یہ جانتی ہو جس دن تم پر تشدد ہوا میں نے طے کر لیا تھا کہ نوکری چھوڑ کر بھیک مانگ لوں گی۔ لیکن انتظامیہ کو تم پر تشدد نہیں کرنے دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے ایک افسردہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے ہو کر گزر گئی۔

اخبار کی خبروں سے روزانہ بارود کی بو آتی تھی۔ شہر میں نارگٹ کلنگ اتنی بڑھ گئی تھی کہ روزانہ پانچ پانچ بوری بند لاشیں مل رہی تھیں۔ خود کش دھماکوں سے بے گناہ شہری جان و مال سے ہاتھ دھو رہے تھے۔ تحریک انسانی حقوق نے پھر زور پکڑ لیا۔ مرد، عورتوں اور جیل لا کر قید کر دیا گیا۔ ان کے لیے ایک بڑا وارڈ خالی کر دینا پڑا تھا۔ وارڈن، میٹرن روز بھی انتظامیہ بھی پریشان ہو گئے تھے۔ اتنے سارے لوگ ایک ساتھ قید ہو کر آئے تھے۔ ان قیدیوں کو سنبھالنے کے لیے بہت سی مشکلات آن کھڑی ہوئی تھیں۔ اس دن خون کی الٹی آنے کے سبب میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہوش میں آنے پر حدیقہ بھابھی، ڈے ڈاکٹر، وارڈن اور ڈے سپرینڈنٹ کو دیکھ کر میں پس و پیش میں پڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر کا چہرہ گمبیر تھا۔ مجھے وہاں سے اٹھا کر ہسپتال میں سلا دیا گیا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے ڈاکٹر پھر حاضر ہوئے۔ ان کے ساتھ میٹرن بھی تھی۔ انہوں نے وارڈنوں کے سامنے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ جب تک صحت یاب نہیں ہو جاتی ہسپتال میں ہی رہیں گی۔ یہاں کی میٹ آپ کی دیکھ بھال کرے گی۔ لیکن کمرے سے باہر مت جائیے گا۔“

ہسپتال کی میٹ سے مطلب حدیقہ بھابھی تھا۔ لیکن آفیسر بہت چالاگ لگتا تھا۔ اپنی ہمدردی کو فرض کی چادر اڑھانے کا اہل لگتا تھا۔ ہسپتال میں بولنے کی خاص اجازت نہیں تھی۔ کچھ دنوں تک تو بستر پر بھی اٹھ کر بیٹھنا بھی ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ رقیق غذائیں ہی کھلائی جا رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے ایکسرے کرنے کو بھی لکھ دیا تھا۔ جیل انتظامیہ اس پر تیار نہیں ہوئے تھے۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں بستر سے اٹھ کر دھیرے دھیرے اتر کے دروازے کے پاس جا بیٹھی۔ حدیقہ بھابھی روز کہتی تھی کہ تحریک حقوق انسانی کی قیدی عورتیں بہت بد نظمی کرتی ہیں۔ کسی کی کوئی بات نہیں سمجھتی۔ بھابھی اکیلی ان کے ساتھ بک بک کرتے ہوئے پریشان ہوتی جا رہی تھی۔ اب انہیں اپنی اپنی ضرورتیں بتانے لگیں تھیں کہ ڈاکٹر سے دوائی چاہیے۔ ہمارے ساتھ جو سامان تھا وہ کہاں گیا۔ جیل کے مین گیٹ پر ہمارا سب سامان جمع کر لیا گیا تھا۔ وہ ہمیں واپس دیا جائے۔ وہ جیل احکام کے پاؤں پکڑ رہی تھیں۔ کوئی شوہر سے تو کوئی اپنے والدین سے بچھڑ گئی تھی۔ یہ پڑھی لکھی عورتیں تھیں۔ اچانک اس طرح جیل میں قید ہو کر خاندان کے لوگوں سے بچھڑ کر بڑی متوحش ہو گئی تھیں۔ پانی قلت سے آ رہا تھا۔ محدود جگہ میں حد سے سو ڈیڑھ سولوگوں کو ٹھونس دینا۔ وہاں گندگی اور افراتفری کا جو ماحول بنا ہوا تھا اس کے لیے مکمل طور پر انتظامیہ ذمہ دار تھی۔ یہ بات ٹھیک نہیں تھی۔ ان میں سے کم از کم پانچ عورتیں حاملہ تھیں۔ حقوق انسانی کی تحریک زوروں پر تھی کہ اسی مہینے ان کے مرد اور رشتہ دار غول در غول جیل میں چالان ہو کر آنے لگے۔ سخت حفاظتی پہرے میں ان سے ملاقات کرائی جاتی تھی۔ تھوڑے بہت کپڑے اور دیگر سامان بھی آتا تھا۔ ملاقات سے واپس آ کر پھر وہی رونا دھونا شروع ہو جاتا تھا۔ ان میں کوئی سرکاری ملازم کی بیوی

تھی تو کوئی تاجر کی۔ کوئی اپنی دولت کی جھوٹی کہانی سنار ہی تھی۔ کسی کے گھر میں حالات خوشگوار تھے۔ ان باتوں کو لے کر ان میں جھگڑا ہو جاتا تھا۔ کسی دن تو جھگڑا مار پیٹ تک پہنچ جاتا تھا۔ میٹرن پٹھانی تھی۔ وہ ذرا بھی پنجابی زبان سے واقف نہیں تھی۔ اور وراڈن بہت ہی کھر در شخص تھا۔ وہ رومانہ کے ساتھ ہونے والے واقعہ کے بعد سے پورے وارڈ میں ناپسندیدہ شخص تھا۔ اس لیے پورے واقعہ کی رپورٹ بھابھی کے پاس آنی چنی۔ ایک ناجائز بچے کی پیدائش ہوئی تھی اور وہ بھی زندہ نہیں رہا تھا۔ سب نے جانتے بوجھتے ہوئے اس معاملے پر مٹی ڈال دی تھی۔

ملتان جیل میں قیدی جس طرح ایک دوسرے کا دھیان رکھتے تھے۔ ان کے معاملے میں اس کا بہت فقدان تھا۔ ان عورتوں کے لیے سب کے دل میں ایک دہی ہوئی سرد مہری اور حقارت کا جذبہ تھا۔ اس بات کا ذکر میں نے اس لیے کیا کیونکہ عام بے قصور لوگ بھی کسی تحریک کے ماحول سے کتنا متاثر ہوتے ہیں۔ میں یہ صاف دیکھ رہی تھی۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس تحریک کی قیدی لڑکیوں میں صرف ایک ہی لڑکی مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کا نام ثانیہ تھا۔ کوئی تیس سال کی رہی ہوگی۔ خاموش مزاج، بہت کم بولتی تھی۔ وہ ایک بچے کے ساتھ جیل میں آئی تھی۔ کچھ دن بیمار رہنے کے بعد وہ بچہ جیل میں ہی مر گیا تھا۔ جس دن وارڈ اس بچے کو دفنانے کے لیے جیل احکام سے وصول کر کے لیے گئے تھے۔ اس دن ہسپتال کے سامنے کھٹل کے پیڑ کے نیچے وہ دن بھر چپ چاپ بیٹھی روتی رہی تھی۔ ان سب میں وہی زیادہ پڑھی لکھی تھی۔

ماہ رمضان چل رہا تھا۔ روزہ افطاری کے لیے شام ہونے سے پہلے ہی ہر روز ایک جگ شربت اور فروٹ آرہا تھا۔ تقریباً سبھی لوگ روزہ رکھ رہے تھے۔ رمضان کے مہینے میں بھی اشیاء کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ لوگ ملک کو دیمک سے بچانے کی دعائیں مانگتے رہے۔ لیکن یہ کرسیوں کے کیڑے سب کچھ کھوکھلا کر گئے۔ اس ملک میں جتنا جوس اور خون گزشتہ چار سالوں میں نچوڑا گیا پچھلے چونسٹھ سال میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مختصر یہ کہ ہر طرف نحوست کا جھاڑو پھر چکا ہے۔ شام کے کھانے کے ساتھ تھوڑا تھوڑا فروٹ بھی آتا تھا۔ صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے بند وارڈ میں ہاتھ منہ دھو کر روزہ رکھتے تھے۔ حنا نے بھی روزے رکھے تھے۔ ماجدہ بیگم کی بڑی لڑکی شب نور نے بارہ روزے رکھے تھے۔ ماجدہ بیگم کی چار برس کی جھوٹی لڑکی نازنین جسے سبھی بلی کہہ کر بلاتے تھے۔ ماں سے تھوڑی ڈانٹ کھا کر باغیچے میں چلی جاتی تھی۔ کھٹل کے پیڑ کے نیچے پاؤں پسارے بیٹھ کر گورے گول چہرے کر اوپر کی طرف کر کے آنکھیں موندے روتی ہوئی کہتی تھی۔

”اے اللہ میں اس عذاب میں نہیں رہ سکتی۔ مجھ کو اوپر اٹھالے۔“

میں سوچتی تھی اس معصوم کی فریاد سن کر عرش بھی کانپ جاتا ہوگا۔ خون کی کمی کے باعث اس کا چہرہ سو جا ہوا لگتا تھا۔ رمضان المبارک میں چھوٹے جرائم میں ملوث قیدیوں کو رہائی دی جا رہی تھی۔ اور دوسرے قیدیوں کو حاکم وقت کی طرف سے تحائف بانٹے جا رہے تھے۔ روزے ختم ہوئے تو ایک دن عید آگئی۔

اس دن مردوں کو وارڈ سے پہرے دار کے ہاتھوں تھوڑا عطر لوبان، ایک پیکٹ بادام اور بہت کچھ بھجوا دیا گیا۔ ماجدہ بیگم کی جھوٹی لڑکی شب نور خوشی کے جوش میں چہرہ لال کیے ہوئی تھی۔ صبح سب نے نہایا دھویا اور نئے کپڑے زیب تن کئے۔ ان کی مصروفیت اور چلنے پھرنے کا تھوڑا احساس ہو رہا تھا۔ شاید سبھی لوگ عید نماز کے لیے باغیچے میں جمع ہو رہے تھے۔ قیدیوں کے چہروں پر عید کی خوشی بھی تھی اور آنکھوں میں اپنے پیاروں کی جدائی

کے آنسو بھی تھے۔ وہاں پر بلند آواز میں رونا منع تھا۔ سبھی وہاں دانت کس کے اور دانتوں تلے ہونٹ دبا کر روتے تھے۔ دوپہر کے آخری وقت میں موقع پا کر ملاقات کے لیے چاچا آئے، چہرہ اداس اور آنکھیں لال تھیں۔ کھانا ساتھ لے کر آئے تھے۔ باتیں کرنے اور ہنسنے کی کوشش کی لیکن تھر تھراتے ہونٹوں کو دبا لیتی تھی۔ وہ افسردہ حالت میں اٹھ کر گئے تھے۔

ایک ایک کر کے نورین، حنا، سلطانہ نانی، شب نور سبھی خوبانیاں لے کر چپ چاپ میرے پاس آ گئیں۔ وہاں کھانے کی سبھی چیزیں کا ڈالکھ بڑا نکمیں تھا۔

حقوق انسانی کے بے شمار لڑکوں اور بے گناہ عورتوں کو جیل کی ہوا میں دھکیل کر حکمران اس ملک کے عوام کے ساتھ کیا کر رہے تھے۔ پھر سوچتی تھی کہ خیر ہے ٹھیک ہے کہ جہاں آنکھوں والے اندھے، سماعتوں والے بہرے اور ناگلوں والے لنگڑے موجود ہوں۔ وہاں کسی طرف سے خیر کی خبر ممکن ہی نہیں۔ ان کی عقلوں اور شکلوں پر رونا آتا ہے۔ سلطانہ نانی کی عمر پچاس سال یا اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ گلابی رنگت تھی چم چم کرتا چہرہ تھا۔ سفید بالوں میں اب تک کچھ دھندلا پن تھا۔ وہ ہمیشہ مصروف رہتی تھی۔ صرف دال اور سبزیاں کھاتی تھی۔ رات اور صبح کو ابلا چنا بڑے جتن سے دھو کر پانی کے گڑھے چبوترے سے سکھاتی تھی۔ دوپہر کو صغریٰ، سلطانہ، رانی، اختر یہ چاروں بورھی عورتیں لاک اپ سے باہر رہتی تھیں۔ اس بات اور چنے کو کوؤں سے بچانے کے لیے دن بھر پیڑ کے نیچے پاؤں پیارے ہاتھ میں ایک ٹوٹی لٹھی لیے بیٹھ کر سلطانہ نانی اپنے گھر کے کیا کیا سنے دیکھا کرتی تھی۔ پھلی دھوپ کی گرمی میں دھان سکھانے کی رائے لیا کرتی تھی۔ اس قیمتی خزانے کی پوٹلی اپنے پاس رکھنے کی اجازت سلطانہ نے بشری سے لی تھی۔ اس کے بدلے میں سلطانہ کبھی کبھی بشری کے پال چن دیتی تھی۔ سر میں تیل لگا دیتی تھی۔ خود پوٹلی کا ایک دانہ بھی نہیں کھاتی تھی۔ کبھی موقع پا کر پچھواڑے میں کٹھن کے پتے جلا کر تھالی میں انھیں بھونتی تھی۔ اس کے بعد سبھی بچوں کے ہاتھ میں وہ موڑی چوڑا کے نام پر بننے چاول دیتی تھی۔ میں نے ایک دن مانگ کر کھائے تھے۔ اس لیے میری ٹھوڑی پکڑ کر سلطانہ نانی نے میرا بوسہ لیا تھا۔ سکرے ہوئے گالوں کی میڑھی میڑھی لکیروں سے ہو کر فوراً آنسو بہنے لگے تھے۔ اختر ی کو کوئل ماں کہتی تھی۔ کبھی کبھی بڑھیا سے دودھ پلانے کے لیے کہہ کر اسے چڑاتی تھی۔ پوپلے چہرے کی ہنسی اس وقت کتنی عجیب لگتی تھی۔ کاہے کو تنگ کرتی ہو۔ جیسے سچ مچ اس کی چھاتی میں دودھ آ گیا تھا۔ اور گیارہ بچوں کو پلانے کے بعد کوئل کر نہیں پلا رہی تھی۔ کٹھن کے پیڑ میں چھوٹے چھوٹے پھل لگ گئے تھے۔ اس میں سے ایک توڑ کر میض کے نیچے چھپا کر کوئل کو بھلاتی ہوئی کہتی تھی۔

”ناراض مت ہو بیٹی۔ لے یہ کھا۔ نمک لگا کر کھالے۔“

ایک اور بات مجھے نہیں بھول رہی تھی۔ کہ میں گرفتار ہو کر جتنے دنوں تک تھانے میں رہی تھی شروعات کے دو چار دن افسران بالا نظر نہیں آئے تھے۔ شاید نائن گشت اور ناکہ جات کے بعد آرام کیا کرتے تھے۔ صدر آفس سے وہ اسپیشل ٹیم آئی تھی۔ رات کے دس بجے کے بعد کھیل شروع ہوتا تھا۔ کسی دن تین بجے تک تو کسی دن چار بجے تک، یہ الگ داستان ہے۔

لیکن وہ دوپہر نہیں ستاتے تھے۔ قریب پانچ دنوں بعد اچانک ایک روز تپتی دوپہر کے ایک ڈیڑھ بجے لاک اپ کی چابی کھلنے کی آواز سن کر دل ہی دل میں پریشان ہونے لگی تھی۔ لیکن دروازہ کھولا تو ایک پولیس آفیسر تھا۔ اس شخص کا چہرہ تھوڑا ہشت زدہ اور ڈرا ہوا تھا۔ دوپہر کا وقت

تھا۔ اس وقت آفس میں کوئی نہیں تھا صرف دو سپاہی ہمیں دیکھ رہے تھے۔ پیچھے کے دروازے سے نکل کر میں نے دیکھا وہ ایک کھلی جگہ تھی۔ اس افسر نے داہنی طرف جانے کا حکم دیا۔ تھانے کا کپاؤ ختم ہونے کے بعد ایک کوارٹر تھا۔ پلان ہلکا ہلکا سمجھ آ رہا تھا۔ بھاگنے کی کوشش کرتی تو پولیس مقابلہ میں گولی مار دینے کی واردات بھی ہو سکتی تھی۔ یہ بات میرے لیے نئی نہیں تھی۔ اس دن موت کا دل میں ایک عجیب سا کھٹکا لگا تھا۔ اس دن میری ذاتی حالت یہ ہو گئی تھی کہ مجھے کچھ اور تو سوچ نہیں رہا تھا میں موت کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ یہ کب آئے گی؟ کس روپ میں آئے گی؟ میرے ذہن میں آنے والا آخری خیال کیا ہوگا؟ میری بھتیجی ہوئی آنکھیں آخری بار کس کو دیکھیں گی؟ میری ڈوبتی ہوئی سماعت کے ساتھ جو آخری آواز نکرائے گی وہ کس کی ہوگی؟ میرا آخری بھگتا ہوا بوسہ کس کے ماتھے پر بچھے گا؟ جب برسوں کی فلم چند لمحوں میں چل جائے گی تو اس میں کن کن کے چہرے اور آوازیں ہوں گی؟ میرے ٹھنڈے بدن پر گرنے والا گرم آنسو کس کا ہوگا؟ قبر پر پہلی مٹی کون پھینکے گا؟ اس کی قسم جس کی طرف لوٹ کے جانا ہے۔ خوف اور خوشی کے درمیان مجھے موت بہت یاد رہتی ہے۔ اور حیران ہوتی ہوں ان پر جن کے اعمال چیخ چیخ کر اعلان کرتے ہیں کہ لوگو انھیں موت یاد نہیں۔ موت ہی زندگی ہے۔ زندگی کے کاروبار کی میلنس شیٹ اور باٹم لائن موت ہے۔ لیکن ان باتوں کو سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا جبکہ میں کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ پھر بھی میں کوارٹر کے اندر جا رہی تھی۔ یہ وہ کوارٹر تھا جس میں مجھے مار چر کیا جاتا تھا۔ پہلی رات سے ہی مجھے جہاں پھٹکنے کی دھمکی دی جا رہی تھی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ یہ کسی گھر کے پیچھے والا دروازہ تھا۔ اندر جا کر بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”نہا لیجیے۔“ یہ کیسا گھر اور کیسا جال تھا۔ ہاتھ روم کے اندر ایک اور دروازہ تھا۔ جو باہر سے کھل سکتا تھا۔ افسر دھیرے سے بولا۔ ”جلدی سے نہا لیجیے۔“ سچ تو یہ ہے کہ میں اندر سے گھبرا گئی تھی۔ پھر سوچا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ زور سے جھٹکا دے کر دروازہ کھول کر اندر گئی۔ دروازہ پلٹ کر پیچھے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ سامنے لوہے کی بڑی بالٹی میں صاف پانی بھرا رکھا تھا۔ صابن اور صاف ستھرا تولیہ موجود تھا۔ پانچ دنوں تک نہا لی نہیں تھی۔ سو اس دن میں آرام سے نہا لی تھی۔ ہاتھ روم سے باہر نکل کر دیکھا تو سامنے افسر کھڑا تھا۔ اسی طرح دھیمی آواز میں بولا۔ ”مہربانی کر کے بال باندھ لیجیے۔ کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس بار سیدھے میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ تھانہ سے واپس لوٹتے ہوئے سب سے آنکھیں بچا کر اس نے کہا۔ ”ہم لوگ بھی انسان ہیں۔ ہمارے گھر میں بھی ماں بہنیں ہیں۔“ پھر لاک اپ میں بند ہو گئی۔ جیسے بیچ میں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس واقعے کے کئی سپاہی گواہ تھے جنہوں نے اس واقعے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مجھے خود یہ ناقابل یقین لگ رہا تھا۔

انہی دنوں میں نے کرو شینے سے لیس بننا سیکھا تھا۔ وہاں کی لڑکیوں نے بڑے جوش سے مجھے سکھایا تھا۔ اون مانگنے کے تجربے کے بعد اب کوئی آفس سے سوت نہیں مانگتا تھا۔ وارڈن لا دیتے تھے۔ ایک دن شام کو باغیچے میں ٹہلتے ہوئے سونی گود والی ایک نئی قیدی عورت زویا نے مجھ سے بات کی تھی۔ پچیس سے زیادہ عمر کی ہوگی۔ زویا نے اپنے آشنا صداقت سے مل کر اپنے شوہر نعیم کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ زویا اور اس کا خاوند نعیم علی آباد کے تھانہ سدھو نگر کے تحت گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ ایک دن صبح زویا کی چیخ و پکار سن کر لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ گاؤں والوں نے دیکھا نعیم فرش پر چٹ پڑا تھا۔ اس کے گلے میں پھندا کسا ہوا تھا۔ جبکہ اس کی بیوی زویا پاس ہی بیٹھی ماتم کر رہی تھی۔ گاؤں کے ایک نوجوان نے مشتبہ حالت میں ہوئی نعیم کی موت کی اطلاع تھانہ سدھو پورہ کو دے دی۔ اطلاع پا کر انسپکٹر غلام سرور موقع واردات پر پہنچ گئے۔ لاش و موقع واردات

کا معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے ماتم کر رہی زویا سے بھی پوچھنا چھ کی۔ زویا نے روتے ہوئے بتایا کہ رات کے اندھیرے میں کوئی اس کے شوہر کے قتل کر گیا تھا۔ انسپکٹر غلام سرور نے لاش کا بیچ نامہ بنا کر اُسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔ اس کے بعد زویا کے کردار کے بارے میں تفتیش کی۔ تو پتہ چلا کہ گاؤں کے ہی قمر جاوید سے اس کا یار نہ تھا۔ قمر جاوید کے گھر پر بل دی گئی تو وہ فرار ملا۔ پولیس زویا کو تھانہ لے آئی اور اس سے پوچھنا چھ کی تو ایک کہانی روشنی میں آئی۔

املائی گاؤں کے باشندے سکندر کا نعیم منجھلا بیٹا تھا۔ نعیم کے علاوہ سکندر کے تین بیٹے اور تھے۔ چاروں بیٹوں کی شادیاں کر کے سکندر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ نعیم کی شادی آٹھ سال قبل جوہڑ والا کے گاؤں پیراں والا کے رہنے والے احسن مسعود کی بیٹی زویا سے ہوئی تھی۔ زویا کا رنگ بھلے ہی سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا تھا۔ اوپر سے سڈول جسم، زویا جیسی بیوی پا کر نعیم اترا تا پھرتا تھا۔ زویا بھی خوش تھی کہ اسے اتنا چاہنے والا شوہر ملا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سال کب بیت گئے۔ پتہ ہی نہ چلا۔ لیکن زویا کو ایک دکھ کھانے لگا تھا کہ وہ اب ماں نہیں بن سکتی۔ دھیرے دھیرے پانچ سال بیت گئے۔ زویا کا دکھ اب تناؤ میں بدل گیا۔ ہر عورت کی طرح زویا ماں بننا چاہتی تھی۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ ہر ممکنہ کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنا ڈاکٹری معائنہ بھی کروایا۔ اس میں کوئی کمی نہیں پائی گئی۔ ظاہر تھا کہ نعیم میں تھی۔ اس خامی کی وجہ سے شوہر زویا کی نظروں سے گرنے لگا۔ شادی کے پانچ سال بعد نعیم بھی پہلے والا نعیم نہیں رہا تھا۔ پہلے تو روز ہی بیوی کا حسن و جمال اسے جوش دلاتا تھا لیکن اب یہ جوش اس میں کبھی کبھار ہی پیدا ہوتا تھا۔ کام سے لوٹ کر کھاپی کروہ آنگن میں چار پائی پر لمبی تان کر سو جاتا تھا۔ جبکہ زویا اپنی ناتمام خواہشوں کے ساتھ بستر پر کروٹیں بدلتی رہتی تھی۔ بھلے ہی شادی کو پانچ سال بیت چکے تھے۔ مگر زویا اب بھی کسی نوجوان حسینہ کی مانند دکھائی دیتی تھی۔ گاؤں کے زیادہ تر نوجوان آج بھی اسے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔ انہیں میں ایک قمر جاوید بھی تھا۔ قمر جاوید گاؤں املائی میں ہی اپنے کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک ہی گاؤں کے باشندے ہونے کے سبب قمر جاوید کا نعیم اور زویا سے تعارف تھا۔ کبھی کبھار وہ زویا کے گھر آ بھی جاتا تھا۔ اور زویا کو بھابھی کہتا تھا۔ اسی رشتے سے وہ زویا سے ہنسی مذاق بھی کر لیتا تھا۔ جس کا زویا برا نہیں مانتی تھی۔ ایک دن زویا دروازے پر ہی بنی سنوری کھڑی تھی کہ اس کی نگاہ وہاں سے گزر رہے قمر جاوید پر پڑ گئی۔ قمر جاوید کسرتی بدن کا بھیلانہ جوان تھا۔ جوش اور توانائی سے بھرپور۔ زویا نے اسے اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا تو یکا یک ایک نا آسودہ پیاس بیدار ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے تو زویا نے پوچھ لیا۔

”کافی دنوں بعد دکھائی دیے ہو کہیں گئے ہوئے تھے کیا؟“

”مجھے کہاں جانا ہے بھابھی۔ میں تو یہیں تھا۔ پھر جس گاؤں میں آپ جیسی بھابھی ہو اس گاؤں کو چھوڑ کر کوئی کہیں جائے گا بھی کیسے؟“

”اچھا خالی خولی مسک لگا نا بند کرو۔ کبھی بھابھی کا حال پوچھنے بھی آتے ہو نگاہ پڑ گئی تو بات کر لی۔ ورنہ ہم جیئیں، مریں تمہاری بلا سے۔“

قمر جاوید نے محسوس کیا کہ زویا اس پر کچھ زیادہ ہی مہربان لگ رہی ہے۔ باتوں باتوں میں زویا نے قمر جاوید کو گھر بلا لیا اور پھر دیر تک قمر جاوید سے ہنسی مذاق کرتی رہی۔ اس دن کے بعد قمر جاوید کے گھر سے نکلتے ہی قدم زویا کے گھر کی طرف اٹھ جاتے۔ ایسے ہی ایک دن قمر جاوید جب زویا کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ نعیم کسی ضروری کام سے باہر گیا ہوا ہے اور اگلے دن ہی واپس آئے گا۔ زویا کو اس دن اداس دیکھ کر قمر جاوید نے اس کا

سبب پوچھا تو زویا نے کہا۔

”جس عورت کا مرد ہی اس کی سدھ نہ لیتا ہو اس کا دکھ درد جان کر تم کیا کرو گے؟“

”ایسا کیوں کہتی ہو بھابھی۔ میں بھی تو آپ کا اپنا ہوں نا۔ آپ اپنا دکھ مجھ سے بانٹ سکتی ہیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔ اگر تمہارے کسی کام آ

سکوں۔ ویسے بھی حسین چہرے پر ادا سی اچھی نہیں لگتی۔“

”میری پہلی پریشانی تو یہ ہے دیورجی۔ آج کی رات مجھے اکیلے سونا ہے اور اکیلے مجھے ڈر لگتا ہے۔“

رات کا ذکر اور زویا کے اکیلے ہونے کی بات سن کر قمر جاوید کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ بولا۔

”بس اتنی سی بات؟ آپ یہ دیورکب کام آئے۔ آپ کہیں میں یہاں رک جاؤں خیال رکھنے کے لیے۔“ زویا تو جیسے یہی چاہتی تھی۔ پھر

بھی اس کے دکھاوے کے لیے کہا۔

”رہنے دو۔ خواہ مخواہ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔“

”پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔ میں رات کو آ جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر قمر جاوید وہاں سے چلا گیا۔ قمر جاوید کو دیکھ کر زویا بھی خوش ہو گئی۔ اور

اس کے دل و دماغ میں شہنائیاں ہی بجنے لگیں۔ زویا کمرے میں سونے لپٹی جبکہ قمر جاوید نے اپنا بستر آگن میں لگا لیا تھا۔ دونوں سونے کے لیے

چار پائیوں پر لیٹے ضرور تھے۔ لیکن نیند کسی کی آنکھ میں نہیں تھی۔ اچانک قمر جاوید کے کانوں میں زویا کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ اٹھ کر جھٹ اس کے

پاس پہنچا۔ کمرے میں روشن نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا۔ زویا بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ اس کا ہاتھ اس کے سینے کو سہلا رہا تھا۔

قمر جاوید کی نظر زویا کی چھاتیوں پر پڑی تو اس کی آنکھیں حسرت آمیز تجسس سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ زویا کے بلاؤز کے اوپر ہک کھلے ہوئے تھے۔

جہاں سے اس کی پرشباب چھاتیاں باہر جھانک رہی تھیں۔ قمر جاوید نے زویا کی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا ہوا بھابھی۔ طبعیت ٹھیک نہیں ہے؟“

”ہاں کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ سینے میں بے چینی سی سائی ہے۔ جی گھبرا رہا ہے اور بہت گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ جی کرتا ہے سارے کپڑے

اتار پھینکوں۔“ زویا نے قمر جاوید کی طرف پیاسی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ کر قمر جاوید۔ میرے سینے کی ماش کر دو۔“

”ہا۔۔۔ ہاں۔“ کہتے ہوئے قمر جاوید نے اپنا ہاتھ زویا کے سینے پر رکھا اور آہستہ آہستہ اسے سہلانے لگا۔ زویا کی چھاتی سہلاتے

سہلاتے قمر جاوید اس کے اوپر جھک آیا تھا۔ اتنا قریب کہ دونوں کی گرم سانسیں ایک دوسرے سے الجھنے لگیں۔ دھیرے دھیرے دونوں ایک دوسرے

کی آغوش میں سما گئے۔ زویا اور قمر جاوید رات بھر ایک دوسرے سے جسمانی لذت لوٹتے رہے۔ پھر منہ اندھیرے قمر جاوید گھر لوٹ آیا۔ البتہ اس دن

کے بعد ان دونوں کو اپنی پیاس بجھانے کے لیے کوئی ڈرامہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

نعیم کی غیر موجودگی میں زویا اور قمر جاوید اکثر جسمانی تسکین حاصل کرنے لگے۔ اسی دوران زویا کی دوسری خواہش بھی پوری ہو گئی۔ اس

کے پاؤں بھاری ہوئے اور وقت پر اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ پیدائش کے بعد زویا قمر جاوید کو اور زیادہ چاہنے لگی اور وہیں نعیم سے اس کی نفرت بھی

مزید گہری ہو گئی۔ ادھر گاؤں میں زویا اور قمر جاوید کے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں تو بات نعیم کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ نعیم نے زویا کو پھنکارتے ہوئے اس پر بندش عائد کر دیں۔ لیکن زویا اب کہاں ماننے والی تھی۔ نعیم جب بھی اسے کچھ کہتا۔ زویا اس پر نامرد ہونے کا الزام لگا کر اسے خاموش کر دیتی تھی۔ دراصل اب وہ نعیم کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ لیکن نعیم کے جیتے جی یہ ممکن نہیں تھا۔ پھر دونوں نے ایک خطرناک منصوبہ بنالیا۔ سردیوں کی رات بھی نعیم کھانا کھا کر گہری نیند سو گیا تھا۔ ایسی دوران قمر جاوید دبے پاؤں زویا کے گھر میں داخل ہوا اور پھر نعیم کو گلے میں اٹھو چھا ڈال کر دونوں نے اسے کس دیا۔ نعیم موت کے گھاٹ اتر گیا۔ اس کے بعد وہ ساری رات سیکس کا جشن مناتے رہے۔ گاؤں میں جاگ ہونے سے پہلے قمر جاوید اپنے گھر لوٹ گیا۔ تو زویا نے منصوبے کے اگلے حصے کے مطابق رونا پیٹنا اور بین کرنا شروع کر دیا۔ زویا کا بیان درج کرنے کے بعد پولیس نے قتل کے اس معاملے کو درج کر لیا۔ اس دن زویا اور قمر جاوید کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ جہاں سے عدالتی حراست میں انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ اور اس میں زویا اور قمر جاوید کو عمر قید کی سزا ہوئی تھی اور انہوں نے اس سزا کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر رکھی تھی۔

اس سال بہت بارش ہوئی تھی۔ اتنا سیلاب آیا کہ نالہ سے ہو کر پانی جیل کے اندر گھس آیا تھا۔ جس کے ساتھ بہت سی ترکنڈا مچھلیاں بھی آ گئیں تھیں۔ کم عمر کی لڑکیوں نورین، رومانہ، نعیم، رابعہ، شیردا، کنول انہیں پکڑ رہی تھیں۔ سب مچھلیاں پکڑ کر انہیں اکٹھی کر کے گیٹ کیپر سے منت سماجت کی گئی کہ پھولوں والا چوک سے انہیں پکوا کر لا دے۔ آنگن کا پانی بڑھ کر برآمدے کے کنارے چھوٹنے لگا تھا۔ پانی نکالنے کے لیے اسٹیر کھڑا کر رکھا تھا۔ میں اور کوئل اپنی ناپ رہے تھے۔ بھابھی نے کہا۔

”جیسی آپ پاگل ہیں ویسی کوئل، اس سے کیا ہوگا؟ کیا آپ کچھ دیکھ پائیں گی۔ آپ سب کو تو سیل میں بند کر دیا جائے گا۔“ بھابھی نے جب ایسا کہا تو شاید ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ بھابھی کو جیل کے بارے میں سب معلومات ہوتی تھیں۔ کسی بھی خطرے سے فیمل وارڈ کو بچانے کا راستہ بھابھی جانتی ہوتی تھی۔

ایک بار لڑکیوں کے پورے کے پورے کپڑے کھد ر کے آئے تھے۔ یعنی سال بھر میں تین تین سوٹوں کا کوٹ تھا۔ نئے کپڑے دیتے وقت پرانے کپڑوں کو گن گن کر واپس لے لیا گیا تھا۔ ان تین سوٹوں کو اچھی طرح دھلا ہوا ہونا چاہیے تھا۔ کپڑے دھونے کے لیے سرف اور صابن آتا تھا۔ سرف میں ڈبو کر انہیں پلٹ پلٹ کر دھوتے ہوئے سب کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ میٹرن کو کئی بار کہا گیا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ پھر ایک ایک سوٹ کی غلط مانگ کو لے کر اس نے جیلر کے پاس جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ لہذا جیل کی لڑکیاں پھٹے ہوئے میلے کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ منگل وار کو سپرینڈنٹ کا انسپکشن راونڈ ہوتا تھا۔ یہاں کی زبان میں فائل کہا جاتا تھا۔ بھابھی نے اس سے ایک دن پہلے لڑکوں کے ساتھ آئے جمعدار کے ہاتھ کھلوا بھیجا کہ ہر قیدی لڑکی کی درخواست ہے کہ مہربانی کر کے صاحب دوسرے دن فائل پر آئیں۔ وارڈ میں ایک دبا ہوا اشتعال تھا۔ میٹرن پھنکار رہی تھی۔ قیدی کی اتنی ہمت وہ حدیقہ ہے تو کیا ہوا۔ کیا وہ قیدی نہیں ہے؟

بڑے جمعدار کے منہ سے سن کر سپرینڈنٹ نے فوراً بھابھی کو آفس بلوایا وہاں جا کر اس نے جو کہا اس کا خلاصہ مختصر ہے کہ جیلر صاحب تو لڑکیوں کے باپ کی طرح ہیں۔ ان سے بھلا شرم کیسی۔ لیکن آجکل لڑکیاں قریب قریب نکلی ہیں۔ ایسے حالت میں وہ کیسے سامنے آئیں گی۔ کھانا

دیئے جانے کے وقت وہ بھی نمبر کے اندر رہتی تھیں۔ لیکن صاحب کے فائل میں وہ کیا کریں گی۔ اپنی عزت کی حفاظت کے لیے انہوں نے اتنی بڑی گستاخی کی ہے۔ سپرینڈنٹ ہکا بکارہ گئے۔ اسی دن حکم دیا گیا کہ فوراً لڑکیوں کو دو دو سوٹ اسٹیشنل دیئے جائیں اور کارڈ میں نہیں لکھا جائے گا۔ یعنی پرانے کپڑے ابھی واپس نہیں کرنے ہوں گے۔ سالانہ تین سوٹ لیتے وقت انہیں واپس کرنا ہوں گے۔

لگاتار بارش کی وجہ سے پورا باغیچہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ باغبانی سے چھٹی ملی ہوئی تھی۔ جڑوں میں پانی جمع ہونے کی صورت میں کھل کے پیڑوں کے پتے پیلے ہو جھڑ رہے تھے۔ چپ چاپ بھی نے آپس میں طے کیا کہ جمعے ہوئے پانی میں کبڈی کھیلیں گے۔ اچانک دوپہر کے وقت وارڈن کو بلا کر کہا کہ تب ضروری کام ہے اور پھر سیل کا دروازہ کھلتے ہی دوڑ کر پانی میں اتر گئیں۔ سبھی پہلے سے تیار تھیں۔ کوئل، انعم، ریشم کے علاوہ اور بھی کئی لڑکیاں تھیں۔ باغیچے میں پیڑوں کے نیچے گھٹے بھر پانی تھا۔ کنڈی کھیلنے کے بہانے ٹھیل ٹھیلی دھکا دھکی اور ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ اور وارڈن ہم سے تھوڑی دور کھڑی غصے سے بڑبڑا رہی تھی۔ اور گزارش کر رہی تھی کیونکہ تالا کھول دینے کا آفیشل قصور اس کا ہی تھا۔ اس لیے زیادہ غصہ دکھا بھی نہیں سکتی تھی۔ ادھر ہسپتال کے وارڈ کے برآمدے میں بیٹھ کر حدیقہ بھا بھی ہنس رہی تھی۔ وارڈن کے کہنے پر حلیمہ کہنے آئی تھی کہ چل کر سیل میں بند ہو جاؤں۔ تبھی دو تین لڑکیوں نے مل کر اسے کھینچ کر پانی میں گرادیا تھا۔ کھینچا تانی میں نیچے گرنے سے مورنگ سے گھس کر گھٹنے سے پاؤں تک کی چمڑی چھل گئی تھی۔ بہتا ہوا خون دیکھ کر اچھا لگ رہا تھا۔ کسی طرح کے ظلم کے بغیر یا اس طرح چوٹ سے معمولی کٹ جانے سے اب بھی خون بہتا تھا۔ ہنسی کی آواز اتنی تیز ہو رہی تھی کہ آم کھل کے پیڑوں کو پار کرتی ہوئی آفس تک پہنچ رہی تھی۔ اسی دوران گیٹ کے سپاہی نے آ کر کہا کہ سپرینڈنٹ صاحب جاننا چاہتے ہیں کہ فیملی وارڈ میں کیا ہو رہا ہے۔ تو سب کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ میں نے کہنے کو کہا تھا کہ جا کر کہو۔ میں جھوٹ بول کر سیل سے نکل کر پانی میں چلی گئی تھی اور مجھے پکڑنے کے لیے کچھ لڑکیاں پانی میں اتر رہی تھیں۔ مگر میری یہ بات مائرہ کو پسند نہیں آئی تھی۔ اپنے آپ بڑبڑا رہی تھی۔ ایک کا قصور تو نہیں تھا۔ سبھی مل کر کھیل رہے تھے۔ میٹرن کو اپنی اہمیت کم ہونے کی وجہ سے غصہ آرہا تھا۔ وہ ایسی غصے میں سپرینڈنٹ کو سارا واقعہ سنا آئی تھی۔ سپرینڈنٹ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ اچھا یہ بات ہے۔ اس معمولی واقعے سے ایک بڑا فائدہ ہوا تھا۔ سپرینڈنٹ میٹرن سے بھی بھیا نک تھے اور کچھ کہنے پر ڈنڈا پڑتا تھا۔ میں حدیقہ بھا بھی کی بات مانتی تھی۔ پر وہ بھی جانتی تھی کہ بھوک ہڑتال کے دوران ان کی بات نہ ماننے سے انہیں چوٹ پہنچی تھی۔ بار بار گھوم کر سیل کے دروازے کے پاس آتیں اور پوچھتیں۔ یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ برآمدہ کی صفائی کرتے کرتے نادرہ دھیمی آواز میں کہتی۔ ”اے ماریہ تم نے کچھ کھایا نہیں۔ وارڈ میں کسی کا کچھ کھانے کا من نہیں ہے۔“ وہ یوں دیکھتی کہ اس کی دونوں آنکھیں باطن کو مس کر جاتیں۔ باقاعدگی سے چیک اپ ہو رہا تھا۔ زبردستی کھانا کھلانے کی کوشش کرنے پر لٹی کے ساتھ پھر خون نکل آتا تھا۔ سپرینڈنٹ کا شیشن جج صاحب کے ساتھ دورہ تھا۔ بھوک ہڑتال ختم کرنے کے لیے میری شرط تھی کہ مجھے اپنے شہر کی جیل میں منتقل کرنے کی یقین دہانی کرائی جائے۔ میں مانتی تھی کہ ایسے دلا سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس لیے میں یہ باتیں کسی صورت بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اس سے پہلے آٹھ یا نو دن پہلے بے حد قیمتی سوٹ میں ملبوس انسپکٹر جنرل پولیس آئے تھے۔ ان کے پیچھے سپرینڈنٹ، ڈپٹی سپرینڈنٹ اور پولیس کی بڑی فوج تھی۔

”آپ کو کیا تکلیف ہے بتاؤ! آپ میری بیٹی کی طرح ہیں۔ میں آپ کے دو منٹ میں سب کچھ کر دوں گا۔ لیکن بھوک کی حالت میں آپ

گاڑی میں کیسے جاسکتی ہیں۔ دیکھیے۔ آپ میری بہن کی طرح۔۔۔“ اس کے بعد کہیں وہ دوست کی طرح یا ماں کی طرح نہ کہہ دیتے۔ اس لیے میں نے پہلے ہی ان سے کہہ دیا۔

”سر مجھے میرے علاقہ کی جیل میں ٹرانسفر کیا جائے۔“ یہ سن کر فوراً چہرے کی چمک اور ہنسی دور ہو گئی اور چھیدے ہوئے غبارے کی طرح چہرہ چمک گیا۔ چہرہ گھما کر کھٹ پٹ کی آواز کرتے ہوئے چلے گئے۔ پیچھے جاتے ہوئے دوڑ پٹی سپرینڈنٹ ہنس رہے تھے۔

اس دن روشنی اور اندھیرا پار کرتے ہوئے ہسپتال میں ہوش آیا دونوں ہاتھوں میں سیلائن کی بوتل اور خون کی بوتل لگی تھی۔ تقریباً بے ہوشی میں تین دن بیت گئے۔ دوسری رات میں ہی خود کی بوتل کھول لی گئی تھی۔ میں نیند بھری آنکھیں کھول کر ایک ایک بار چہرے پر جھولتے کانچ کے بلب کی روشنی دیکھ رہی تھی۔ صبح ایک ڈاکٹر آئے، کافی جھلاہٹ کے ساتھ انہوں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے۔ وارڈ میں پولیس کیوں تعینات ہے؟“ ان کا نام ڈاکٹر عرفان تھا۔ مجھ سے بولے۔ ”دیکھو، یہاں مجھ سے تو آپ کی کوئی دشمنی نہیں ہے۔ آپ کی لڑائی ان سے ہوگی۔ ہمارے یہاں سے تھوڑا ٹھیک ہو جائیں پھر وہاں پہنچ کر جودل چاہے کر لینا۔“ گلو کوڑ کی بوتل کھلوادی۔ لیکن روز کا لگانا کھولنا جاری رہا۔ پھر بولے۔ ”ویسے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے تو مریضوں کو تھوڑا کھسکا کر سلانے کا انتظام کیا ہے۔ خاص کر اس مریض کے لیے نیند بہت ضروری ہے۔ پولیس اگر یونہی سر پر سوار رہی تو میں علاج کر کے کیا کروں گا۔“

اس دن نیند اور بیداری میں خون کی بوتل سے کچکی اور سردی اتار کر آرہی تھی۔ اور مجھے رہ رہ کر لگ رہا تھا کہ میں مرجاؤں گی۔ ڈاکٹر عرفان بھلائے نہیں جاسکتے۔ وہ ساتھ والے بیڈ پر ایک بڑھیا قیدی کو چمک اپ کر رہے تھے۔ ایک ساتھ ایک ٹرینی نرس بولی۔

”سر اس کا سر سیدھا کر دوں۔“ وہاں ناز و نام کی ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ پولیس کے میرے بیڈ کے قریب آنے سے سب کو منع کر رکھا تھا۔ لیکن ناز و پولیس سے بھی نہیں ڈرتی تھی۔ وہ تب آ کر میری بغل میں لیٹ جاتی تھی۔ اور اپنی ماں کے بارے میں اور اپنے گھر کے بارے میں باتیں کرتی رہتی تھی۔ یونہی وزننگ آور کی گھنٹی بجتی تھی۔ وہ زور زور سے رونے لگتی تھی۔ گھنٹی بج گئی ماں ابھی تک نہیں آئی۔ پیدل سفر کر کے آنے میں دیر ہو جاتی تھی۔ اپریشن کی تاریخ دے دی گئی تھی۔ ناز و گھر لوٹنے کے لیے بیتاب تھی۔ شام کو مر جھایا چہرہ لیے میرے پاس آئی اور بتایا کہ کل بھی آپریشن نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر کل سے نائٹ کریں گے۔ شام کو جب ڈاکٹر آئے تو ان سے ناز و کی شکایت کی تھی۔ کیا کرتی، پہلے تو وہ حیران ہوئے پھر ہنسنے لگے۔ دوسرے دن صبح اسٹرائیک شروع ہونے سے پہلے ساڑھے چھ بجے ناز و کا آپریشن کر دیا گیا۔ ان سسٹروں کو بھی نہیں بھلایا جاسکتا جو پولیس کے گارڈوں سے لڑ جھگڑ کر مجھے سہارا دے کر نبھانے لے جاتی تھیں اور مجھ سے سیدھی باتیں کرتی تھیں کہ اگر آپ یہاں کے راستے پہچانتی ہیں یا پھر کیس کو جانتی ہیں تو بھاگ جاؤ۔ ادھر جو بھی ہوگا ہم لوگ سنبھال لیں گے۔ پانچ چھ دن بعد جب میں نے سہارا لے کر چلنا شروع کیا تھا۔ تو یہ خبر سننے ہی پولیس نے جیل میں واپس بھیجنے کا انتظام کر دیا تھا۔ تب ہی ڈاکٹر عرفان کا غصہ دبائیں تھا۔ یقین کرو میں امتحان میں چوری کر کے پاس نہیں ہوا ہوں اگر وقت ملا ہوتا تو آپ کو ضرور اچھا کر دیتا۔ پھر سبھی پولیس افسروں کے سامنے کہا۔ دراصل آپ کا صحت مندر ہنا شاید مطلوب نہیں ہے۔ فعل حال زندہ رہنا ہی کافی ہے۔ ڈاکٹر عرفان نے مجھے بہت احترام دیا تھا۔ ایسی محبت ایسا خلوص جیل میں کبھی نہیں ملا تھا۔ جیل سے اب بھی منتقلی کا کوئی

انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ اتنے لمبے وقت میں ساری دنیا سے رابطہ ٹوٹا ہوا تھا۔ کہ خود ہی جیسے خود کا وجود بھولتی جا رہی تھی۔ مجھے اس طرح بلاوجہ قید رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس بار تیسرے دن طبیعت پھر خراب ہوئی تو مجھے وارڈن نے بتایا کہ کوٹ لکھپت جیل کا ٹرانسفر آرڈر آ گیا ہے۔ کافی رات میں مجھے اسٹرپچر پر لٹا کر سیل سے نکالا گیا تھا۔ اسٹرپچر پر لیٹ کر تین برسوں بعد اچانک پورے آکاش میں بھرے تاروں کو دیکھا تھا۔ پورا آکاش جیسے کسی بڑی حقیقت کے مجموعے کی طرح لپک رہا تھا۔ جیل دین میں بیٹھنے سے پہلے تین منٹ مجھے تاروں کی کاروائی زندگی لگے تھے۔

میانوالی جیل میں کئی طرح کے تجربات اور بیمار جسم نے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ چودہ اگست کی رات تھی۔ پورے شہر میں جشن کا سماں تھا۔ یہاں بھی آدھی رات کو ہی پہنچی تھی۔ جیل کا گیٹ رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ گیٹ پر پولیس کا گارڈ موجود تھی۔ پولیس کے ایک ملازم نے پہلے تو باہر رکنے کو کہا۔ لیکن مجھے لے جانے والے آفیسر انچارج جب آگے بڑھ کر گارڈ انچارج سے کچھ کہا تو فوراً اندر جانے دیا گیا۔ لیکن یہ سب معاملہ مجھے عجیب سا لگا تھا۔ کہ مجھے کوئی پوچھ نہیں رہا تھا کچھ دیر کھڑی رہ کر بیٹھ گئی تھی۔ سپرینڈنٹ، ڈپٹی سپرینڈنٹ سبھی لا تعلق ہو کر اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ادھر سے ادھر جا رہے تھے کچھ دیر بعد سمجھ میں آیا کہ ایک سیل کی چابی نہیں مل رہی تھی۔ اس لیے یہ دہائی ہی پلچل تھی۔

میسرن اس دن چھٹی پر تھی سپرینڈنٹ سے چابی لے کر ہیڈ وارڈن اور ایک سپاہی مجھے پہچاننے لگے۔ لمبے عرصے تک جیل کی زندگی کی وجہ سے چلنے میں خود پسندی آ گئی تھی۔ ملتان میں لڑکیوں کا سیل گیٹ میں داخل ہوتے ہی تھا اور یہاں جیل کے آخری سرے پر تھا۔ دھندلی روشنی اور اندھیرے میں چوہتر پار کر کے چل رہی تھی۔ ایک بار ہیڈ وارڈن سے بولی تھی۔

”حقوق انسانی کی لڑکیاں یہاں قید ہیں مجھے بھی وہاں رکھا جائے۔“

جواب ملا۔

”ہوگا سب کچھ ہوگا۔“

گھنٹی بجا کر گیٹ کے اندر کا تالا کھول کر، باہر کا تالا کھول کر ساتھ کے سپاہی کو باہر ہی چھوڑ کر ہیڈ وارڈن مجھے اندر کے کر گئے تھے۔ اس وارڈ میں ڈیوٹی کر رہی عورت کو بلایا۔ اُس وقت جیل کی عورتوں نے میرا اہانہ استقبال کیا تھا۔ جو لڑکی سلاخوں کے اندر سے گیٹ کے سامنے تیز روشنی میں آ کر کھڑی ہوئی تھی وہ صرف اپنی کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ بھاری بھر کم سینے پر پردے کے نام پر زیادہ مقدار میں پاؤڈر لگا رکھا تھا۔ ہاتھ میں سونے کی چوڑیاں اور ناک میں لونگ تھا۔

عارفہ کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بعد میں سمجھ آیا کہ عارفہ جیل کے رکھ رکھاؤ کی ایک بہترین علامت تھی۔ تقریباً بارہ سنگین مقدموں کی انڈر ٹرائل مجرم جیسے سر سے پاؤں تک شہری گناہ کا ایک نمونہ تھی۔ فیملی وارڈ میں اس کی انتہائی فرماں بردار مددگار شرمیلا اور شمن تھیں۔ دونوں ہی کوٹھے کی مالکن تھیں۔ شرمیلا نے ایک لڑکی کا اسقاط حمل گراتے وقت اسے مار ڈالا تھا۔ شمن اپنے بچوں کو بیچنے کے جرم میں گرفتار ہو کر آئی تھی۔ ایک بیس سال کی سزا بھگتنے والی میٹ کی سزا دو برس باقی تھی۔ دوسرے کی سزاسات سال کی تھی۔ جس میں ابھی تین برس باقی تھے۔ شمن سونا پور کینگ علاقہ سے آئی تھی۔ اس کا شوہر بھی ایسی جیل میں تھا۔ اور اپنی مردانہ خصلت اور کمینگی سے اغوا شدہ لڑکیوں کی اخلاقی قوت کو توڑ دیتا تھا۔ انہیں خوف زدہ کرتا تھا۔

شمن اور شرمیلا میں سے کوئی بھی پڑھا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ ان کی عمریں بھی ڈھل چکی تھیں۔ لہذا میٹ اور پہرے دار ہونے کے باوجود عارفہ کی اندر رائل مملکت میں وہ اس کے محکوم ملازم کی طرح رہتی تھیں۔ قدرتی طور سے یہ سب میں ایک دن میں نہیں جان پائی تھی اس رات عارفہ کو دیکھ کر صرف متعجب نفرت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس ہسپتال میں میری پہلی رات کا باقی وقت بہت مشکل گزرا تھا۔ دوسرے دن صبح آنگن میں نکل کر دیکھا تو سچ سچ لڑکیوں کا ایک جھنڈ تھا۔ حقوق انسانی کے اسباب سے مختلف علاقوں سے قیدی بنا کر لائی گئی تھیں۔ میں نے بڑی عزت سے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ سبھی آنگن میں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ ایک دوسرے کی باتیں سن رہی تھیں۔

جیل کا ماحول گندا اور بے ترتیب تھا۔ ایک بڑے آنگن کے ایک طرف اندر آنے کا دروازہ تھا۔ اس کے بغل میں ہی ہسپتال تھا۔ دونوں بڑے بڑے اندھے کمرے اور چوتھی طرف ایک دو منزلہ بلاک تھا۔ اس کی چلی سطح پر چھوٹے چھوٹے کمرے کے دروازے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آنے والے دو برسوں تک یہ اینٹوں کی جال ہی میری دنیا کی کھڑکی بن جائے گی۔ آنگن کے داہنی طرف اکلوتا کٹھن کا پیڑ تھا۔ اس کے نیچے سمیٹ کا گول پکا چبوتر تھا۔ اسی طرف قیدیوں کے وارڈ کے پیچھے پاگلوں کا وارڈ تھا۔ ان سب کو ملا کر جیل میں ایک وارڈ عورتوں کا تھا۔

زیادہ دیر تک کھڑے رہنا یا بات کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہو پارہا تھا۔ نئی ساتھیوں کے ساتھ ان کے وارڈ میں گئی تھی۔ وہاں کا ماحول کافی حد تک ہوٹل کی طرح تھا۔ زمین پر چاروں طرف بستر لگے تھے۔ رنگین چادریں بچھائی ہوئی تھیں۔ کتنے دونوں بعد باہر کی دنیا کے لوگوں کا یہ سامان دیکھ رہی تھی۔ میلے پھیلے رنگین کپڑے کچھ دیوار پر لٹکے ہوئے تھے۔ کمرے کی دوسری طرف کچھ بچے تھے۔ ان میں بہت سوں کی مائیں پاگلوں کے وارڈ میں تھیں۔ مجھے ان سب کے بارے میں بتانا ہوگا۔ ہمارے ان مشترکہ ساتھیوں کی باتیں۔ میری ان نئی ساتھیوں میں سبھی نو جوان ہی تھیں۔ کوئی کوئی جیسے آمنہ، عمیرہ، رابعہ، رفیعہ، فائزہ۔ مگر بہ تو ابھی جوان ہوئی تھیں۔ تب تک مجھے پتہ نہیں تھا کہ صرف دو ہی دن ان کا ساتھ مل پائے گا۔ آخری دنوں کے علاوہ باقی کو شاید کبھی بھی نہیں دیکھ پاؤں گی۔ صبح کے دس بجے ہسپتال میں ڈاکٹر آئے۔ عارفہ کے ساتھ باتیں کرتے کرتے اچانک نیا مہمان آ گیا۔

”اچھا تو آپ کو کیا تکلیف ہے۔“

”متلی؟“

”اٹھیک ہے۔“

جیلو سیل جیسی کسی دوا کا نما لکھنا شروع کیا۔ تو پھر کچھ دنوں تک فالصا اور دودھ لیجیے۔ ڈاکٹر کے لیے چائے اور بسکٹ آگئے تھے۔ وہاں سے نکل کر میری جان میں جان آئی تھی۔

آنگن میں قیدی لڑکیاں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ اداس اداس جیسے وہ انسانیت کا تھکا ہوا اور بد قسمت حصہ ہوں۔ اس جیل میں زیادہ تر عمر قید اور سزائے موت کے قیدی ہوتے تھے۔ پہلے دن وارڈ میں جس چیز سے مجھے حیرانی ہوئی تھی۔ وہ تنور کے دو چولہے تھے۔ ملتان میں تو حد یقہ بھابھی آگ جلانے کی ہمت نہیں کرتی تھیں۔ کبھی کبھی پیچھے کی طرف ایک دم کسی نہ کسی کو نے میں کٹھن کے پتوں کو جلا کر ایک پیاز بھوننے کے فوراً بعد پوری

راکھ کو مٹی سے ڈھک دینے کے باوجود دوسرے دن جب تک جھاڑو والا صفائی کر کے چلا نہیں جاتا تھا۔ ڈرہی لگا رہتا تھا۔ یہاں پر پاگلوں کے لیے کئی گیلن دودھ ابا لے، ہسپتال کے مریضوں کے لیے چائے بنانے اور عورتوں کے گندے کپڑے ابا لے کے لیے ان چلوہوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہر کمرے میں دو چولہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر اس کا نام بھائی گھر پڑ گیا تھا۔ اس کے ٹھیک سامنے دوسرے منزل والے بلاک میں جانے کے لیے لکڑی کا تالا بند دروازہ تھا۔ میں ساتھیوں کے ساتھ گھوم گھوم کر سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

اس وقت قیدیوں کو بہت کم وقت کے لیے سیل میں بند کیا جاتا تھا۔ لیکن ایک قیدی ایسا تھا جو مسلسل سیل میں بند رہتا تھا۔ اس کا نام مریم تھا۔ سعادت بلوچ کے ٹریونل میں اس کی سماعت ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ بات چیت کرنا منع تھی۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ مریم سے بات کر سکوں۔ لیکن میٹرن منع کر دیتی تھی۔

بھائی گھر کی راکھ کے ڈھیر پر کچھ گھاس اگ آئی تھی۔ اس میں سے سی ایک گچھا اکھاڑ کر اس سیل کے دروازے پر لے آئی۔ چاروں طرف اندھیرا اور سیلن کی بو تھی۔ شاید اس کے تھوڑی سی دیر پہلے مریم نیند سے اٹھی تھی۔ چہرہ سو جا ہوا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ صرف نیند سے اٹھنے کی وجہ سے نہیں سیل کے فرش سے جو پانی اوپر کو جاتا ہے اسے اخبار بچھا کر بھلے ہی روکنا ممکن ہو جاتا ہو۔ لیکن سیلن کو روکنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ اسی لیے اس کا بدن سوزش زدہ رہتا تھا۔ خیر یہ تو بعد کی بات ہے۔ اس دن پہلے دیدار میں سانولی چھوٹے قد کی مریم کو میں نے عام سی لڑکی سمجھا تھا۔ گھاس کا گچھا بڑھا دیا۔ میرے یہاں آنا منع ہے۔ اس نے تھوڑی میز بھی آواز میں کہا۔

”جانتی ہوں۔ لیکن کس کی ممانعت ہے؟ کہاں سے آئی ہو؟“

”گو جرانوالہ سے۔“

اتنے میں آنگن کے کنارے سے وارڈن دوڑ کر آگئی تھی۔

”یہاں سے ہٹ جاؤ، اس سے ملاقات منع ہے۔ اس سے بات نہ کرنے کی میٹرن کی ممانعت ہے۔“

”آپ دیکھ نہیں رہی ہم لوگ ابھی بات کر رہے ہیں۔“

واپس آ کر وارڈ کے ساتھیوں کو ساری بات سمجھا کر بتانے پر سبھی متفق ہو گئیں۔ دراصل حاکموں کے حکم کو نہیں مانیں گے۔ یہی تو ہمارے یہاں پہچانے جانے کی اولین شرط ہے۔ اس بات پر ان لوگوں نے پہلے دھیان نہیں دیا تھا۔ یہ بات سمجھ جانے پر ان میں اب زبردست جوش آ گیا تھا۔ نہانے کے لیے وارڈن نے مریم کے سیل کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ہم لوگوں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ پھر سیل میں واپس نہیں جائے گی۔ ہمارے ساتھ رہے گی۔ میٹرن کے آنے پر ان سے بھی یہی کہا گیا کہ ایک ہی جرم میں جن لوگوں کو قید کیا گیا ہے انہیں ایک ہی سیل میں رکھنا ہوگا۔

شام کو دو نئے واقعات ہوئے تھے۔ پہلا واقعہ یہ تھا کہ وارڈ میں ہیڈ وارڈن شام کو لاک اپ سے پہلے سب کی گنتی کرنے آئے۔ وارڈنوں نے گنتی کی۔ وہاں سے لڑکیوں کو وارڈن کے پاؤں تلے اس طرح بیٹھا دیکھ کر دل کو بہت ٹھیس پہنچی۔ کیا ان کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ بے حد ظلم سہہ کر بھی کوٹ لکھپت اور ملتان کے نوجوانوں نے سپاہیوں کے پیروں کے پاس بیٹھ کر گنتی کروانے کا تعرض کیا تھا۔ اس دن ہم لوگ بھی لائن میں نہیں بیٹھے

تھے۔ ہیڈ وارڈن سے کہا کہ ہم لوگوں نے تو آپ کو یہ نہیں کہا تھا کہ ہمیں یہاں لا کر بند کیجیے۔ جو ہمیں پکڑ کر لائے ہیں انہی کا سر درد ہے۔ وہی گفتی کریں۔ ہم لوگ مرغیاں تو نہیں ہیں کہ شام ہوتے ہی گن کر ڈربوں میں رکھ دیں گے۔ لاک اپ کے بعد کافی دیر تک گانا گایا گیا۔ دوسری بات بھی سب کو پسند آئی۔ اتنے دنوں تک سبھی اپنی اپنی تھالی لے جا کر اپنا کھانا کھاتے تھے۔ اپنی جگہ اپنا برتن صاف کر کے اپنا بستر لگا کر سوتے تھے۔ یہاں تک کہ بچوں کے سونے کھانے سے بھی ہمارے ساتھیوں کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ایک جگہ گول گھیرا بنا کر سب کے کھانے کے بعد میں سب کا برتن دھونا چاہا تو مطربہ اور عجیرہ بھی ساتھ لگ گئیں۔ اور ایک ساتھ ہم نے سارے برتن دھو ڈالے۔ تھوڑی دیر میں وہ جگہ بھی صاف ہو گئی۔ شام کو کھانے کے وقت ہم لوگوں نے پینا اور ایمن وغیرہ کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ ان کو اپنے گاؤں کے بچوں کے بارے میں بتاتے تھے اور اس سے بھی بہت ساری کہانیاں سنا کرتے تھے۔ رات میں بات چیت کرنے کی خوشی میں نیند نہیں آتی تھی۔

جیل کا قاعدہ ٹوٹنے سے تیز رد عمل شروع ہو گیا۔ رات کو کافی تیز بخار آیا تھا۔ دوسرے لوگ بھلے ہی نہیں کچھ پائے لیکن میں اور مریم جانتی تھیں کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے حل ہونے والا نہیں ہے۔ مریم کو بھی گوجرانوالہ سنٹرل جیل میں ایک سال گزارنے اور جیل انتظامیہ سے لگا تار لڑنے کا تجربہ ہے۔ دوسرے دن صبح سے ہی تیز واقعات کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ پہلے تو مجھے اور مریم کو سلپ دے کر سپرینڈنٹ کے دفتر میں جا کر بات کرنے کا حکم دیا گیا۔ سب ساتھیوں نے سلپ پھاڑ کر زمین پر پھینک دی۔ اس کے بعد سپرینڈنٹ آئے۔ پہلے پچکار کر پھر ڈرا کر کہا تو مریم کو سیل میں واپس جانا ہوگا۔ ضرورت پڑنے پر مجھے سالیٹری سیل میں بھیج سکتے ہیں باقی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ بے مطلب ہی خطرہ مول لے رہی ہیں۔ ان سب نے جواب میں کہا۔ کہ جیل میں بند رہنا ہی کم خطرے کی بات تو نہیں ہے۔ اور اب تک بھلے مانس بنے شخص نے انتہائی مختصر جواب دیا۔ ٹھیک ہے۔ پھر وہ باہر نکل گئے۔

سولہ سترہ لڑکیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بیس مسلح لاٹھی سپاہیوں کو لے کر منٹوں میں واپس لوٹے۔ بے رحمی میں خورگراں لوگوں نے قیدی لڑکیوں پر لاٹھی چلانا شروع کر دی۔ لیکن آخر کار ہماری ضد بھی برقرار رہی۔ مریم کو اکیلے ہی نہیں بلکہ فالضہ، مطربہ اور انیلہ سمیت ہم پانچ کو سیل میں بند کرنا پڑا۔ باقی کے نڈر روئے نے ان کو بہت مضطرب کر دیا تھا۔ سپاہی بال کھینچ کر پکڑ کر لائے تو ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن نوجوان مطربہ عجیب اور مستحکم پرسکون چہرے سے آنگن پار کر کے سیل کی طرف جانے کا منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس بار دوسری منزل کے سیل میں مریم اور میں تھیں۔ انیلہ، فالضہ، مطربہ نیچے تھیں۔ وارڈ کا دروازہ بند تھا۔ وہ کس حال میں تھیں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ میری سیل سے کہیں کچھ بھی دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ صرف ملی جلی آواز میں تحریک حقوق انسانی کی نعرے بازی کی آواز سن پار ہی تھی۔

اس دن دوپہر سے دوسرے دن شام تک تیز بخار میں پڑی رہی تھی۔ وقت کچھ عجیب نیم بے ہوشی کے بیچ گزر رہا تھا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ باہر کہیں سے بارش کی آواز آرہی تھی۔ اتنے وقت کے بیچ ایک بار بھی دروازہ نہیں کھولا گیا۔ ہمارے کھانے پینے یا ہماری کسی بھی ضرورت کے بارے میں پوچھنے کے لیے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ دوسرے دن شام کافی تعداد میں سپاہیوں اور جمعدار کو ساتھ لے کر سپرینڈنٹ شاید پچھلے دن کا لاٹھی چارج کا نتیجہ جاننے کے لیے آئے تھے۔ کپڑے لے لے تار تار ہو گئے تھے۔ پہلے تو فطری وجہ سے ہی تامل ہو رہا تھا۔ پھر لاچارگی کی حالت میں سامنے کھڑے ہو

کر لگا کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں ویسا کرتے ہوئے اگر ان کو شرم نہیں آتی تو ہمیں بھلا کیوں شرم آئے؟ ان کے نیچے اترتے وقت شاید باقی لوگ نیچے تک چھوڑنے لگے تھے۔ بھائی گھر کے سامنے کا دروازہ شاید غلطی سے کھلا رہ گیا تھا۔ لکڑی کی سرڑھیوں پر تیز قدموں سے حلیمہ، عمرانہ اور دو چھوٹے بچے دور کر اوپر آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کمبل اور روٹی تھی۔ اسے وہ دھپ سے دروازے کے پاس رکھ کر اٹے قدموں بھاگ گئے۔ اس کے فوراً بعد نیچے سے وارڈن کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ رونیاں ان کے حصے کی تھیں۔ پچھلے دن رات سے چھپا کر رکھی ہوئی تھیں۔ مجھے بھوک نہیں لگی تھی۔ لیکن رونا آ رہا تھا۔ رضا کی عمر 9 برس اور عمرانہ کی شاید سات برس تھی۔ حلیمہ کا باپ چور تھا۔ جو مردوں کے دروازے میں قید تھا۔ حلیمہ اس کی مدد کرتی تھی۔ اس لیے سزا ہو گئی تھی۔

عمرانہ کی ماں پاگلوں کے دروازے میں قریب دو سال سے تھی۔ گھر میں اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے اسے ماں کے ساتھ ہی رکھ گئے تھے۔ انھیں کبھی کسی کا پیار نہیں ملا تھا۔ انھیں نہ تو اپنے خاندان کے بارے میں پتہ تھا۔ نہ تحفظ کے بارے میں اور نہ پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ درس گاہ کیا ہوتی ہے؟ ان کو معلوم ہی نہ تھا۔

ہمارا سیل بڑا عجیب تھا۔ سچ کی سالیٹری سیل جسے کہا جاتا تھا۔ تقریباً دس بارہ فٹ کی دوری پر دیوار تھی وہاں سے اوپر آنے کی سیڑھی تھی لیکن سیڑھی دروازے کے سامنے نہیں تھی۔ کوئی بھی اوپر آنے پر لکڑی کی سیڑھیوں سے آواز سنائی دیتی تھی۔ پر یہ نہیں دکھائی دیتا تھا کہ کون آ رہا ہے۔ ایک طرف کی دیوار میں تقریباً پانچ فٹ اونچائی پر ایک مربع فٹ کی جگہ سے روشنی اور ہوا آنے کے لیے کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ تین تین دن بعد ایک ایک وارڈن دکھائی دیتی تھی۔ جونہانے کے لیے دس منٹ دروازہ کھولتی تھی۔ دن بھر میں بس ایک ہی باریسل سے نکلتے ہی دہائی طرف ہاتھ روم تھا۔ بائیں طرف برآمدے میں کئی سلاخوں سے بند کوٹھریاں تھیں۔ انہی میں سے ایک میں مریم تھی۔ اُسے دوسری طرف کے ہاتھ روم میں لے جایا جاتا تھا۔ مجھے اسی لیے دوسری منزل کی کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ کیونکہ کسی بھی حالت میں نہ تو وہاں سے نیچے لایا جاسکتا تھا نہ کسی سے بات چیت کی جاسکتی تھی۔ مجھے تو کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وارڈنوں کے منہ سے دھیرے دھیرے سننے میں آیا تھا کہ یہ پھانسی سیل ہے۔ جیل کے قیدیوں کو یہاں نہیں رکھا جاتا۔ بارہ سال پہلے حدیقہ بھابھی کو رکھنے کے لیے کھولا گیا تھا۔

ان دنوں مجھے چلتا پھرنا دشوار ہو رہا تھا۔ بغیر علاج کے اگر کوئی سمجھے کہ صرف سوئے رہنے سے ہی بیماری دور ہو جائے گی تو ایسی اُمید کرنا نہایت بے وقوفی کے مترادف ہے۔ بد قسمتی سے میرے داہنے ہاتھ کی کلائی بھی سن ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں مجھے مطربہ انیلہ وغیرہ کو دوائی دی گئی یا نہیں دی گئی۔ وارڈ کا بھی پتہ نہیں کہ کتنی لڑکیوں کو چوٹ لگی تھی۔ انھیں بھی دوائی ملی یا نہیں ملی تھی۔ کلائی میں اپنے حصے کا ایک کپڑا پھاڑ کر کس کر باندھ لیا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ مریم اور نیچے کی دوسری لڑکیاں ٹھیک ہیں۔ ایک بار حلیمہ بھاگ کر آئی تو اسی سے کہہ دیتی کہ ان سے کہنا کہ میں خیریت سے ہوں۔ چپ رہنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ سب سے نزدیک رہنے والوں میں مریم ہی تھی۔ وہ بھی چار پانچ کوٹھری کے بعد بند تھی۔ سیل کے اندر کافی روشنی نہیں تھی۔ اور وارڈن ڈر کے مارے بھول کر بھی سامنے نہیں آتی تھی۔ نیچے فالٹھ اور مطربہ کے سیل میں لائٹ نہیں دی گئی تھی۔ اسی لیے ہم لوگوں نے بھی اپنے بلب واپس کر دیئے تھے۔ برآمدے میں جولائٹ جلتی تھی اسی سے اندر کا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ روشنی سے کیا کرنا تھا؟ میرے پڑھنے کے

لیے ایک ٹکڑا اخبار یا ایک کاغذ کی پڑیا بھی تو نہیں تھی۔ لیکن وہ میانوالی جیل تھی، وہاں کوئی بھی کسی قاعدے کا عادی نہیں تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ سڑھی کا نچلا دروازہ کھلا رہنے لگا۔ ویسے اس سے ہمیں کوئی آسانی نہیں تھی۔ بلے بند برآمدے میں سلسلے سے آٹھ کوٹھریاں تھیں۔ پانچ کوٹھروں کے دائرے میں ہم دونوں کی کوٹھری میں تالا بند تھا۔ لیکن صبح کا وہ دس منٹ پڑھتے پڑھتے آدھ گھنٹے تک پہنچ گیا۔ میں اور مریم جھٹ پٹ نہا کر ایک دوسری کی کوٹھری کے سامنے کھڑے ہو کر باتیں کر لیتی تھیں۔ چوری کے اس آدھ گھنٹے کو چھوڑ کر دن بھر کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ نہانے کے لیے نیچے جا کر ہم لوگ دوسری لڑکیوں سے بات نہ کرنے لگ جاکیں۔ اس لیے ہمارے نہانے کے لیے پانی اوپر ہی لایا جاتا تھا۔ کھانا نیچے آنگن سے لا کر سیل کے دروازے پر پہنچانا پڑتا تھا۔ لیکن یہ کام اور کون کرتا؟ وہاں تو سبھی انڈر ٹرائل لڑکیاں تھیں۔ ان سے لازمی طور سے کوئی کام نہیں کرایا جاسکتا۔ عارفہ یا اس کے اپنے لوگ ہمارا کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ سوا کٹر کام کرنے والی وارڈن اسے پکڑ کر کام لیتی تھی۔ ہمارے کوٹھری بند رہنے سے وارڈن ایک طرح سے خوش ہی تھیں۔ یہاں ڈیوٹی دینے کے لیے روز مزید تین لوگوں کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ یہ مستقل نہیں تھیں۔ ڈیلی پے منٹ پر کام کرتی تھیں۔ میٹرن اور عارفہ کی خوشامد کر کے جہاں تک ممکن تھا یہ ہماری مشکل کم کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ پھر تقریباً ایک مہینہ بعد ایک پندرہ سال کی لڑکی کو اس کام کاج میں وارڈن کی مدد کے لیے مقرر کیا گیا۔ بعد کے ایک برس تک مناشہ ہمارے بہت قریب رہی۔ ہماری دوست، بہن اور ہمارا دکھ سکھ کی مجسم گواہ بن کر رہی۔ مناشہ ڈاکٹر شہر نگر کی سکوتی تھی۔ خالص پنجابی زبان میں پھلچڑی کی طرح بات کرتی تھی۔ تھورا پھنسا سا پرکشش چہرہ تھا۔ برتاؤ میں عجیب ذاتی عزت و ناموس کا احساس خود بخود اجاگر ہو جاتا تھا۔ مناشہ اس سیل کی صورت گریستی سنوارنے لگی تھی۔ میرے لیے تھوڑا سا کپڑے لٹے کا انتظام بھی کیا تھا۔ نیچے مریم کے پرانے مسکن میں ابھی فالضہ اور مریم تھیں۔ وہاں سے مریم کی دو کتابیں بھی اس نے لا دی تھیں۔ ڈاکٹر سے کہہ کر میرے لیے چائے پتی چینی کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ صبح کے وقت بھٹی گھر کے چولہے سے کٹوری میں چائے بنا کر لے آتی تھی۔

رات کی وارڈن صبح کی وارڈن کو گنتی سمجھا دیتی تھی۔ ایک ایک کر کے جیل کے بھی وارڈن کی گنتی مل جانے پر مین گیٹ پر ٹن ٹن کر کے تین گھنٹیاں بجاتی تھیں۔ تب عام وارڈ کھول دیے جاتے تھے۔ رات گھر کی گندی نیند کے بعد گندے کپڑے لیے ماؤں کی گود میں جھولتے بچے، باہر کی خوشی سے محروم گندے آنگن میں نکل آتے تھے۔ گھنٹوں تک کپڑے اٹھا کر یونی چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے۔ جب تک دروازہ کھول کر صبح کے ناشتے کی بالٹی نہیں آ جاتی تھی۔ وہاں پر صبح کا ناشتہ بھی نسبتاً شہری تھا۔ کوٹ لکھپت اور ملتان کی طرح روز کچھڑی نہیں ملتی تھی۔ ہفتے میں سبزی گوشت اور دال کے علاوہ ایک دن ڈبل روٹی بھی دیتے تھے۔ سب کچھ مقدار میں کم ہوا کرتا تھا۔ باقی جن لوگوں کا نام ہسپتال کے بیمار مریضوں کے رجسٹر میں درج تھا۔ ان کی خوراک اور ہوتی تھی۔ ہسپتال کا ڈاکٹر بھی جانتے تھے کہ راحت پانے والے قیدیوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام الگ تھا۔

فالضہ اور انیلہ کو بیماری نے آن لیا تھا۔ ان کی بیماری سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہم لوگوں کو دو پہر میں دو گھنٹے کی چھوٹ ملنے لگی۔ اور دن بھر سیل کا دروازہ کھلا رہنے لگا۔ نیچے سڑھی کے دروازے میں تالا لگا ہوا تھا۔ ہاں رات کو الگ الگ سیلوں میں رہنا پڑتا تھا۔ لیکن دن بھر ہم سب ایک ساتھ ہی رہتے تھے۔ یہ جھوٹ کسی دن بھی ختم ہو سکتی تھی۔ یہ ہم بھی جانتے تھے۔ اس لیے اس وقت ایک دم منصوبے کے مطابق گزارنے کا ہم نے فیصلہ کیا تھا۔ کتاب وغیرہ ملنا ایک مسئلہ تھا۔ بازار میں ملنے والی ایسی بہت سی کتابیں تھیں جو ہمارے لیے وقت طلب تھیں برٹریڈرسل کی دار کمرس

ان ویت نام روس، جرمن جنگ کی تاریخ یا پھر آگ کا دریا۔ جیسی کتابیں اندر لانے کے لیے بہت چالاکی سے کام لینا پڑتا تھا۔ یہ کتابیں تو عام بازاروں میں بکتی تھیں سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

اس دوران نورین اختر نام کی ایک لڑکی آئی تھی۔ اس کا باپ فرانس میں رہتا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد نورین کی کچھ مارڈن لڑکوں سے دوستی ہو گئی۔ ان لڑکوں نے ایک غیر لائسنس آفیشی ہتھیار اور کچھ غیر قانونی کاغذات اسے رکھنے کے لیے دیئے تھے۔ جو اس کے بستر کے نیچے سے برآمد ہوئے تھے۔ نورین ہماری ہی عمر کی سندر بے پروا لڑکی تھی۔ چٹلون اور ڈھیلی ڈھالی بنیان کندھے تک بکھرے بال اور سگریٹ پیتی تھی۔ جب وہ آئی تب اس کے پیچھے ایک سپاہی دوسوٹ کیس اور ایک بیڈرول لے کر آیا تھا۔ ڈسلیزن نہ لینے کا سوال ہی نہیں تھا۔ نیچے کے دراڑ میں ہی رکھا گیا تھا۔ اس کی بہت خواہش ہوتی تھی کہ اوپر آکر ہم لوگوں سے بات چیت کرے اسے وارڈن کچھ نہیں کہتی تھی کیونکہ اس کے والد بھٹے میں دو دن اس سے ملنے آتے تھے۔ نورین کی ماں نہیں تھی۔ اس نے ایک دن بات چیت کے دوران بتایا کہ فرانس میں لڑکیوں نے بریسر پہننا چھوڑ دیا ہے۔ اور ایک ماہ بعد اپنے اثر اور باپ کے ذریعے میرے لیے کچھ اچھی کتابیں بھجوانے کا وعدہ کر کے چلی گئی تھی۔

ایک دن ماں مجھ سے ملنے آئی تھی۔ چاروں طرف سپاہی جمعدار، ڈپٹی سپرینڈنٹ کے علاوہ میرے اور ماں کے بیچ خفیہ محکمے کا ایک اہلکار بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے منہ سے نکلے ایک ایک لفظ کو وہ لکھ رہا تھا۔ دو دن کے انتظار کے بعد آج چندرہ منٹ کے لیے ملنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ایک وارڈن نے آکر بتایا کہ حدیقہ بھابی کی رہائی آگئی ہے۔ ڈھیر سارا پھل لا کر دو دنوں سے جیل کے پھانک کا چکر لگا رہی تھی۔ مجھ سے ملنے کے لیے نہ مل پانے کی حالت میں پہلے سے واقف کسی وارڈن کے ہاتھ وہ پھل مجھ تک پہنچا دینے کے لیے دے گئی۔ حدیقہ بھابی بہت ہنس کھ، مہذب، مدلل اور ڈیسینٹ لڑکی تھی۔

ایک چھوٹی سی لڑکی علینا آئی تھی جو گوگی اور پاگل بھی تھی۔ عمر آٹھ نو سال ہوگی۔ جیکھا چہرہ، سانوالہ رنگ، سر کے گھونگرالے بالوں میں فیتا بندھا ہوا تھا۔ پیلیس کی فراک، پیروں میں جوتے، پتہ نہیں کیسے گم ہو کر آگئی تھی۔ اُسے دیکھ کر میں سوچتی تھی کہ اس کی ماں کیسے رہ رہی ہوگی۔ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی تو پتہ نہیں چلتا کہ بچوں کو کھوجانے پر کہاں کہاں جا کر اطلاع دینی چاہیے۔ علینا کو سیل میں نہیں رکھا گیا۔ دن بھر وہ ایک لمبی رسی سے کشل کے پیڑ کے تنے سے بندھی رہتی تھی۔ کٹوری میں دو دنوں وقت کے لے جو کچھ بھی دیا جاتا تھا اسے پھینک پھینک کر کوؤں کو کھلاتی تھی۔ اپنی ہی دھن میں گھوم گھوم ناچتی رہتی تھی۔ پیلا فراک دھیرے دھیرے گندا، پھر بے رنگ، تار تار ہو کر اس کے بدن سے الگ ہوتا جا رہا تھا۔ اب حلیمہ اور عمرانہ وغیرہ سے اس میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ بالوں میں لٹیس پڑ گئیں تھیں۔ نگے پاؤں، شاید ایک پینٹ جیسا کچھ پہنے ہوئے تھی۔ صرف فرق اتنا تھا کہ حلیمہ، ایمن، عمرانہ وغیرہ خود نہا سکتے تھے اور اسے نہلانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے بدن کا میل بدن میں ہی جما ہوا تھا۔ رات میں بھی وارڈن میں ایک کنارے وہی رسی بندھی رہتی تھی۔ جب وہ پہلی بار یہاں آئی تھی تو پیلا فراک، فیتا، گھونگرالے بالوں میں گڑیا جیسی لگ رہی تھی۔ ہم لوگوں نے اس کا نام سونا رکھا تھا۔ ہر روز سوچتے تھے کہ شاید آج اس کے گھر والوں کو کہیں سے خبر ملے گی اور وہ اسے لینے کے لیے آئیں گے۔

روزانہ کافی رات تک کورٹ کی جیل وین آتی تھی۔ کورٹ میں پیشی کے لیے لے جاتی گئی لڑکیوں پیشی کے بعد واپس لائی جاتی تھیں۔ کوئی

بے گناہ ہو کر تو کوئی ضمانت پر رہا ہو جاتی تھی۔ اور زیر سماعت مقدمات میں شامل واپس لائی جاتی تھیں۔ ہائی کورٹ سے واپس آتے آتے رات کے 10،9 بھی نک جاتے تھے۔ ہم لوگ صبح کورٹ میں پیشی پر جانے والوں کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ کورٹ سے نیا کوئی قیدی آیا یا نہیں آیا۔ یہ بھی دیکھتے تھے۔

رات کی مدھم روشنی میں گیٹ صاف دکھائی دیتا تھا۔ ایک دن کافی ہلچل ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد وارڈن نے بتایا کہ ایک غیر ملکی عورت میڈم ”راسو“ آئی ہے۔ کوٹ اور پینٹ پہنے ہوئے ہے۔ ڈیوٹی پر موجود وارڈن نے تجسس بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اُف خدایا۔ ایہ لڑکی ہے کیا؟“

لڑکی نے جم کروارڈن سلمیٰ کے ایک تقریباً تھپڑ لگا دیا۔ وارڈن سلمیٰ لالچ اور بد نفسی کے لیے مشہور تھی۔ سو ہم سب کو بہت مزہ آیا تھا۔ دوسرے دن صبح سے نیچے آنگن میں وہ غیر ملکی عجیب شخصیت دکھا دی۔ اوسط میں پنجابی لڑکیوں سے لمبی، چھریرے بدن پر کالی پتلون اور سفید اسپورٹ بنیان، بال سنہرے اور گلے میں رنگ برنگے اور پتھروں کی مالا پہنے ہوئے تھی۔ ماتھے پر بندیا اور اس کے ساتھ پیروں میں چھم چھم کرتی پائل تھی۔ آنگن میں ایک طرف ہماری سیل کے پاس ایک چھوٹا سائیم کا پیڑ تھا۔ نہانے سے قبل اس کے نیچے آنکھ بند کیے ہوئے بیٹھی اس عورت کے پاس جا کر میں کھڑی ہو گئی۔

”تمہارا ملک کون سا ہے؟“

”فی الحال پاکستان، ویسے فرانسسی ہوں۔“

اس کے چہرے پر مایوس کن اسپریشن دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی وہ انگریزی اتنا کم جانتی تھی کہ کام چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ فرانس کی قومی جغرافیائی مجلس سے وہ جڑی ہوئی تھی۔ ویزا ختم ہو جانے کے بعد پولیس میں رپورٹ نہ کر کے اسٹیشن پر ادھر ادھر گھوم رہی تھی کہ پولیس پکڑ کر لے آئی تھی۔ چار پانچ دنوں کے اندر ہی سفارتخانے کا کوئی ملازم ملنے آیا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے ضروریات زندگی کی بہت سی چیزیں منگوا کر اپنے ہاتھ سے قیدیوں میں تقسیم کی تھی۔ وہ علینہ کے بارے میں جاننے کے بعد وہاں رہتے ہوئے زیادہ وقت علینہ کے ساتھ ہی گزراتی تھی۔ اسے نہلا دیتی تھی اس کی بندھی سی کھولی دیتی اور اپنے ساتھ ساتھ رکھتی تھی۔ تعزیرات پاکستان میں جرم کی بنیاد پر یورپین قیدیوں کے لے جو سہولتیں دی گئی تھیں۔ وہ انھیں ٹھکرا کر میڈم رسوا عام قیدیوں کو دیا جانے والا کھانا کھاتی تھی۔ ایک دن کھانا کھانے کے بعد سیل کے دروازے کی سیڑھی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس عورت نے ایک نیا کام کیا تھا۔ اس وقت کے سپرینڈنٹ سمج اللہ بڑے چالاک مکار خود کو ادیب سمجھنے والے تھے۔ انھوں نے ایک دو فلموں کے اسکپٹ لکھے تھے۔ وارڈ کے راؤنڈ پر ان کے آنے سے فیروزہ نے کمر جھکا کر رو دیا تھا۔ اور تقریباً پہلے رقص کی صورت میں راستہ دکھاتی ہوئی عورتوں کے جزل وارڈ کے بڑے کمرے طرف گئی تو علینہ نے انھیں لے جا کر اسی دوزخ صفت پاخانے کے پاس کھڑا کر دیا جو چالیس سے بھی زیادہ لڑکیوں کے ذریعے بارہ گھنٹے سے بھی زیادہ وقت تک استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ دیکھ کر سپرینڈنٹ کا چمکتا ہوا چہرہ دھیرے دھیرے بدلتا ہوا زرد ہو گیا تھا۔

فائدہ کی بیماری پھر بڑھ گئی تھی۔ وہ رہ رہ کر لکڑی کے کندے کی طرح کھل اوڑھ کر پڑی رہتی تھی۔ ریوٹیزم کے سبب ہلنا ڈلنا بند تھا۔ چہرہ

بالکل لال ہو گیا تھا اور بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا تھا۔ ڈاکٹر چڑی کی مہربانی سے ہم سب سے بیزن انجکشن کا نام جان لیا تھا۔ اسے دینے کے بعد پھر کسی طرح کی دوا دارو کا جھمیلنا نہیں رہتا تھا۔ نشہ ایک ہنگی تھی۔ وہاں کی زندگی اسے یہ بھلانے لگی تھی اس کا دل اکثر اداس ہو جاتا تھا۔ اس لیے وہ بہت شرماتی تھی۔ ایک دن دوپہر میں فالغہ اور مطربہ کا کورٹ میں حاضر ہونے کا دن تھا۔ مریم وغیرہ کا بھی ٹریوئل کا دن تھا۔ انیلہ کو نیچے وارڈ میں بھیج دیا گیا تھا۔ وہ وہاں سے ضمانت لے کر گھر چلی گئی تھی۔ دوسری منزل کے برآمدے میں صرف میں اور نشہ تھیں۔ ایک دن اس نے بیٹھے بیٹھے اچانک میری گود میں سر رکھ دیا۔ اور اس کا معصوم چہرہ اداس ہو گیا تھا۔

”ماریا آئی تم میری ماں بن جاؤ۔“

”ہاں!“ اس کے سر پر میں ہاتھ پھیرا ہی تھا کہ خود اپنے سے ہی وہ شرمائی۔ وہ اچھل کر بیٹھ گئی تھی۔

”بیٹھی رہو چائے لے کر آتی ہوں۔“ پھر وہ بڑا کر نیچے بھاگ گئی تھی۔

جب کبھی موسلا دار بارش ہوتی تھی تو اپنے پچھڑے ہوؤں کی یاد آتی تھی۔ گاؤں میں کھلے آکاش کے نیچے کھیت۔ میدانی ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں پانی گرنے کی آواز۔ پیروں کے نیچے بہتے پانی کو چھو کر ایسا احساس ہوتا تھا۔ جیسے ساری شریانوں میں، نسوں میں ایک عجیب خوشی کی تھر تھری ہو۔ گاؤں میں برسات کے دنوں میں کھانے کو کچھ نہیں رہتا۔ گندم کے کھیتوں کے پانی سے بچے چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑتے تھے۔ اور کیلے کے بتوں میں لپیٹ کر انھیں آگ میں بھونا جاتا تھا۔ یہ وہ وقت بھی جب دنیا میں ہماری عزت تھی۔ ہمارا احترام تھا۔ آج کوئی شک نہیں کہ اندرون بیرون ملک میں کرپشن اور جھوٹ ہماری پہچان ہے۔ اور اسی لیے یہ شرمناک اعتراف زبان زد عام ہے۔ کہ ہم دو نمبر کاموں میں ایک نمبر لوگ ہیں۔ ہم نے ایسی واردات ایجاد کی ہے کہ گناہ بھی تو بہ کرنے لگے اور خود جرم کو بھی پسینہ آ جائے۔ مثلاً جنگل تو ہم نے بیچے ہی تھے۔ کہ گلیشیر توڑ کر ان کی برف بیچنے کا اچھوتا آئیڈیا بھی ہمارے پاک آنگن میں ہی اتر۔ دودھ میں پانی یا پانی میں دودھ کی ملاوٹ تو ہماری شناخت تھی ہی کہ ہم نے ایک عظیم الشان ٹیکنالوجی متعارف کروادی۔ کہ تکبیر پڑھ کر جانور کو ذبح کر کے پریشر کے ساتھ اس کی شہ رگ میں پانی انجیکٹ کر کے اس کا وزن بڑھا دوتا کہ حلال آمدنی میں چند کلو میٹر حلال شامل ہو جائے۔ کرپشن ہماری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ اور غالباً یہ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہوئی تھی۔ پاکستان معرض وجود میں آتے ہی جائیدادوں کے جعلی کلیم اور جعلی ذاتیں بھی ساتھ ہی معرض وجود میں آ گئی تھیں۔ دنیا کی تاریخ میں ہم ہی شاید وہ پہلا اور آخری معاشرہ ہیں جہاں کے لوگوں نے تھوک کے حساب سے اپنی ذاتیں، شناختیں، دلدیتیں تبدیل کیں۔ اسلام میں اونچے نیچے کا وجود نہیں۔ ہم نے ہندوؤں کی صحبت میں اپنی قسم کے دلت، ملیچھ، شودر، کمی کین پیدا کئے۔ انھیں ذلیل و رسوا کیا۔ لیکن پھر پاکستان بننے ہی اٹھل پھٹل کا فوری فائدہ اٹھاتے ہوئے موچی سے سوچا ایسی تہی راجپوت کی۔ آج کے بعد میں بھی راجپوت ہوں۔ پشتی نائی نے ملک صاحب بننے کا فیصلہ کیا۔ خاندانی دھوبی شیخ، میاں یا چوہدری بن گئے۔ اور کچھ نے بجا طور پر سوچا کہ شناخت بدلتی ہی ہے تو سادات پر ہاتھ صاف کرو، سوچھوٹے اقلیموں اور جھوٹی ذاتوں سے شروع ہونے والا باشعور ہجوم چلتے چلتے جعلی ڈگریوں تک آپہنچا۔ اب اس ٹرکس حمام میں ہم سب نے خلعت فاخرہ پہن رکھی ہے۔ میں نے ٹرکشن کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ ہمارا فاتح محمود غزنوی بھی ترک تھا اور مغل بھی ترک تھے۔

ایک دن دو پہر کو پاکستان کی تاریخ اور معاشرت کے علاوہ اہلیانِ ایران برگ کی کتاب جھڑ (یعنی طوفان) پڑھ رہی تھی۔ سوچا نہیں جاسکتا تھا کہ اتنے بڑے کینوس پر کوئی اتنے شاندار طریقے سے کام کر سکتا ہے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کے وقت فرانس روس جرمنی تین ملکوں کے پس منظر پر لکھی گئی ہے۔ ایک روسی گاؤں بچی ہوئی عورتوں اور بچوں سمیت دل فوج کی ایک جنگجو عورت، اس کی بچی اور اس کی داوی کو فاشٹ لوگوں نے مار ڈالا۔ بچی کی چھوٹی سی لال جوتی، اس ویران گاؤں میں پڑی ہوئی تھی۔ میں کسی بھی حالت میں زور زور سے پڑھ کر سنانے کا کمپوز بنائے نہیں رکھ پا رہی تھی۔ ان کتابوں کے علاوہ بڑی مشکل سے ”وار کرائس ان ویت نام“ کو اندر لایا گیا تھا۔ رات کی تنہائی میں چھپ چھپ کے اسے ختم کیا تھا۔ انہی دنوں چلی کے معزول صدر کی بیوہ مادام آمندے اور ان کی بیٹی لاہور آئی ہوئی تھیں۔ گورنر ہاؤس میں ان کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں ایک اعلیٰ شخصیت نے کہا تھا کہ سیاست کا مقابلہ سیاست سے ہی کرنا چاہیے۔ سیاسی مخالفین کا قتل یا بغیر کسی الزام کے قید میں رکھنا جمہوریت کا راستہ نہیں ہے۔ سیل کے برآمدے میں بیٹھے ہم لوگ اخبار میں چھپی اس تقریب کی رپورٹ پڑھ رہے تھے۔ مجھے بے گناہ قید میں تین سال ہو گئے تھے۔ مریم بھی ان دنوں ٹریبونل کے سامنے پیش ہو رہی تھی۔

اخبار پڑھتی تھی تو اپنی حالت زار دیکھ کر دل دکھتا تھا۔ کہ ہمارے حریف تو گاڈ پارٹیکل سے لے کر مریخ تک جا پہنچے۔ اور ہم اس کرہ ارض پر وحشت الارض کی طرح ریگ رہے ہیں۔ کہاں وہ لوگ جو اکیس ہزار جی گھنٹہ رفتار سے آٹھ ماہ کی مدت میں پانچ سو ستر (570) ملین کلومیٹر دور مریخ پر جا پہنچے۔ اور کہاں ہم مسخ شدہ مریض لوگ جو بیسٹھ سال بعد بھی بنیادی ترین سوالوں کے جواب ڈھونڈنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ ابھی ہوئی ڈور کو مزید الجھائے جا رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ شرح خواندگی شرمناک اور جو نام نہاد خواندہ ہیں وہ بھی ہمالیائیوں پر بیٹھے نان الیشوز پر اپنا اور قوم کا وقت برباد کر رہے ہیں اور جو با وقت انھیں برباد کر رہا ہے۔ اول تو یہاں علم نام کی شے کوئی نہیں ہے۔ تو ملاوٹ زدہ کے بظاہر پڑھے لکھے بھی ایسی کھوکھلی اور سطحی باتیں کرتے ہیں کہ سکتہ ساطاری ہو جاتا ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی قسم کے لوگ بھی ایسی پاکیزہ ذہنی پسماندگی کا شکار ہیں۔ ہر آدمی حیرت و حسرت میں ڈوب جاتا ہے۔

میں شاید اس ملک کی واحد بے وقوف ہوں۔ جو مغرب کی ہر نئی سائنسی کامیابی اور علمی فتح پر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ غم کی گہرائیوں میں بھی گم ہو جاتی ہوں۔ خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ انسان نے فتح حاصل کی اور غم اس بات کا کہ مسلمان کہاں ہے؟ قرآن پاک میں سات سو سے زائد مقامات پر کائنات پہ نظر و نڈر کے ساتھ تسخیر کائنات و تحصیل کائنات کا پیغام بھی ہے۔ جس پر عمل کوئی اور کر رہا ہے۔ جبکہ یہاں صدیوں سے یہ بحث ہو رہی ہے کہ سائنس اور اسلام تضاد تو نہیں۔ کوئی کیسے سمجھائے کہ سائنس علم اور ٹیکنالوجی ہنر ہے اور اسی گمشدہ میراث کے سبب ہم تعداد میں بڑھنے کے باوجود مٹتے جا رہے ہیں۔ اقبال یونہی تو نہیں روتا تھا۔

اٹھا	میں مدرسہ	و	خانقاہ	سے	غم	ناک
نہ	زندگی	نہ	محبت	نہ	معرفت	نگاہ
گلا	تو	گھونٹ	دیا	اہل	مدرسہ	ترا
کہاں	سے	آئے	صدا	لا	الہ	اللہ

اور جو احمق امریکی زوال کے منتظر ہیں انھیں علم ہونا چاہیے کہ اس اقتصادی برتری میں بھی وہ ایک طرف تو گداگروں کو اربوں ڈالر کی بھیک دے رہے ہیں تو دوسری طرف مرنے کے اس ایک مشن پر ڈھائی ارب ڈالر خرچ کر چکے ہیں۔ اور یہ سارا سزا و عذاب اسی لیے ہے کہ ہم نے عظیم ترین انقلاب کی کتاب کو صرف ثواب تک محدود کر دیا۔

چار دن ہوئے تھے کہ رقیعہ نام کی ایک لڑکی وہاں آئی تھی۔ اس شہر کی سیاسی فضا کے بارے میں معلومات ملی تھیں۔ وہ ایک دفتر میں اسٹینو تھی۔ کچھ قابل اعتراض حرکات کرنے پر اس نے کسی افسر کو طمانچہ رسید کر دیا تھا۔ فیصلے میں اُسے ایک ماہ کی سزا سنائی گئی تھی۔ رقیعہ افسوس کر رہی تھی کہ جب جیل ہی آنا تھا تو جاہل کی اچھی طرح مرمت کر کے کیوں نہیں آئی۔ انہی دنوں مطربہ کے کیس کی سماعت ہو گئی اسے دس سال کی سزا ہوئی تھی۔ عارفہ اور اس کی سگی ساتھیوں کو میٹرن نے نئے طریقے سے جوش انگیز کر رہی تھی۔ شام کو سبھی عارفہ کی سزا کی خبر سن کر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ اور سبھی ایک دوسرے کے غمگین نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دن میں نہانے کے لیے جا رہی تھی کہ دیکھا ہماری سیل میں چڑھنے کی سرڑھیوں کے کنارے حلیمہ بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا بدن بخار سے تپ رہا تھا۔ حلیمہ کو کل سے بخار تھا۔ ایک بچہ سجاد ایک تھالی میں پانی لے کر دھیرے دھیرے آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر ہچک کر رو پڑا۔ حلیمہ نے رات کو الٹی کی تھی۔ کل دوپہر کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ملائکہ اور نیسی نے صبح کچھ دیر کے لیے ہسپتال کا چکر لگانے کی ہمت کی تھی۔ ان بچوں میں حلیمہ تھی سب سے بڑی تھی۔ سجاد تو اب ہے نہیں تھا۔ ایک دن اچانک اوپر والوں کا خیال آیا تھا کہ سجاد کی عمر 5 سال سے تجاوز کر گئی ہے تو انھوں نے سجاد کو یتیم خانہ بھیج دیا تھا۔ پھر وہ اپنی پاگل ماں کو کبھی نہیں دیکھ سکا ہوگا۔ جس کا دودھ پی کر وہ بڑا ہوا تھا۔ صرف سجاد کی ماں پاگل تھی۔ جب جرم ثابت ہو جائے تو ماں کے لیے سرکاری قانون میں ماں کی ممتائی منظور نہیں ہے۔ جیل مینوکل کے مطابق کسی قیدی عورت کا دو سال سے کم عمر کا بچہ رہنے پر اور عورت کے ذریعے یہ سمجھے جانے پر کہ اس بچے کی دیکھ رکھ کے لیے کوئی رشتہ دار تیار نہیں ہے۔ تو ایسی صورت میں بچے ماں کے ساتھ رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ لیکن 5 سال کی عمر ہو جانے پر کسی بھی حالت میں اُسے ماں کے ساتھ نہیں رہنے دیا جائے گا۔ حلیمہ کے لیے اگر ہم کسی سے کچھ کہتے تھے تو اس کا ہی نقصان تھا۔ اس لیے ویلیفٹر افسر سے کہلوا کر صرف دوائی کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ ان سات بچوں کے لیے صرف تین تھالیاں تھیں۔ ان میں بھی اگر ایک میں پانی بھر کر رکھا جاتا تو وہ کھانا کیسے کھا پاتے؟

کنواری نہ رہنے کی صورت میں دل بھات سبزی ایک ہی ساتھ لے لیتے تھے۔ کھانا لگا کر کیسے دیا جاتا ہے۔ اُن کو معلوم ہی نہ تھا۔ وہ کالے کھیلے ڈرم میں اور بغیر صفائی کے دال پکاتے تھے۔ کھانے کے وقت پانی پینے کے لیے گلاس نہیں دیا جاتا تھا۔ گلاس سے حوض کا پانی نکال کر پینا پڑتا تھا۔ ہر قیدی کے لیے ایک تھالی ایک گلاس نہیں تھا۔ کسی بھی قیدی کو جیل پہنچائے جانے پر دوسرے دن آفس سے کیس کروانے کے ساتھ ساتھ ایک تھالی ایک کنواری ایک گلاس اور دو کھل دیے جانے کا قاعدہ تھا۔ ہسپتال میں مریضوں کے نام پر منگوائی گئی سبزی، گوشت کو انتظامیہ خود ہی کھا جاتی تھی۔ کافی دنوں بعد اس چوری کے بارے میں ایک دو بار میں نے سپرینڈنٹ سے شکایت کی۔ لیکن وہ بے یقینی کا انداز دکھاتے ہوئے چلے گئے۔ ہمارے سامنے کھڑے ہو کر شرمیلانے ایسی حیرت جتنائی جیسے آسمان سے ٹپکی ہو۔ پھر ہم لوگوں نے طے کیا کہ انھیں رنگے ہاتھوں پکڑ کر اس کا ثبوت دیں گے۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ شام کو وارڈ میں گوشت آیا تھا۔ ہفتے میں ایک دن سو گرام میٹ ہر قیدی کو دیئے جانے کا قاعدہ تھا۔ مگر کبھی بھی کھانے کے

ساتھ میٹ نہیں دیا جاتا تھا۔ جب لڑکیاں برتن مانجھ کر ایسی تھالی میں رات کو پینے کا پانی لے کر دروازے میں چلی جاتی تھیں۔ تب دروازہ بند ہو جانے کے بعد ان کے اپنے طریقے سے گوشت آتا تھا اور ہسپتال میں چلا جاتا تھا۔ کافی دیر بعد ایک ٹرے میں رکھ کر باہر سے ہی دروازے کی کھڑکی سے اندر کے قیدیوں کو دیا جاتا تھا۔ کسی کے حصے میں ایک کلچر اچری، کسی کو ہڈی کا کلچر ملتا تھا۔ قیدیوں کے لیے ہفتے کا یہ دن بہت اہم ہوتا تھا۔ ذائقہ درہونے کے معنی میں یہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ جتنا کہ متواتر ایک طرح ادب پیدا کرنے والے کھانے کے الٹ پھیر کی شکل میں ہوتا ہے۔ وہاں کی ہواسٹریس ہوئے آبی مرکز کی طرح اتنی بھاری اور ساکن تھی کہ چھوٹی سے ترنگ بھی یہاں کے لوگوں کو زندہ رہنے کے لیے تھوڑی بہت مدد کرتی تھی۔ آس اور انتظار کے انسانی جذبے کو جگائے رکھتی تھی۔ کچھ دنوں سے ایسا ہو رہا تھا کہ دوپہر کو کھانا کھانے سے پہلے ہم برآمدے میں ہوتے تھے۔ تب بھی دروازے نیچے کے دروازے میں تالانہ لگا کر وہیں کھڑا رہتا تھا۔ میں اس سے بات کرتی رہتی تھی۔ یا پھر دوسری طرف چلی جاتی تھی۔ اس ہفتے کو دس گیارہ بجے جب پچھلی رات کو دیئے گئے گوشت میں سے بھی کھانے کے بعد بچا ہوا ایک تھالی گوشت گھی مسالا وغیرہ ڈال کر ڈالتے دار کھانے کے لئے بھٹی گھر میں لایا جا رہا تھا۔ ہم سب سیڑھی سے اتر کر نیچے اتر گئے اور دروازے کے دوڑ کر آنے سے پہلے عارفہ باورچی کے ہاتھ سے تھالی چھین کر مریم کے پاس اوپر لے آئی۔ دروازے بھاگ کر آیا تو ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ سپرینڈنٹ کے نہ آنے تک یہ تھالی ہم نہیں دیں گے۔ دو منٹ میں میٹرن، اس کے پیچھے عارفہ، شمن اور ان کے چچوں میں مار پیٹ شروع ہو گئی تھی۔ ہم لوگوں نے سیڑھی کے سامنے نیچے کھڑے ہو کر چلا چلا کر کہا کہ جو اوپر آئے اسے اڑا دیا جائے گا۔ اس دھمکی کا اثر یہ ہوا کہ تھوڑی گندی غلیظ گالیاں دیتے ہوئے اور بڑبڑاتے ہوئے وہ وہاں سے چلے گئے۔ اس کے فوراً بعد دروازے نے آکر ہم سب کو بند کر دیا۔

منگل کو سپرینڈنٹ کا فائل تھا۔ جو سپرینڈنٹ چوری کا یقین نہیں کرتے تھے کہ قیدیوں کے کھانے سے اچھی چیزیں نکال لی جاتی ہیں۔ ان کو دکھانے کے لیے پورا ثبوت موجود تھا۔ وہ یہ سب دیکھ کر بہت پریشان ہو گئے تھے۔ تین دن تک سزا ہوا گوشت کو ٹھری میں رکھا ہوا تھا۔ کوئی بھیانک وائرل انفیکشن ہو سکتا تھا۔ آپ لوگ اسے نکال کر باہر پھینک دیجیے۔ دروازے سے انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”اچھا آپ لوگ نیچے کیسے پہنچیں؟“

”آپ کا دروازہ بند نہیں رہتا تھا۔ ہم لوگ نہانے کے لیے نیچے گئے تھے ہم لوگوں نے آپ کو سب کچھ دکھا دیا کہ چوری ہوتی کیسے ہے؟“

ب اگلا قدم آپ کیسے اٹھائیں گے۔“

”آں ہاں میں دیکھتا ہوں۔“

وہ نیچے اتر گئے اور یہ واقعہ یہیں ختم ہو گیا تھا۔ لیکن دوسری طرف اس واقعہ کا تھوڑا سا اثر پڑا تھا۔ دو تین ہفتوں تک لڑکیوں کو کھانا دیتے وقت میٹرن نے اس کا بٹوارہ کر دیا تھا۔ تھوڑا سا حصہ بڑھا بھی دیا تھا۔ لیکن میٹرن اس دن کی ذلت اور ڈر کو بھول نہیں پائی تھی۔

خدا جانے یہ لوگ دولت کے پیچھے دیوانے کیوں ہیں۔ اربوں روپیہ لوٹ کر بھی ان کے پیٹ کیوں نہیں بھرتے۔ حالانکہ پوری تاریخ گواہ ہے کہ دولت اور طاقت کسی خاندان میں لمبے عرصے تک قیام نہیں کرتی۔ یہاں حضرت علیؑ یاد آتے ہیں آپ کے ہاتھ میں ایک درہم بھی ہوتا تو

فرمایا کرتے تھے۔ ”افسوس کہ تو میرے پاس سے جائے بغیر تو مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔“ حیرت ہے نہ انہیں قرآن کے احکامات یاد ہیں نہ اسلاف کی روایات اور نہ تاریخ کا کوئی سبق کہ تیسری چوتھی پانچویں نسل نے کھوتی کی طرح پھر بوڑھ کے نیچے ہی ہوتا ہے۔ اور اوپر سے ان کی کمیٹنگیاں، حالانکہ حکم یہ ہے۔ تیشہ نہ بنو کہ سب کچھ اپنے آگے ہی ڈالتے جاؤ۔ زندہ بھی نہ بنو جو سب کچھ باہر نکالتا جاتا ہے بلکہ کوشش کر کے آ رہ بن جانے کی صورت میں کرو، کہ آ رہ کچھ اپنے آگے ڈالتا ہے اور کچھ باہر کی طرف نکالتا ہے۔ یہ بد بخت باہر کچھ نہیں نکالتے۔ باہر لے جاتے ہیں۔ یہ کرپشن کے بادشاہ، معدنیات کے چلتے پھرتے پہاڑ ہیں۔ کاش کوئی ان کی کھدائی کرے اور گہرائی تک جائے۔ تو پھر کہیں کیسی قیمتی دھاتوں کے ذخائر نکلتے ہیں۔ لیکن چور چوروں اور ڈاکو۔ ڈاکوؤں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔

اس کے پندرہ دن بعد آئی جی جیل خانہ جات جیل کے دورہ پر آئے۔ ہماری بند سیل کے آگے آ کر پوچھا۔ کہ کوئی دشواری تو نہیں ہے؟ ہم سب کچھ بول پاتیں اس سے پہلے ہی بیچ میں ٹپک کر میٹرن کہنے لگی۔

”سریہ سب کافی تشدد پسند لڑکیاں ہیں۔ سپرینڈنٹ نے نہانے کے لیے انہیں نیچے جانے کی اجازت دی تھی۔ لیکن ان سب نے دوسری لڑکیوں سے مار پیٹ شروع کر دی۔ میں روکنے لگی تو مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس لیے اب انہیں دن بھر بند رکھا جاتا ہے سر!“

”حملہ آور کون ہوئی تھی؟“

”یہ سر۔۔۔“

”کس ہتھیار سے؟“

”ایک ڈنڈے سے!“ شاید یہ پہلے سوچ نہیں رکھا تھا۔ ہم یا خیر کہتی تو خود پھنس جاتی سو میٹرن تھوڑا سہم گئی۔ پہلی جو چیز اس کی نظر میں پڑی اُسے ہی ہم نے دکھا دیا تھا۔ برآمدے میں بارش نہ آئے اس کے لیے کنیوس کا پردہ لگا دیا گیا تھا۔ ہم لوگوں نے کبھی اُسے کھلتے نہیں دیکھا تھا۔ تقریباً چھ فٹ لمبے موٹے ڈنڈے میں لپیٹ کر پردے کو اوپر باندھ دیا گیا تھا۔ ایسی ڈنڈے کو میٹرن نے دکھا دیا تھا۔ آئی جی صاحب نے میٹرن کو غصے سے دیکھا اور واپس چلے گئے۔

انہی دنوں خون کی ایک پیاسی عورت مینا جیل کی سلاخوں کے پیچھے آئی تھی مینا نے اپنے دوست منیب سے مل کر علیم کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ علیم کام کاج کی تلاش میں برسوں پہلے گلاب پور آیا تھا۔ جھٹ پٹ کام کرنے کے بعد اس نے گوگیرہ پر چھو لے بنورے کی ریزھی لگائی تھی۔ چونکہ گوگیرہ ایک مشہور ٹورسٹ پلیس ہے اس وجہ سے علیم کے چھو لے بھنوروں کی اچھی فروخت ہو جاتی تھی۔ کام چل نکلا تو وہ پیر محل سے اپنی بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے آیا۔ یہ تقریباً تین سال پہلے کی بات ہے۔ اُس نے رحمت کالونی میں مکان نمبر 304 کرائے پر لے لیا تھا۔ اس کے کنبے میں بیوی مینا کے علاوہ ایک لڑکا ببلو اور دو لڑکیاں انسہ اور عروج تھیں۔ گلاب پور آنے کے بعد اس کے کنبے میں ایک لڑکی حسنا اور بیٹے یاسر کا بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ بچوں کو خوب پڑھا لکھا کر کسی قابل بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے پیسہ کمانے کے لیے وہ جی توڑ محنت کیا کرتا تھا۔ جس کے سبب رات میں وہ گھر لوٹے لوٹے اُسے روزانہ گیارہ بج جایا کرتے تھے۔ دیر تک وہ گھر آتا، کھانا کھاتا سو جاتا، بیوی کی خواہشات کی اُسے فکر نہیں تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ

پانچ بچے جننے کے بعد بیوی کا سیکس سے اب دل بھر گیا ہوگا۔ لیکن دوسری طرف مینا شروع سے ہی موج و مستی کی زندگی میں یقین رکھتی تھی۔ وہ شہوت پرست عورت تھی۔ میاں بیوی کا تعلق اُسے جسمانی سکھ سے ہٹ کر اور کچھ نہیں لگا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زندگی سے اگر سیکس کو نکال دیا جائے تو باقی کچھ رہ ہی نہیں جاتا۔ مینا آسمان کو جہاں تک دیکھ سکتی تھی اس کا ہوتا تھا۔ وہ آنکھ میں جتنے ستارے سما سکتی تھی اس کے تھے یہی اُس کی ابدی اور مستقل خوشی تھی۔ کہ کائنات اس کے وجود کے مطابق اس کی ملکیت ہے۔ جس میں کوئی مقدر ہے نہ دعویدار۔ اس کے پیروں میں ایسا گھمنڈ تھا جس کا زوال نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے نیچے کی زمین اس سے کوئی چھین نہیں سکتا تھا۔ پانچ بچوں کا بات بن جانے کے بعد ادھر علیم نے طے کر لیا کہ آگے کچھ بھی ہو جائے وہ اب اور بچی نہیں ہونے دے گا۔ آخر تمام باتوں پر غور کر کے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ مینا کے ساتھ سونے سے ہی بچا کرے گا۔ ویسے بھی اس میں اب سیکس میں زیادہ دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ زیادہ تر وقت یہی سوچا کرتا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو کیسے بہتر زندگی دے۔ اس کا یہی ایک طریقہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ کمائے اور زیادہ کمائی زیادہ محنت سے ہی ہو سکتی تھی۔ محنت وہ کر ہی رہا تھا۔ دن بھر ٹھیلے پر کھڑے رہ کر کام کرتے کرتے رات ڈھلنے تک وہ بری طرح تھک جاتا تھا۔ اور تھکان دور کرنے کے لیے اب وہ شراب کا سہارا بھی لینے لگا تھا۔ شراب پینے کے بعد وہ جھیل پر ہی کھانا کھا لیا کرتا۔ اور آدھی رات کے قریب گھر پہنچتا۔ تھکا ہونے کا بہانہ کرنا اور سو جاتا۔ مینا سب دیکھ سمجھ رہی تھی۔ اس کی راتیں کروٹیں بدلتے گزرا کرتیں۔ آخر اس نے اس کا بھی حل سوچ لیا۔ حمل نہ ٹھہرے اس لیے اس نے کا پڑتی لگوالی۔ اب علیم کے لیے سیکس سے بچنے کا بہانہ نہیں بچا تھا۔ مگر وہ روز تعلق بناتا کیسے؟ اس میں پہلے والا دم ختم نہیں رہ گیا تھا۔ روزانہ اختلاط کرنے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہفتے میں با مشکل دو دفعہ ہی وہ تعلق قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتا تھا۔ ایسے میں مینا پریشان ہو کر رہ جاتی۔ راتیں اس کی کروٹیں بدلتے گزرتیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے مینا کا مزاج دن بدن چڑچڑا ہونے لگا۔ علیم سے وہ اکثر جھگڑا کرنے لگتی۔ ذرا ذرا سی بات پر اپنے بچوں کی بھی پٹائی کر دیا کرتی۔ مینا کے اندر جنسی خواہش کچھ زیادہ ہی بھری ہوئی تھی۔ اس کے لیے سیکس ہی سب کچھ تھا۔ تعصب اتنا نقصان دہ نہیں جتنے تعصبات۔ مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب ہم دیگر چیزیں فراموش کر کے کسی ایک جزوی شناخت پر ڈٹ جاتے ہیں۔ اور دنیا جہان کے معاملات کو ایسی تناظر میں دیکھنے لگتے ہیں۔

گوگیرہ یہاں علیم کی چھو لے ہوئے کی دکان تھی۔ وہیں پاس ہی میں لیموں پانی کا ایک اسٹال بھی تھا۔ جسے منیب نامی نوجوان چلایا کرتا تھا۔ وہ اکثر علیم کے ٹھیلے پر چھو لے ہوئے کھایا کرتا تھا اور علیم اس کے یہاں سے لیموں کا پانی پیا کرتا تھا۔ منیب ایک خوبصورت نوجوان تھا اور غیر شادی شدہ تھا۔ رحمت کالونی کے مکان نمبر 216 کی دوسری منزل کرائے پر لے کر اس میں وہ اکیلا رہتا تھا۔ ایک دوسرے کی دکان پر اکثر آتے جاتے رہنے کی وجہ سے علیم اور منیب میں اچھا تعارف ہو گیا تھا۔ پھر جب یہ بات سامنے آئی کہ دونوں رہنے بھی ایک ہی کالونی میں ہیں تو رات میں اکثر دوکانداری ختم ہونے کے بعد دونوں ایک ساتھ گھر کے لیے نکلنے لگے۔ کبھی کبھی دونوں ساتھ دارو بھی پی لیا کرتے تھے۔ ایک رات ضد کر کے علیم اپنے بچوں سے ملوانے کی بات کہہ کر منیب کو اپنے گھر لے گیا۔ دونوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ مینا نے دونوں کے لیے کھانا بنایا۔ کھانے سے پہلے علیم اور منیب نے شراب بھی پی۔ اس دوران منیب کی جتنی بار مینا سے نظریں ملیں اس کی آنکھوں میں تشنگی کا گہرا سایہ نظر آیا۔ نظریں ملنے پر ہر بار مینا کی آنکھوں میں جنسی خواہش کی چمک ظاہر ہوتی اور ہونٹ مسکرا کر اپنی پیاس کا اظہار کر دیتے۔ مینا نے جس طرح منیب کی خاطر و مدارت کی اس سے

منیب سمجھ گیا کہ مینا ایک پیاسی عورت ہے۔ کھانا کھانے کے بعد جب منیب نے جانے کی اجازت چاہی تو علیم نے نشے میں لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔
 ”ارے یار اب کہاں رات میں جاؤ گے یہیں سو جاؤ۔ صبح چلے جانا۔“

”ہاں دیور جی۔! یہیں سو جاؤ۔ وہاں اکیلے پڑے رہو گے۔ یہاں دوست کے گھر تو جی لگا رہے گا۔“

مینا نے شوہر کی بات کی تائید کی اور ہولے سے نچلا ہونٹ کاٹ کر اپنی آنکھوں میں پھر ہوس کے دیئے جگہ گادیئے۔ منیب کے لیے یہ صاف اشارہ تھا کہ رات کو اسے مینا کا جسم حاصل ہو سکتا ہے اور علیم کو کافی نشہ چڑھ چکا تھا۔ اس لیے اس نے مینا سے کہا۔

”منیب کا بستر لگا دے۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ میں جا رہا ہوں سونے۔“

گرمی کے دن تھے۔ کمرے میں ایک کنارے دری اور گدا ڈال کر منیب کا بستر لگا دیا گیا۔ علیم اب دیوان پر لڑھک کر خراٹے بھرنے لگا تھا۔ مینا نے مسکرا کر منیب کو دیکھا اور بتی بجھا کر بچوں سلائے کمرے میں چلی گئی۔ منیب کو کافی دیر تک نیند نہیں آئی اُسے امید تھی کہ مینا ضرور اس کے پاس آئے گی۔ ایک گھنٹہ بعد مینا کی پرچھائی دوسرے کمرے سے باہر نکلی۔ پہلے وہ پرچھائی ٹائلٹ میں گھسی پھر منیب کے بستر پر آ گئی۔ اس نے صرف گاؤں پہن رکھا تھا۔ آتے ہی مینا اس سے لپٹ گئی۔ منیب کے لیے یہ انوکھا اور عجیب و غریب تجربہ تھا۔ دونوں کی خواہش پوری ہوئی تو مینا نے اس کے کان میں پھسپھسا کر کہا۔

”صبح آٹھ بجے بچے سکول چلے جاتے ہیں اور نو ساڑھے نو بجے علیم اپنا سامان اٹھا کر جھیل کے لیے نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد تین گھنٹوں تک گھر میں اکیلی رہتی ہوں۔ دل کرے تو اس دوران آجایا کرو۔“

منیب دوسرے دن اکیلی مینا کے پاس پہنچ گیا۔ مینا اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔ ایک گھنٹے تک دونوں نے موج مستی میں گزارا۔ اور پھر منیب واپس اپنی دوکان پر پہنچ گیا۔ اس دن کے بعد یہ سلسلہ ہی قائم ہو گیا کہ ہر دوسرے تیسرے دن منیب دوکان علیم کے سہارے چھوڑ کر ایک دو گھنٹے کے لیے چلا جاتا۔ اس سے علیم کو تھوڑا شک ہونے لگا۔ مینا اور منیب کو بھی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ لہذا منیب کمرے میں جا کر عیاشی کرنے لگے۔ ادھر علیم کا شک مزید گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کیونکہ اب منیب اس سے کچھ کہنے کے بجائے دوکان بند کر کے چپ چاپ نکل جایا کرتا تھا۔ ایک دن وہ لگا تو علیم اس کے پیچھے ہو لیا۔ علیم اپنے گھر پہنچا تو وہاں دروازے پر تالا لٹک رہا تھا۔ وہ وہاں سے سیدھا منیب کے گھر کی طرف بڑھا۔ منیب کے گھر کا دروازہ تو بند تھا مگر کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ دروازہ کھول کر علیم اندر چلا گیا۔ وہاں جو منظر دیکھا۔ علیم کو اس کی امید تھی مینا اور منیب اس قدر مستی میں گم تھے کہ انہیں علیم کے وہاں آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ علیم نے دونوں کو رگلے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ مگر اس نے منیب سے کچھ نہیں کہا۔ مینا کی پٹائی کر دی۔ اس کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔ منیب سے علیم کا کچھ نہ کہنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ وقت وقت پر ادھار کے طور پر اس نے کافی پیسہ لے رکھا تھا۔ جو لوٹانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ علیم نے گھر پر بھی مینا کی خوب پٹائی کی۔ وہ چپ چاپ پٹتی رہی اور مار مار کر تھک کر علیم ایک طرف بیٹھ گیا۔ تو مینا اس کے پاس آ کر کہنے لگی۔
 ”دیکھ مجھے غلط مت سمجھو۔ میں جو کر رہی تھی تمہارے فائدے کے لیے ہی کر رہی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے منیب سے پچیس ہزار روپے ادھار لے رکھے ہیں۔ وہ اپنا یہ پیسہ مانگنے کے فراق میں تھا۔ مگر اس سے پہلے ہی میں نے اسے شیشے میں اتار لیا۔ کہو تو میں اس سے تمہیں اتنا ہی پیسہ

اور دلوں اسکتی ہوں۔ میری مان کر چلو تو ہم اس کی دوکان بھی ہتھیا سکتے ہیں۔“ مینا نے تریا چر تر کا جال بچھایا۔ لیکن بہت کچھ پانے کے لئے تھوڑا بہت کھونا بھی پڑتا ہے۔ ایک بار اس بے وقوف منیب کا سارا پیسہ سارا کام دھندہ ہتھیا لوں تو میں اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکوں گی۔ مینا کی ان باتوں سے علیم کی عقل گھوم گئی۔ لالچ میں اس نے مینا کو اجازت دے دی۔ کہ وہ جیسا مناسب سمجھے کر لے۔ اسے تو بس اس سے مطلب ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے منیب کو حلال کر کے اپنا گھر بھر لے۔

شوہر سے آزادی ملی تو مینا کو کسی بات کا خوف نہیں رہا۔ تقریباً ہفتے بھر بعد اس نے منیب کے ساتھ جی بھر کے موج مستی کی۔ منیب صرف انیس سال کا تھا۔ اور مینا سے گیارہ سال چھوٹا تھا۔ وہ مینا کو جس طرح کی جنسی آسودگی دے رہا تھا۔ اسے وہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ سچائی یہ تھی کہ مینا کا اب علیم سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ آئندہ کی زندگی منیب کے ساتھ گزارنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ ادھر اس نے شوہر کو بے وقوف بنا رکھا تھا۔ ادھر وہ منیب کو اپنا غلام بنا چکی تھی۔ اس لیے اس نے منیب کو اکسانا شروع کر دیا کہ علیم کے ہوتے ہوئے وہ کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ آخر دونوں نے منصوبہ بنا لیا کہ علیم کو قتل کر کے اس کی لاش کو خرد برد کرنے کے بعد دونوں کسی دوسرے شہر میں جا کر بس جائیں گے اپنے بچوں سے مینا کو نہ کوئی لگاؤ تھا نہ ان کی پروا۔

”بسنٹ کی ایک رات میں علیم کو منیب سے پیسہ دلانے کا لالچ دے کر اس کے گھر لے گئی۔ وہاں میں نے اور منیب نے پہلے علیم کی جم کر پٹائی کی۔ پھر چاقو سے گلا کاٹ کر علیم کو قتل کر دیا۔ وہ چیختا چلاتا رہا مگر بسنٹ کی وجہ سے باہر پٹا خوں کا اس قدر شور تھا کہ اس کی آواز کسی کے کانوں تک نہ پہنچی۔ ہم نے علیم کی لاش کو کھیل میں لپیٹتے ہوئے پورے میں بند کر کے اسٹور میں رکھ دی۔ بسنٹ کی رونق کی وجہ سے فی الحال لاش کو کہیں لے جانا ممکن نہیں تھا۔“ مینا نے پولیس کو بتایا۔

پولیس کو اس قتل کا راز ایک منجر سے لگا تھا۔ انسپکٹر روشن علی نے منجر سے پوچھا۔

”اس وقت وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”اس وقت دونوں اپنا کچھ سامان بیچ کر پیسہ جمع کرنے کی فراق میں ہیں۔ سیکٹر 26 کی مارکیٹ میں گھوم رہے۔ جیسے ہی اس کے پاس ضرورت کے مطابق پیسہ جمع ہو جائے گا۔ دونوں گلاب پور چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں جا کر آباد ہو جائیں گے۔“ منجر نے بتایا۔

پانچ منٹ کے اندر مینا اور منیب کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ موقع پر ہی ان سے پوچھنا شروع کی گئی تو دونوں نے اقبال جرم کرتے ہوئے لاش کی نشاندہی بھی کر دی۔ پولیس نے لاش بھی اپنے قبضے میں لے لی اور دونوں کو باقاعدہ گرفتار کر لیا۔ اور دونوں کی نشاندہی پر قتل میں استعمال چاقو بھی پولیس نے برآمد کر لیا۔ اگلے روز علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر کے عدالتی حراست میں جیل بھیج دیا گیا تھا۔ پیاسی عورت مینا اب یار کے ساتھ جیل میں تھی۔ اور اس کے بچوں کو پولیس نے گلاب پور کے ایک یتیم خانہ میں داخل کروا دیا تھا۔

میرے علاج کے لیے مینا کا سینئر ڈاکٹر سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں سے برابر الٹی کرنے کے بعد شام کو شاید میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ بار بار خبر بھیجنے کے بعد ڈاکٹر چڑی شام کو آئے۔ مریم اور مینا غصے سے آگ بگولہ ہو گئی تھیں۔ بھلے مانس ڈاکٹر نے عاجز ہو کر کندھے اچکا لیے تھے۔

”آپ لوگ پڑھی لکھی سندر لڑکیاں ہیں۔ آپ ہمیشہ اتنے غصے میں کیوں رہتی ہیں؟ تھوڑا سا بیٹھا نہیں بول سکتیں۔ میں تو تھوڑے لائٹ موڈ میں کچھ وقت ہاتھ میں لے کر آیا تھا۔“

”میں سمجھ رہی ہوں لائٹ موڈ! آپ کی ایک دیک سے پتہ چل رہا ہے۔“ مریم کا مزاج یوں بھی فاسفورس کی طرح تھا۔ کچھ کو پانے سے پہلے جو ہوتا تھا وہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر اپنا لائٹ موڈ لیے تیزی سے میز حیاں اتر نیچے چلے گئے تھے۔ جاتے جاتے کہہ گئے

”میں کچھ نہیں کر سکتا۔ جیسے پڑی ہیں ویسے ہی رہیے مرنے پر اطلاع کر دیجئے گا۔“

ہم جیسے لوگ جو مخلص ہیں۔ وہ معاملہ فہم نہیں اور جو معاملہ فہم ہیں عصر حاضر کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں۔ وہ عوام کے ساتھ مخلص ہیں۔ وہ لوگ جو مخلص ہیں، ان کی حالت اس معصوم کی سی ہے جو گھاس کاٹنے والی مشین کے ساتھ شیو کرنا چاہیے، اور درخت پودوں کی ٹرمنگ کرنے والی کنگ سائز فینچی کے ساتھ مونچھوں کی ٹرمنگ پر مصر ہو۔ جس معاشرے میں شیر خوار بچوں کے لیے خالص دودھ کا حصول جوئے شیر لانے سے کم نہ ہو۔ جہاں لاکھ سیونگ دوائیں بھی جعلی ہوں۔ جہاں تکبیر پڑھ کے حلال کیے گئے جانور میں غلیظ پانی انجیکٹ کیا جا رہا ہو۔ جہاں مسن سستا اور چنے کی دال مہنگی ہو۔ جہاں طلباء اپنے اساتذہ اور وکلاء اپنے ججوں پر ہاتھ اٹھائیں۔ جہاں چند پوش بستیاں اور کنٹونمنٹ کے علاقے چھوڑ کر پورے ملک میں گندگی کے ڈھیر ہوں۔ اور وہ بھی اس حکم کے باوجود کہ صفائی نصف ایمان ہے۔ جہاں فرقوں کی فراوانی اور ذات برادریوں کی لازوال بہار ہو۔ جہاں لیڈر سے لیکر ووٹر تک بکنے کو تیار ہو۔ جہاں پر کوئی اپنی حدود سے تجاوز کرنے کے جلدی جنوں میں مبتلا ہو۔ جہاں پٹرول سستا کرنے پر سستا نہ کیا جائے اور مہنگا ہونے کی افواہ پر ہی مہنگا کر دیا جائے۔ جہاں شبِ برات سے لیکر رمضان اور عیدین تک ہر چیز کے نرخ اندھا دھند بڑھا دیئے جائیں۔ عمرے رشوت لے کر کیے جائیں۔ جھوٹی قسموں سے لیکر جھوٹی گواہیاں تک روٹین بن جائیں۔ جہاں اذان کے اوقات سے لیکر عید کے چاند تک پر گروہ بندی و دھڑے بندی ہو۔ جہاں صفیں تو سیدھی ہوں لیکن نیتیں بے حد ٹیڑھی، جہاں پنجگانہ نماز کی ادائیگی کرنے والے کو بھی نہ ڈسپلن کی قدر ہو نہ پابندی اوقات کی پروا، جہاں ایسی ضرب الامثال عام ہوں کہ ”چوراچکا چوہداری تے غنڈی رن پردھان“۔ جہاں بھوک ٹنگ، بے روزگاری اور بے کاری، بدکاری کے اڈوں کے چین ری ایکشن CHAIN REACTION کو جنم دے چکی ہو۔ وہاں ایمان زبان پر تو ہو سکتا ہے۔ ذہن ہر کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ گفتار میں تو ہو سکتا ہے کردار میں نہیں۔ اعلان کی حد تک تو ہو سکتا ہے اعمال میں نہیں کہ ایمان ہی تو عقدا اور یہ سب اسی کا نتیجہ.....

رب ذوالجلال اور جمال محمد ﷺ کی قسم، ایمان تو دور کی بات اس کا عکس بھی اس معاشرہ پر سایہ قلمن ہوتا تو یہ خاک اڑا مارا ریگ زار نور سے چمکتا اور خوشبو سے مہکتا دکھائی دیتا۔ ہم سپر پاور بے شک نہ ہوتے لیکن اس طرح پارہ پارہ پرائے پیروں کی خاک بھی نہ ہوتے، ایمان گیا تو ہم اس کی الٹ سمت میں دیوانہ وار بھاگتے چلے گئے کہ ایمان کسی مخصوص حلیے کا نہیں، ایک خاص حالت کا نام ہے۔ ظواہر میں کمال تو دشمن کا ایجنٹ بھی حاصل کر سکتا ہے اور ایسا متعدد بار ہو بھی چکا ہے۔ عربی تو لارنس آف عربیا بھی ایسی بولتا تھا کہ عرب حیرت سے گونگے ہو جاتے۔

ترادل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اقبال نے اپنی زندگی کو گالی دی، لیکن ہمارے گلے سڑنے کا عمل بدستور جاری ہے، بلکہ اس میں شدت آتی چلی گئی۔ یاد آیا انہی دنوں

صابرہ نامی عورت اپنی بیٹی سیما کے ساتھ چار مرد توفیق اور روشنی کے قتل کے جرم میں جیل گئے ہوئے تھے۔ یہ قتل عزت کے نام پر کیا گیا تھا۔ توفیق تھا نہ لیلیانی کے تحت امری گاؤں کے محلہ سحرالدین نگر میں رہائش پذیر تھا۔ اس کی عمر تقریباً تیس سال کی رہی ہوگی۔ اس کے کنبے میں ماں بانو، باپ سعید احمد، بڑا بھائی عرفان، بیوی انیسہ اور تین بیٹے تھے، رضا، عامر اور ازھر۔ حال ہی میں توفیق نے قرہی گاؤں خاص پور میں موبائل شاپ دی، سی، او کھولا تھا۔ گاؤں کے لحاظ سے دکان بہت اچھی چلتی تھی۔ توفیق کی دکان کے عین سامنے طارق رہتا تھا، وہ کسان تھے اور مسجد منتظم کمیٹی کے صدر تھے۔ اسی ناتے گاؤں کے بااثر لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ طارق کے کنبے میں بیوی صابرہ اور دو بیٹیاں روشنی اور سیما تھیں۔ اٹھارہ سالہ روشنی خوبصورت شوخ اور چنچل لڑکی تھی۔ مزاج سے وہ ہنس مکھ اور ملنسار تھی۔ ہر نی کی طرح وہ پورے گاؤں میں قلائچیں مارتی پھرتی تھی۔ تھوڑی دیر میں اس کے گھر، تھوڑی دیر میں اس کے گھر۔ گاؤں کے کچھ گھروں میں حاضری لگا کر نکلی تو سیدھی کھیت پر۔ روشنی میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی، وہ توفیق کے دل میں اتر گئی۔ وہ جب بھی روشنی کو دیکھتا یہی سوچتا کہ ایسہ کہاں سے میری زندگی میں شامل ہوگئی، میرا نصیب تو روشنی سے وابستہ ہونا چاہیے تھا۔ توفیق کے دل نے تو پنا جاری رکھا، تو روشنی کو پانے کی تمنا اور شدید ہوتی گئی۔ وہ بھول گیا کہ اس کا اور روشنی کا کوئی میل نہیں۔ وہ شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ ہے جبکہ روشنی کنواری اور کم سن ہونے کے ساتھ دوسرے مذہب کی بھی ہے۔ روشنی ہندو مذہب سے تعلق رکھتی تھی، جب کہ توفیق مسلمان۔ ایک دن توفیق دکان پر بیٹھا تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ توفیق کی نظر سامنے روشنی کے گھر کے دروازے پر پڑ گئی۔ اس نے دیکھا کہ روشنی بارش میں بھینکتی ہوئی توفیق کی دکان کی طرف آرہی ہے۔ بارش کی بوندوں سے اس کا بھیگا چہرہ جیسے نہایا ہوا تازہ گلاب کی مانند دھائی دے رہا تھا۔ توفیق اس کا ایک نلک دیکھے جا رہا تھا۔ روشنی دوپٹے کے پلو کے منہ پونچھتے ہوئے بڑی ادا سے بولی۔

”تم نے پہلے کبھی دیکھا نہیں کیا جو اس طرح گھورے جا رہے ہو۔“

”دیکھا تو بہت ہے لیکن بھیگا ہوا نہیں۔“ توفیق مسکرایا تھا۔

”اچھا میرے موبائل کا بیلنس ختم ہو گیا ہے اور مجھے ایک ضروری کال کرنی تھی۔ اس لیے بھگتے ہوئے آنا پڑا۔“ روشنی بولی۔

”اتنی چھوٹی سی بات کے لیے بھگنے کی کیا ضرورت تھی مجھے فون کر دیتیں، میں آئی ٹاپ کر دیتا۔ گھر بیٹھے ہی تمہارا موبائل ریچارج ہو جاتا، پیسے بعد میں ملتے رہتے۔“ توفیق نے کہا۔

”تمہارا موبائل نمبر مجھے معلوم نہیں تھا۔“

”اچھا اپنا نمبر اور اماؤنٹ مجھے بتاؤ تو میں آئی ٹاپ کر دوں۔“ روشنی نے نمبر اور اماؤنٹ بتا دیا۔ تو توفیق موبائل بیلنس ٹاپ اپ کرنے لگا۔ اور روشنی برستے پانی کو دیکھنے لگی۔ دفعتاً اس کے منہ سے نکلا۔

”واہ کیا رومانٹک موسم ہے؟“

توفیق کو لگا کہ دل کی بات کہنے کا یہ سنہری موقع ہے۔ اس لیے وہ جھٹ سے بول پڑا۔

”لیکن ایسے موسم کا تب ہی مزہ آتا ہے جب احساسات کو چھونے والا کوئی خاص ساتھی ہو۔“ روشنی نے مڑ کر خود آپ توفیق کی طرف دیکھا۔

”وہ ساتھی خاص کیا عام بھی ہو سکتا ہے۔“

توفیق اب خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اُس نے جھٹ سے روشنی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جذباتی لہجے میں بولا۔

”روشنی میں تم سے پیار کرتا ہوں۔“ روشنی حیران سی توفیق کی آنکھوں میں یک ٹک بکتی رہ گئی۔ ان آنکھوں میں جانے ایسا کیا تھا۔ کہ روشنی

ان آنکھوں میں ڈوب گئی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے جیسے صدیوں گزر گئیں۔ پھر وہ چونکی اور توفیق سے اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔ مٹھی میں دبا ”پچاس“ کا

نوٹ کا ونڈر پر رکھا اور اپنا موبائل فون لیا اور برستے پانی میں ہی گھر کی طرف بھاگ گئی۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر روشنی ٹھٹھکی۔ مڑ کر توفیق کی طرف

دیکھا اور شرما کر اندر غائب ہو گئی۔ تب توفیق کو یقین ہو گیا کہ پھلی نے چارہ نکل لیا ہے۔ بس پھر اسی دن سے دونوں کی بھیگی بھیگی محبت کی کہانی کا آغاز

ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے چپکے چپکے مسکراتے اور فون پر لمبی لمبی باتیں کرتے رہتے پھر ملاقاتیں بھی شروع ہو گئیں۔

توفیق کی محبت طوفانی تھی۔ تو روشنی بھی سو جان سے اس پر فدا تھی۔ ایک دن ملاقات ہوئی تو ڈرتے ڈرتے توفیق نے اپنے شادی شدہ

ہونے کی بات بھی روشنی کو بتادی۔ کچھ دیر کے لیے روشنی بت سی بن گئی۔ پھر گہری سانس بھر کر بولی۔

”توفیق تم نے اچھا کیا جو مجھ سے سچائی بیان کر دی۔ تم نے سچ بولنے کی ہمت کی ہے اس لیے میرے دل میں تمہاری محبت اور بڑھ گئی

ہے۔ اور پیار بھی کم نہیں ہوا ہے۔ مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ میں نا تم پاس کرنے یا موج مستی کے لیے تم سے عشق کا ڈھونگ نہیں کیا ہے۔ تمہیں ہمیشہ

کے لیے اپنا بنانے کی تمنا کی ہے۔ مجھ سے شادی کرو گے؟“ روشنی نے پوچھا۔

”ہاں! کیونکہ شادی کے بغیر پیار کو اس کی منزل نہیں مل سکتی۔“

لیکن گاؤں ہو یا شہر عشق کی خوشبو چھپائے نہیں چھپتی۔ خاص پورا میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ توفیق روشنی کے دل کی رنچا رنچ کر رہا ہے۔

پھلتے پھلتے یہ خبر طارق اور صابرہ کے کانوں تک جا پہنچی۔ ان دونوں نے لاڈلی بیٹی کو سوالوں کے کھڑے میں کھڑا کر دیا۔ روشنی بے خوف ہو کر بولی۔

”آپ لوگوں نے جو سنا ہے وہ سچ ہے۔ میں توفیق سے پیار کرتی ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”گاؤں میں اور لڑکیاں ہیں لیکن ایسی جوانی کسی پر نہیں آئی کہ باؤلی ہو جائیں۔“ صابرہ نے بیٹی کے بال مٹھی میں جکڑ کر اُسے جھٹکا دیا۔

”نہ تجھے گھر کنبے کی پروا ہے نہ قوم کی عزت و آبرو کی۔ خوب گلڑی اچھال رہی ہے تو اپنے باپ کی۔“

”ماں! میں توفیق سے پیار ضرور کرتی ہوں۔ لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ کسی کو شرمندہ ہونا پڑے۔ ہاں اگر آپ نے میری شادی

توفیق سے نہیں کی تو پھر شرمندگی کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔“ روشنی نے دھمکی دی۔ صابرہ نے بیٹی کا گال طمانچوں سے بدل دیا۔ باپ نے کہا۔

”روشنی اپنی قوم کا لڑکا ہوتا تو ہم خوشی خوشی تیری شادی اُسی کے ساتھ کر دیتے۔ لیکن وہ مسلمان ہے۔“

”کیا مسلمان انسان نہیں ہوتے۔ توفیق کے مذہب سے میری محبت پر فرق نہیں پڑنے والا۔“

”وہ شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ روشنی نے عزم کے ساتھ کہا۔ ”کیونکہ یہ حقیقت خود توفیق نے مجھے بتائی تھی۔ جو اس کی محبت کی سچائی کا ثبوت ہے۔“

باپ نے چلاتے ہوئے بیوی سے کہا،

”سنتی ہو آج سے روشنی کا باہر نکلنا بند۔ اُسے کہیں جانا ہو تو تم ساتھ جاؤ گی۔ اسے تم اپنے پہرے اور بندشوں میں رکھو۔ میں جلد ہی کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کر دیتا ہوں۔“ روشنی کو نہ بندشوں کی پروا تھی نہ پہرے کی۔ موبائل فون چھینا نہیں گیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے دلبر سے بات کرنے کے لیے آزاد تھی۔ موقع پاتے ہی ایک ایک لمحے کی خبر وہ توفیق کو دیتی رہتی تھی۔

زندگی کو شعور اور شوق رکھنے والی کو جب ایسا ساتھ ملا جس کے پاس محبت کے قیمتی خزانے میں الفاظ ذخیرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ تو وہ بڑے تحمل کے ساتھ جھیل کے ٹھہرے پانی کا حسن کھینچ کر ایک محبت کا ہاتھ تھا مے زندگی کے بہاؤ میں شامل ہو گئی۔ ایک دو پہر کی بات ہے۔ روشنی نے توفیق کو فون کیا۔

”فرصت میں ہو؟“

”تمہارے لیے فرصت ہی فرصت ہے بولو۔“

”سب لوگ کھیت پر گئے ہیں۔ گھر پر میں اکیلی ہوں۔ ملنے کا اس سے اچھا موقع دوسرا نہیں ملے گا۔ چپکے سے میرے گھر آ جاؤ۔“ توفیق نے جھٹ پٹ دکان بندی کی۔ اور چوکنی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے روشنی کے گھر میں پہنچ گیا۔ روشنی نے توفیق کو اندر بلا کر دروازہ بند کر دیا۔ کئی دنوں بعد ایک دوسرے کو قریب پا کر وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکے۔ دونوں بغل گیر ہو گئے۔ تو ان کی آنکھوں سے آنسو بھی نکل کر گالوں کو بھگونے لگے۔ روشنی نے سسکتے ہوئے کہا۔

”جلدی کچھ کرو توفیق تمہارے بغیر جینا محال ہے۔“

”تم اس وقت میرے ساتھ چلو۔ نکانہ چل کر ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔“

”نہیں میں ان تین معصوموں کے سر سے باپ کا سایہ الگ نہیں کرنا چاہتی۔ اور نہ انیسہ کو لاوارث چھوڑنے کے حق میں ہوں۔ میں گھر سے بھاگی ہوئی بے حیا لڑکی نہیں۔ بلکہ تمہارے خاندان کی بہو بن کر جینا چاہتی ہوں۔ تم اپنے گھر والوں کو راضی کر لو۔ میں اسلام قبول کر کے تم سے نکاح کر لوں گی۔“

”ٹھیک ہے روشنی۔ میں اپنے گھر والوں کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر اس میں وقت بہت لگ جائے گا۔“

”لگنے دو۔ میں انتظار کروں گی۔“

دونوں ایک دوسرے سے اور مضبوطی سے چپک گئے اور جذبات بے قابو ہوئے تو انہیں بہکتے ہوئے دیر نہیں لگی۔ جس کے نتیجے میں ان دونوں کے درمیان وہ سب کچھ ہو گیا جو شادی سے پہلے نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اُس دن کے بعد روشنی اور توفیق کے پیار میں ہوس بھی شامل ہو گئی۔ دن ہو یا رات موقع پاتے ہی روشنی فون کر کے توفیق کو اپنے گھر بلا لیتی کبھی صدر دروازے سے تو کبھی عقب کی دیوار پھاند کر۔ توفیق روشنی کے گھر میں داخل ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ دونوں اپنے اپنے دل کی مراد پانے میں مصروف ہو جاتے۔

ایک شام طارق صابرہ اور سیما کو لے کر کسی شادی میں گئے تھے۔ روشنی اپنے جسم کو دلہن بنانا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ ضد کر کے گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ طارق کے ساتھ اس کا سالاشا اور جمال الدین اور ایک دیگر رشتے دار یونس عرف لڈو بھی شادی کی تقریب میں شامل ہونے گئے تھے۔ ان سب لوگوں کو پانچ چھ گھنٹے سے پہلے واپس نہیں لوٹنا تھا۔ اس لیے روشنی نے فون کر کے توفیق کو گھر بلا لیا اس کے بعد گھر میں کون سی انہونی ہوئی۔ صبح صبح کسی کو علم نہیں۔ شور بہت ہوا۔ جب رات دس بجے گاؤں والوں نے روشنی کی چیخیں سنیں اور اس کے گھر میں دھواں نکلتا دیکھا۔ گاؤں والے طارق کے گھر کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ کہ تبھی اتفاق سے پولیس کا گشتی دستہ وہاں آپہنچا۔ گاؤں والوں کے ساتھ گشتی پولیس گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا۔ روشنی آگ کی لپیٹوں سے گھری جل رہی تھی۔ سب نے مل کر کسی طرح اُس کے جسم پر لگی آگ بجائی۔ گشتی دستے نے فون کر کے اس واقعے کی اطلاع تھانہ لایانی کو دی۔ تھوڑی دیر میں ہی تھانہ انچارج احمد سہیل خاص پورا موقع واردات پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد کنٹرول روم سے اطلاع پا کر پولیس ڈی۔ پی۔ او۔ خیال آفاقی علاقہ افسر سعد اللہ بھی موقع پر پہنچ گئے۔ پولیس افسران نے صابرہ سے پوچھا تھا کہ تو واقعہ کے متعلق اس نے بتایا۔

روشنی لالٹین کی روشنی میں پڑھ رہی تھی۔ تبھی لوٹ پانے کے ارادے سے تین بد معاش گھر میں گھس آئے۔ چھینا چھٹی میں لالٹین روشنی پر گر کر ٹوٹ گئی۔ جس کے نتیجے میں اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ ہم سے نے شور مچایا۔ تو بد معاش اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بھاگ گئے۔ صابرہ کا بیان پولیس افسران کو جھوٹ لگ رہا تھا۔ اس لیے آگ سے پوری طرح جھلسی ہوئی روشنی کو علاج کے لیے ہسپتال بھیجنے کے بعد گھر میں موجود صابرہ سیما اور جمال الدین کو پوچھا تھا کہ لیے حراست میں لے لیا۔ گھر میں اس وقت کوئی مرد نہیں تھا۔ مذکورہ خواتین کو تھانہ لے جا کر تفتیش کی گئی تو سارا راز کھل گیا۔

دراصل طارق اپنے گھر والوں کے ساتھ رات نو بجے گھر لوٹا تھا۔ اس دن توفیق پچھواڑے کی دیوار پھاند کر گھر میں آیا تھا۔ اس لیے بے خیالی میں روشنی صدر دروازہ اندر سے بند کرنا بھول گئی تھی۔ اندر پہنچتے ہی طارق وغیرہ نے روشنی اور توفیق کو قابل اعتراض حالت میں دیکھا تو سب کا خون کھول اٹھا۔ تلوار، لاٹھی، ڈنڈا، پریشکر وغیرہ جس کے ہاتھ میں جو آیا اُسے لیکر طارق پر ٹوٹ پڑا۔ پلک جھپکتے ہی توفیق زمین بوس ہو گیا۔ اور پھر مہلک واروں سے اس کی موت ہو گئی۔ توفیق مر گیا تو طارق وغیرہ لاش نور پور پارک میں پھینک آئے۔ ظالموں کا غصہ روشنی پر بھی کم نہیں تھا۔ ان کے خیال میں روشنی کی ہی شہہ تھی جس کی وجہ سے توفیق اس کی عزت سے کھیل رہا تھا۔ جتنا قصور وار توفیق تھا اتنی ہی گنہگار روشنی بھی تھی۔ اس لیے سماج میں عزت و آبرو بچانے کے لیے طارق وغیرہ نے روشنی کو بھی قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ توفیق کی لاش ٹھکانے لگا کر لوٹنے کے بعد انہوں نے خواتین کو اپنے ارادے سے باخبر کیا۔ تو صابرہ۔ سیما اور جمال الدین نے بھی اجازت دے دی۔ مار دو کلمو ہی کو پھر کیا تھا۔ روشنی پر مٹی کا تیل انڈیل کر آگ لگا دی گئی۔

دوسری صبح پولیس نے نور پور پارک سے توفیق کی لاش برآمد کر لی۔ اس کے جسم پر تین مہلک وار تھے۔ توفیق کے بڑے بھائی عرفان کی تحریر پر طارق۔ صابرہ۔ سیما۔ جمال الدین۔ شاور اور یونس عرف لڈو پر قتل کا مقدمہ درج کر لیا گیا۔ اگلے چند روز بعد نامزد ملزمان کو عدالت میں پیش کر کے جیل بھجوا دیا گیا تھا۔ اور اسی دن ہسپتال میں زیر علاج روشنی کی بھی موت واقع ہو گئی تھی۔ اس معاملے کی سب سے اہم اور مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ دونوں پارٹیاں اس واقعے کو عشق کا معاملہ ماننے کو تیار نہیں تھیں۔ توفیق کے والد سعید احمد کا کہنا تھا کہ شاور نے توفیق سے چالیس ہزار ادھار لیے تھے۔ جسے وہ لوٹا نہیں رہا تھا۔ اس سبب سے شاور نے توفیق کی رنجش چل رہی تھی۔ توفیق کا قتل ایسی دشمنی کا نتیجہ تھا۔ دوسری طرف طارق کا کہنا تھا کہ روشنی کا

توفیق سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بد معاش گھر میں گھسے اور لائین سے آگ لگ جانے سے روشنی کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ کوئی کچھ بھی کہے۔ لیکن سچ پولیس اور علاقے کے عوام کو معلوم ہو گیا تھا۔ اور پولیس کی تفتیش میں ملزمان قصور وار تھے۔

وہ شاید پھاگن یا چیت کا مہینہ رہا ہوگا۔ رات کے تقریباً نو بج رہے تھے۔ فوزیہ اونچی آواز میں لگاتار پانی مانگ رہی تھی۔ آنگن کے اُس پار فالٹہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے یہاں کی سب سے جھگڑا لو وارڈن اصغری کی ڈیوٹی تھی۔ سپاہی اسے لڑاکیہ کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بھی عارفہ کے ساتھ کیسی مزے دار بات چیت میں مصروف تھی۔ دروازے کے پاس بیٹھ کر نبی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

”اے تھوڑا پانی دے دو۔“

ہم اصغری کو پکار پکار کر اپنا گلا پھاڑ لیا۔ لیکن کسی کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ فوزیہ نے پکارنا بند کر دیا تھا۔ وہ زور زور سے سلاخوں سے اپنا سرخ رہی تھی۔ ہم سب دروازہ پکڑے کھڑے تھے۔ وارڈن کھانا کھا کر کنوری میں پانی لے کر آنگن کے بیچ میں کھڑی ہاتھ دھو رہی تھی۔ عارفہ سرخ رہی تھی۔

اصغری ہسپتال سے بستر لے کر اوپر سونے کے لیے جا رہی تھی اس نے ادھر پھانسی سیل کی طرف بستر لگا لیا تھا۔ اب عارفہ خاموش ہو گئی تھی۔ پھر ہمارے دروازے کے پاس آ کر اصغری نے جھلاتے ہوئے پوچھا۔

”تم لوگ چلا کیوں رہی تھیں؟ وہاں پر میری ڈیوٹی تو نہیں تھی۔ وہاں پر نسیم وارڈن کی ڈیوٹی تھی۔ میں کیا کروں؟“

اس سرگشتہ بے اتفاقی سے ہمارا دم گھٹنے لگتا تھا۔ ہر دن یہ سوچ کر زندہ تھے کہ یہ ہماری زندگی کا آخری دن ہے۔ اور کسی حد تک ہمارا یہ انداز درست بھی تھا۔ زندگی اور موت سگی نہیں ہیں۔ سہیلیاں ہیں یا سونکیں۔ میں آج تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ کسی۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ یہ دونوں غیبیث آپ میں ملی ہوئی ہیں۔

سعادت بلوچ کا ٹرائل عروج پر تھا۔ اسے قتل، ڈکیتی، اغوا برائے تاوان کے بیسوں مقدمات میں گرفتار کیا گیا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ بد صورت اور بے ضمیر، بکاؤ اور بردہ فروش حاکم وقت نے تاریخی بے حیائی کے ساتھ سعادت بلوچ پھانسی پر چڑھا دیا۔ لیکن یہ بد دیانتوں کا یہ گروہ اُسے موت کے گھاٹ نہ اتار سکا۔ کیونکہ پھانسی گھاٹ اور موت کے گھاٹ میں اتنا ہی فرق ہوتا ہے۔ جتنا زندگی اور موت میں۔ عزت اور بے عزتی میں، بقاء اور فنا میں۔ کہ

”بلیے شاہ اسماں مرنا نا ہیں گور پیا کوئی ہو۔“

اب مریم، عارفہ، شباح، چونکہ قتل کے مقدمات میں تھیں انہیں اور ان کے ہمراہی ملزمان کو عمر قید کی سزا ہو چکی تھی۔ سدرہ، آسیہ اور سعدیہ کے مقدمات ابھی ٹرائل ہو رہے تھے۔

کافی عرصے سے مجھے شک تھا کہ جیل میں میرے نگرانی کی جا رہی ہے۔ بعض اوقات افسران میرے پاس آ کر عجیب و غریب قسم کی گفتگو کرتے تھے۔ میں جانتی تھی کہ کوئی معاشرہ اس وقت تک حقیقی معنوں میں ترقی اور خوشحالی کی منازل طے نہیں کر سکتا جب تک اس معاشرے

میں خواتین کو ان کے جائز حقوق حاصل نہ ہوں۔ اور ان کو ترقی کے عمل میں اپنا کردار اور خدمات ادا کرنے کی سہولت حاصل نہ ہو۔ اسلام ایسے ہی آفاقی دین میں خواتین کو جو حقوق فراہم کیے وہ 1400 سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد آج بھی انقلابی محسوس ہوتے ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے جو پاکستان قائم کیا تھا۔ اس میں عورتوں اور مردوں کے برابر حقوق حاصل تھے۔

ایک دفعہ تنظیم تحریک حقوق انسانی کے کتابچے کے متعلق ایک خط میرے گھر موصول ہوا۔ ممکن ہے یہ سب اتفاقات ہوں میرے بیانات کے باعث عدالت عظمیٰ نے ایک مخصوص فل بینچ قائم کیا۔ تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ وہ حکومت میری قید کو درست سمجھتی تھی اور کیا پولیس نے میرے ساتھ برا سلوک کیا؟ اس فل بینچ کے سامنے میری شہادت لی گئی اور مجھ پر جرح ہوئی۔ کاروائی کے دوران ایک وقفے میں ایک عدالتی اہلکار میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

”عدالت آپ کے حالات سے قطعی بے خبر تھی۔ اب عدالت نے آپ کی رہائی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ بے قصور ہیں۔ اور آپ کو آج ہی اپنے گھر بھیجا جا رہا ہے۔“ یہ سن کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ کہ انہوں نے مجھے پہلے اس قید سے رہا کیوں نہیں کیا؟

جب کوئی قیدی سزا کی مدت پوری کر کے جیل سے نکلتا ہے تو اعصاب پر قید خانے کے آسیب کو اٹھاتے اٹھاتے پھرتا ہے۔ وہ اس بوجھ کو سینے چھپائے رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اسے چھپا نہیں سکتا۔ وہ معاشرے سے چھپتا پھرتا ہے لیکن چھپ نہیں سکتا۔ آخر وہ معاشرے سے بھاگ کر زیست کے اندھیرے غاروں میں جا چھپتا ہے۔ وہ خود نہ مرے تو اس کی روح مرجاتی ہے۔ یہ معاشرے کا جرم ہے کہ وہ سزا کے بعد قیدی کو یاد دلانا رہتا ہے کہ تم مجرم ہو۔ سزایافتہ ہو۔ اچھوت ہو۔ معاشرہ چاہتا ہے کہ سزایافتہ انسان اپنے متعلق اس حقیقت کو نہ بھولے کہ اس نے ایک بار جرم کیا تھا۔ اس کے رد عمل کی وہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ معاشرے کا منہ نوچنے لگتا ہے یا اپنا۔ ان دونوں صورتوں میں اس کے اندر کا انسان مرجاتا ہے۔ اور چلتا پھرتا شعلہ بن جاتا ہے۔ یہیں سے جرم کی غم ریزی ہوتی ہے اور معاشرے کی آغوش میں جرم پرورش پاتا ہے۔



ختم شد